إن في ذالك لآيات لقوم يتفكرون

بیشک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو فکر [illegible]

تاریخ

ہندِ قرونِ وسطیٰ

جلد دوم

از عہد

سلطان محمد غوری تا سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی

یعنی :

سنہ ۱۱۸۶ء تا سنہ ۱۳۲۰ء

مرتبہ

قاری محمد بشیر الدین پنڈت (بدایونی)

ایم - اے (علیگ)

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

قیمت [illegible]

سنہ ۱۹۳۹ء

[illegible]

چند قیمتی رائیں

(۱) تاریخ کی اشاعت ضروری ہے میں تاریخ کی اشاعت میں خدمت کیواسطے حاضر ہوں۔ نقد و قلم دونوں حاضر۔

حبیب الرحمن خاں شروانی۔ حبیب گنج ضلع علی گڑھ۔ مئی ۱۹۴۸ء

---

(۲) سالہا سال کے مسلسل و وسیع مطالعہ نیز تحقیق و تدقیق کے بعد قاری محمد بشیر الدین پنڈت ایم۔ اے (علیگ)۔ ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی یہ تاریخ ترتیب دی ہے جو بلاشبہ اپنے مضمون پر قول فیصل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس عظیم الشان کارنامہ کے لئے ان کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔

(پروفیسر) محمد حبیب۔ صدر شعبۂ سیاسیات

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ جولائی ۱۹۴۹ء

---

(۳) کتاب سرسری نظر سے دیکھ لی۔ مفید ہے اس کی جلد از جلد اشاعت ہونا چاہئے۔

(ڈاکٹر) سید سلیمان ندوی۔ لکھنؤ۔ جون ۱۹۴۸ء

---

(۴) ہندوستان میں اسلامی دور حکومت کی تاریخ اب تک تشنۂ تحریر و ترتیب رہی ہے لیکن اب اس اہم فرض کام کو قاری محمد بشیر الدین پنڈت ایم۔ اے (علیگ) نے تین جلدوں میں ترتیب دیکر عمدہ برآ ہونیکی سعی فرمائی ہے مخصوص عالمانہ صفات سے متصف ہونے نیز عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی میں مہارت تامہ رکھنے کے کہ جن میں قرون وسطیٰ کے اہم دور کا سرمایہ محفوظ ہے۔ قاری صاحب موصوف حقیقتاً اس کام کے لئے موزوں ترین شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ تالیف اُن تمام اہم بنیادی غلطیوں سے پاک ہے جو ہندوستان کی تمام تاریخوں میں اب تک ہوتی چلی آئی ہیں۔ مؤلف کو اپنے مضمون پر پوری قدرت حاصل ہے۔

شیخ عبد الرشید۔ صدر شعبۂ تاریخ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ اگست ۱۹۴۹ء

---

(۵) اسلامی عہد حکومت کے زمانۂ وسطیٰ کا یہ بیش بہا تاریخی ذخیرہ عامۃ الناس کے علاوہ اسکولوں اور کالجوں کے طلباء کے لئے بھی از حد مفید ہے۔

الحمد للہ

محمود الرحمن قدوائی۔ پرنسپل

گاندھی فیض عام کالج شاہجہانپور۔ فروری ۱۹۴۸ء

۲۸۳۱۴

فہرست مضامین

تاریخ ہندی قرونِ وسطیٰ (جلد دوم)

فہرست مضامین:۔ صا تا صی و صا تا ص۵۲۳ و صا تا ص۲۳

(بقیہ)

انتساب

جب تاریخ کا مطلع تاریک تھا اور زندگی کے افق پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ کچھ من چلے اہل قلم اُٹھے اور جابجا تحقیق کے چراغ جلا دئے۔ جن کی روشنی میں چل کر بعد کے آنے والوں کو تیرہ و تار گلیوں میں بھٹکنے سے نجات اور شاہ راہ مقصود کا نشان ملا۔ اسی فضل کے اعتراف اور اسی احسان کی منّت گذاری کے طور پر میں اپنی ناچیز تالیف اُن نامور مورخین کے نام منسوب کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ الفضل للمتقدم۔

خاکسار مؤلف

شکر و دعا

الحمد للہ کہ سالہا سال کی محنت کے بعد اسی کی مدد سے ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ تین جلدوں میں تیار ہو گئی اور اسی کی مہربانی سے آج دوسری جلد شائع ہو رہی ہے۔

میرے بچپن کے جذبات و تاثرات کیا تھے؟ اور انھوں نے کیونکر میرے احساسات کو بیدار کیا؟ اور احساسات نے کسطرح علمی جد و جہد کیطرف متوجہ کیا؟ اسکی داستان طویل ہے لیکن جذبات و تاثرات، احساسات و اقدامات کا خالق بھی وہی ہے۔ اور سعی کو عمل کی شکل دینے والا بھی وہی ہے ؎

نیاوردم از خانہ چیزے نخست   تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

۲۱ سال سے زائد مدت تک ایک ہی کام میں لگے رہنا کتنا مشکل ہے؟ اور اس مشکل کو کس نے آسان کیا؟ میرا تجربہ مجھے یاد دلاتا ہے کہ بسا اوقات دو سطریں لکھنے کے لئے گھنٹوں سر کپڑے بیٹھا رہا اور ایک حرف بھی نہ لکھ سکا، پھر میں کیا ناز کروں کہ یہ کام میں نے کیا، مجھے اپنی کمزوریوں، جلد بازیوں، ناتجربہ کاریوں، خامیوں اور بدعلمیوں کا خوب علم ہے، میں معترف عجز و قصور ہوں اور جس کارساز نے اس کام کو پورا کرا دیا در اصل اسی کا شکر ادا کرنے سے بالکل قاصر ہوں ؎

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش   عذر بدرگاہ خدا آورد
ورنہ سزاوار خداوندیش   کس نتواند کہ بجا آورد

جس کو کام کا تجربہ ہو وہ جانتا ہے کہ عمل کی پرخار وادی میں ہمت افزائی اور امداد فرمائی کیسی کام آتی ہے، میں سوچتا ہوں کہ میرے بزرگوں اور دوستوں کو کس نے مجھ ناچیز پر مہربان کر دیا، تو شکر کے لئے الفاظ نہیں ملتے اور خود ان کرمفرما ہمت افزا اور امداد نواز ہستیوں نے شکریہ کو بھی اپنے کو ناچیز پاتا ہوں بس اللہ تعالیٰ ہی انکو جزائے خیر سے دارین میں نوازیں

میں اس موقع پر ان دوستوں اور بزرگوں کا خصوصیت سے چند حضرات کا مختصر ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا جن کے مجھ پر بے حد و بے شمار احسانات ہیں۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) نے مدعو فرما کر نہ صرف اپنے بیش بہا کتب خانہ سے مستفید ہونے کا موقع دیا بلکہ حد درجہ کی مشکلات کی رکاوٹوں کو دور کر کے میری مدد فرمائی اسیطرح جناب احسن اللہ خاں صاحب اور جناب ... خاں صاحب نے اپنے ذاتی کتب خانے میرے لئے وقف کر دیئے۔ میں ان تمام حضرات

کا ممنون کرم ہوں۔ مخدومی جناب مولوی احمد زماں خانصاحب نیز جناب محمد احمد خانصاحب رئیس شاہجہانپور نے تالیف ہذا کی اشاعت کیلئے جو عملی جد وجہد فرمائی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے سے زبان قاصر ہے۔ جناب راجہ خلیل احمد خانصاحب، جناب جان بہادر خان صاحب، جناب خادم حسن خانصاحب، جناب عبداللطیف خانصاحب، جناب حامد علی خانصاحب اور جناب سید عبدالرب صاحب صوفی کا مجھ پر جو خصوصی کرم رہا ہے اس کا میں تہ دل سے مشکور رہوں۔ کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں پریس کی جملہ مشکلات کو جس خوبی کیساتھ میرے شفیق مکرم جناب سید الطاف علی صاحب (ایڈیٹر رسالہ مصنف و مہتمم مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ) نے حل فرمایا ہے اس کا میں از حد شکر گذار ہوں۔ میرے عزیز و ہونہار طلبا سید مشہود حسین بریلوی، سید نواز حسین الہ آبادی اور اطفال احمد خاں شاہجہانپوری اور برادر عزیز سید مولوی خلیل احمد صاحب شاہجہانپوری نے کتاب کے مسودات کو ترتیب دینے اور انکے نقل کرنے میں جو محنت و کاوش کی ہے خدا اسکی انھیں جزائے خیر دے۔

بہرصورت جب اللہ تعالیٰ نے تالیف و تصنیف کے اس اہم کام کو مکمل کرا دیا تو کیا کہوں کہ میری کیا حالت تھی؟ خوشی سے یا خجالت سے؟ واقعی دونوں ہی جذبات تھے لیکن جب طباعت و اشاعت کے خیال سے علم و فضیلت کی مسندوں کیطرف اس پشتارہ کو لیکر چلا ہوں تو شرمندگی سے ایک ایک قدم سو سو من کا ہو گیا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا میدان فضل و کمال اور میں! جس کیطرف نظر اٹھتی اپنی بے بساطی کا خیال آتا اور قدم رک جاتا۔ مسودہ بغل میں دبا کر اپنے محترم استادوں میں سے کسی کے سامنے جاتے ہوئے میری وہی حالت ہوتی تھی جو جوہریوں کے بازار میں کانچ کا نگینہ لیکر جانیوالے کی ہوتی ہے۔ آخر ہمت کر کے میں اپنے استاد محترم جناب شیخ عبدالرشید صاحب صدر شعبہ تاریخ کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن استاد زمانہ محقق یگانہ پروفیسر محمد حبیب صاحب صدر شعبہ سیاسیات کی خدمت میں حاضر ہونیکی پھر بھی کسی طرح ہمت نہ پڑی۔ اسکے ساتھ ہی یہ ڈر تھا کہ اگر انھوں نے غائبانہ سن لیا تو کیا کہیں گے لیکن شیخ صاحب موصوف ہی نے میری ہمت افزائی کی اور نہایت خوشگوار تعارف کا واسطہ بنے گئے اب بھی ڈر رہا تھا کہ دیکھئے وہ کیا کہتے ہیں لیکن جو کچھ انھوں نے کہا میری عقیدت کا آنسو اور مسرت کا جذبہ تو اسکا ترجمان بن سکتا ہے مگر میری زبان خود اپنے متعلق ان ارشادات کو دہرا بھی نہیں سکتی جس کا ثبوت خود جناب موصوف کا ۲۲ فلسکیپ صفحات کا (مقدمہ) ہے۔ میرا یقین ہے کہ اگر کسی خوش نصیب کو ممدوح کے قلم کی پانچ سطریں بھی نصیب ہو جائیں تو اسکا گوشۂ کلاہ آسمان تک پہنچ جائے لیکن میرے معاملہ میں جس ذرہ نوازی اور دریا دلی سے ممدوح نے کام لیا ہے اسکا بیان میری تاب و تواں اور قلب و زبان کی حد سے باہر ہے۔ اسکے بعد ہمارے حضرت اقدس مولانا ضیاء احمد صاحب بدایونی استاد شعبۂ فارسی و اردو نے جس اہتمام اور جس شان فضل و کمال سے صرف توجہ فرمائی ہے میرا دل رہین منت و نیاز ہے۔ ان حضرات کے شکریہ میں مجھ سے جو کمی رہ جائے اس سے ایک گونہ یوں اطمینان ہے کہ ان سب حضرات کا چھوٹا ہوں اور از خوردان خطا و بزرگان عطا مشہور ہے۔

۲۲ آخر میں میری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر دے اور میرے اس کام کو قبول بھی فرمائیں اور مقبول عام بھی بنائیں اور اسکے ذریعہ سے مجھ سے بنی نوع کی خدمت کسی درجہ میں میرے حصہ میں بھی آئے۔ نیز یہ کتاب یادگار میری یاد قدر دانوں کو دلائے اور انکی دعائیں حاصل کرے۔ در حقیقت اس محنت کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے۔ غرض نقشے است کز ما یاد ماند۔ کہ ہستی را نمی بینم بقائے۔ مگر صاحبدلے روزے ز رحمت۔ کند بر حال این مسکین دعائے۔
(ناچیز مولف)

فٹ نوٹ: ۱ ہ تا ۹ شاہجہانپور کی معزز و ممتاز ہستیاں ہیں۔ ۱۰ موصوف رائے بریلی کے ایک نہایت متدین اور باکمال بزرگ ہیں

مقدمہ

از

(عالیجناب پروفیسر محمد حبیب صاحب
بی۔ اے (آکسن) بار ایٹ۔لا
صدر شعبۂ سیاسیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

سالہاسال کے مسلسل و وسیع مطالعہ نیز تحقیق و تدقیق کے بعد قاری محمد بشیر الدین پنڈت ایم۔اے (علیگ) نے جو گاندھی فیض عام کالج شاہجہانپور کے ادارہ سے تعلق رکھتے ہیں ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ پر ایک تاریخ ترتیب دی ہے جو اپنے مضمون پر قول فیصل کا درجہ رکھتی ہے۔

تالیف مذکور کی ترتیب و تدوین کے لئے مولف کے اندر بعض وہ اہم خصوصیات ہیں جن میں وہ آپ منفرد ہیں۔ ان کو فارسی، ہندی و سنسکرت مآخذات پر عبور حاصل ہے نیز تاریخ کے موجودہ انگریزی لٹریچر سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ علاوہ ازیں اُن کا دماغ فرقہ وارانہ نیز سماجی و طبقاتی تاثرات سے پاک و صاف ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جہاں تک شواہد و دلائل کا تعلق ہے انھوں نے تاریخ کے مروجہ آئین و ضوابط کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے اور اس پر ان کو اعتماد حاصل ہے۔

شہاب الدین محمد غوری سے لیکر خاندانِ علائی کے اختتام تک کا زمانہ چونکہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے تاریخ میں نہایت اہم ہے اسلئے قاری صاحب موصوف نے یہ طے کیا ہے کہ اس کو جلد دوم میں جلد اوّل و سوم سے پہلے شائع کیا جائے پہلی و تیسری جلدیں قلمی صورت میں تیار ہیں اور اُمید ہے کہ جلد دوم کی طرح فاضل مولف انہیں بھی جلد از جلد شائع کرکے علمی دنیا کو مستفید ہونے کا موقع دیں گے۔ پنڈت جی صاحب میری استدعا کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جلد ہذا کا ہندی ایڈیشن تیار کرنے میں مصروف ہیں جو زبان و بیان کے اعتبار سے صاف و سادہ اور غیر برہمن جنتا (پبلک) کے لئے قابل فہم ہوگا۔

قرونِ وسطیٰ کی تاریخ اب تک بالعموم اس نہج پر ترتیب دیجاتی رہی ہے کہ گویا اس میں شاہی خاندانوں اور ان کے جنگ و جدل کے واقعات کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ چیز آپ

پنڈت بشیرالدین صاحب کی تالیف میں نہیں پائیں گے۔ بلاشبہ تاریخی کتابوں میں سلاطین اور ان کے رزمیہ کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور اس لحاظ سے پنڈت جی صاحب موصوف نے فارسی ماٰخذات کے وسیع مطالعہ کے بعد ان کو یکجا جمع کر دیا ہے لیکن اسی شدّ و مدّ کے ساتھ انھوں نے قرونِ وسطیٰ کی معاشرتی، تہذیبی نیز ذہنی ارتقاء کی تاریخ پر بھی اپنا زورِ بیان صرف کیا ہے اور کم و بیش نصف جلد انہیں مضامین پر مشتمل ہے کہ جن کے فہم و ادراک کے بغیر ہندی قرونِ وسطیٰ کی سیاسی تاریخ ایک لاینحل معاہنی رہتی ہے۔

قاری محمد بشیرالدین پنڈت ایم۔ اے کی مؤلفہ جلد اول سنہ ۷۱۲ء سے لیکر سنہ ۱۱۸۶ء تک واقعات پر مشتمل ہے۔ تیسری جلد میں شاہانِ تغلق سے لیکر لودی سلاطین (یعنی سنہ ۱۳۲۰ء تا سنہ ۱۵۲۶ء) کے عہدِ حکومت تک کے واقعات درج ہیں۔ مؤلف کا ارادہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ پر ایک چوتھی جلد کا اضافہ کیا جائے کہ جس میں عہدِ مذکور کے طریقِ جنگ، پیشہ ور جماعتوں کی حالت و کیفیت نیز مسلمانوں کے دینی رجحانات وغیرہ کا ذکر ہو کہ جن کے اظہار کا مناسب موقع گذشتہ جلدوں میں نہیں مل سکا۔

تالیف زیرِ بحث کا طرزِ تحریر نہایت صاف و سادہ (غیر مبہم) اور ایک حد تک سہلِ ممتنع ہے۔ مؤلف نے قرونِ وسطیٰ کے نامور مورخین کی روایاتِ قدیمہ کی اتباع نہ کرتے ہوئے (بعید از قیاس) دور از فہم تشبیہات و استعارات نیز کنایات سے احتراز برتا ہے کہ جن کو ہمارے درباری مورخین اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ مشرقی روایات کے بموجب تاریخ تو درحقیقت ایک ایسا مضمون ہے جس کا ایک عامی کو بھی واقف ہونا چاہئے اسلئے اس کو ایسے انداز سے لکھا جانا چاہئے کہ جس کو وہ سمجھ سکے۔

تاریخ ہند کی ترتیب و تدوین میں پنڈت بشیرالدین صاحب کو اس امر میں اولیت کا شرف حاصل ہے کہ انھوں نے عربی، فارسی اور سنسکرت ماٰخذات کی روشنی میں ہندوؤں کے ذہنی رجحانات نیز آئین و رسوم کو اسلامی تصورات و تہذیب کے پہلو

بہ پہلو رکھ کر دونوں کا نہایت جامعیت کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اس اہم بالشان کارنامہ کے لئے ان کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔ بدقسمتی سے قرونِ وسطیٰ کے لیے سنسکرت کے مستند مآخذات کی ضرورت سے زائد کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہرش وردھن کی وفات سے لیکر البیرونی کے آغاز تک جو درمیانی چار صدیاں گذری ہیں ان کے معاشرتی و سیاسی دساتیر و قوانین پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ البیرونی جب زمانۂ گذشتہ کے ہندی تخیلات کی کامرانیوں کو پیشِ نظر رکھ کر زمانۂ مابعد کے حقیر و کم مایہ سرمایہ پر نظر ڈالتا ہے تو اسے بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ "ہندوستانی ترقی پسند نہیں ہیں" اور وہ خواہش کرتا ہے کہ "کاش کوئی ایسا ہندوستانی سقراط پیدا ہو جو عزم و استقلال سے کام لیکر اور اپنی جان کی بازی لگا کر قدیم ہندی تخیلات کے مستند اصول موضوعات کو لغویہ (خرافات) لٹریچر سے الگ کر دے کہ جس نے عوام الناس کو ان کی جہالت کی بنا پر اپنا شکار بنا رکھا ہے"۔ لہٰذا اس وقت تک جب تک کہ مذکورہ بالا چار صدیوں کے متعلق مزید انکشافات ہوں اور صحیح مسالہ بہم پہونچے ایک حقیقی مورخ کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ منواسمرتی اور یجناولکیہ کے وضع کردہ اصولِ موضوعات کے مطابق ہندوستان کے معاشرتی رسوم و رواج نیز آئینِ زندگی کو جانچے اور پرکھے .... منواسمرتی کے دور میں ہندوستان کے اندر ذات پات کے قوانین کو یقیناً بطور اصولِ موضوعہ تسلیم کر لیا گیا لیکن یہ دوسری بات ہے کہ ان (قوانین) کے عملی نفاذ کی شکل واضع قوانین کے منشاء کے بقدر خراب و ناقص نہ رہی ہو۔ البتہ البیرونی کے زمانہ میں ہم ذات پات کے نظام کو حیرت انگیز لیکن وحشت خیز طریقہ پر جاری و ساری پاتے ہیں۔

البیرونی لکھتا ہے "ہندوؤں میں (ایران کی) پانچ ذاتوں کی طرح بکثرت ذاتیں ہیں۔ ہم مسلمانوں کا مسلک عام مساوات نیز اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ کے مطابق ان سے بالکل جداگانہ ہے اور یہی وہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے جو ہندوؤں

اور مسلمانوں کے درمیان (ایک دوسرے کو سمجھنے اور دیکھنے میں) حائل ہے"۔

ہندوؤں کے مشہور چار ورنوں (ذاتوں) کا مختصر سا تذکرہ کرنیکے بعد البیرونی آگے بڑھتا ہے اور لکھتا ہے کہ "شودروں کے بعد انتیجوں کا درجہ ہے جن سے مختلف خدمات لی جاتی ہیں۔ ان کا کسی ذات میں شمار نہیں۔ وہ دستکار و پیشہ ور جماعتوں کے ممبر ہیں۔ اور آٹھ طبقوں میں منقسم ہیں۔ اور دھوبی، موچی، جولاہہ کے علاوہ جن کو وہ اپنے میں سے نہیں سمجھتے آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ ان پیشہ ور جماعتوں کے آٹھ طبقات یہ ہیں۔ دھوبی، موچی (چمار)، بازی گر (نٹ)، کنجڑا، ملاح، دھیور (مچھیرے)، چڑیمار اور جولاہے۔ ہندوؤں کی چاروں ذاتوں کے افراد ان کے قریب آباد ہونا پسند نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ ان کی آبادی گاؤں یا شہر کے بالکل باہر ہوتی ہے"

"انتیجوں سے بھی گیا گزرا درجہ ڈوم اور چنڈالوں وغیرہ کا ہے..... حقیقتاً انھیں ناجائز اولاد کی طرح (حقیر) سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ غیر شادی شدہ زانی شودر باپ اور غیر شادی شدہ زانیہ ماں کے اتصال سے پیدا ہوئے ہیں......"

ایک دوسری جگہ البیرونی کا بیان یہ ہے "ہر وہ کام جس کے کرنے کا استحقاق برہمنوں اور صرف برہمنوں کو حاصل ہے مثلاً عبادت کرنا، ویدوں کا پڑھنا، ہون کرنا وغیرہ دوسروں کے لئے اس حد تک ممنوع ہے کہ ایک شودر یا ویش کے متعلق جب یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے وید منتر کا اچارن کیا ہے (یعنی زبان سے ادا کیا ہے) تو اس کو برہمن بحیثیت مجرم کے حاکم کے سامنے پیش کرتے ہیں اور حاکم حکم جاری کرتا ہے کہ اس کی زبان قطع کر لی جائے"۔

ذات پات کے نظام کی مذہبی بنیاد چھوت چھات کے بھیانک اصول پر قائم تھی جس کی بنا پر ہندوستان کے حکمراں طبقے کے دماغ میں یہ خوف مستقل طور پر جاں گزیں ہو چکا

تھا کہ اگر انھوں نے نظامِ مذکور کے کسی آئین کی خلاف ورزی کی اور بالخصوص اپنے سے نیچے ورن والے کی آگ یا پانی کو (استعمال کرنا تو کجا) چھو بھی لیا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مردود قرار دیدیئے جائیں گے۔ مسلمان قیدی تو زرِ فدیہ ادا کرنے کے بعد اسلامی سوسائٹی میں اپنی سابقہ حالت پر واپس آسکتا تھا لیکن .... ہندو قیدی کو اپنی شجاعت و ایثار کا اپنے سماج کی طرف سے یہ صلہ ملتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے چنڈال قرار دیدیا جائے۔ اس کے بیوی و بچے اس سے منحرف ہوجائیں۔ احباب اس کا ساتھ چھوڑ دیں اور پوری سوسائٹی اس کی دشمن بن جائے۔

زمانۂ مابعد میں اِس مذہبی نجاست (چھوت چھات) سے پاک ہونے کے کچھ طریقے (مثلاً گنگا اشنان اور بِلدان وغیرہ) ایجاد کئے گئے لیکن ترکی حملوں کے آغاز کے وقت اِس قسم کی تلافی غیر ممکن تھی۔ اِس ضمن میں البیرونی کے اشارات نہایت معنی خیز ہیں۔ لکھتا ہے.....

"مجھے بتایا گیا کہ ہندو قیدی رہا ہو کر بھاگ کر جب اپنے ملک یا مذہب میں واپس آتے ہیں تو ہندو حکم دیتے ہیں کہ انھیں ازراہِ کفارہ پہلے برت رکھنا چاہئیے اس کے بعد انھیں گائے کے گوبر، پیشاب، اور دودھ میں دفن کردیتے ہیں یہاں تک کہ اُن پر عملِ تخمیر مکمل ہوجائے بعد کو اسی قسم کی چیزیں (مثلاً گائے کا گوبر، پیشاب، دودھ وغیرہ) انھیں کھانے کو دی جاتی ہیں۔ میں نے اپنے برہمن دوستوں سے اس کی تصدیق کرنا چاہی تو انھوں نے انکار کیا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اِس قسم کے کفّارہ کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ فوجی قیدی اپنی سابقہ حالت پر کسی صورت سے واپس نہیں لوٹایا جاسکتا....."

بلاشبہ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ تہذیب وتمدّن کے فروغ ونشوونما کے لئے "انسانی غلامی" کو ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ میسوپوٹامیہ، کریٹ، مصر اور یونان کی ابتدائی تہذیب و معاشرت کی بنیادیں "بے رحمانہ جبریہ غلامی" پر استوار کی گئیں لیکن تیرھویں صدی عیسوی میں ضروریاتِ زندگی کے لئے ترقی یافتہ ذرائع پیداوار کو مدّنظر رکھتے ہوئے اِس قسم کا

سماجی نظام (جیسا کہ منو نے مرتب کیا ہے) نہ صرف غیر ضروری بلکہ (انسانیت کے لئے) تباہ کن تھا۔ البیرونی نے کتاب الہند میں اپنے عہد کی ہندو تہذیب و معاشرت کو جس انداز پر دیکھا ہے بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے لیکن منو کا قانون (منو اسمرتی) محض خارجی بیان پر مشتمل نہیں ہے یہ ایک قانون کی کتاب ہے اور مصنف کا منشا غالباً قانون کی دفعات کو بطور اصولِ موضوعہ تسلیم کرا لینے کے اور کچھ نہیں پھر بھی منو اسمرتی میں ذات پات کی تصریحات، برہمنوں کی دوسروں پر فوقیت، اور شودروں کی مظلومانہ محکومیت نہایت معنی خیز ہیں۔ مثلاً

"کائنات عالم کی ہر چھوٹی بڑی چیز برہمنوں کی ملکیت میں ہے (اور انھیں کو مالک و حاکم ہونے کا حق پہونچتا ہے) کیونکہ وہ برہما کے منہ سے پیدا ہوئے ہیں اور وید صرف انھیں کے لئے مخصوص ہیں۔ وہ دنیا میں بلحاظ پیدائش سب سے اعلیٰ ہیں..... " (منو ادھیائے پہلا اشلوک ۹۳ تا ۱۰۰)

"برہمن کو ایسے ملک میں نہیں رہنا چاہئے جہاں کے حکمراں شودر یا چنڈال یا پاکھنڈی (بدطینت) یا مرتد لوگ ہو" (منو ادھیائے تیسرا اشلوک ۶۱)

"عظمت و عزت، عبادت و ریاضت، پاکی و صفائی اور پیدائش کے لحاظ سے برہمن (ذات) تمام دیگر ذاتوں کی آقا و مالک ہے" (منو ادھیائے ۱۰، اشلوک ۳)

"متبرک رسوم (غالباً یگیہ، ہون وغیرہ) کو ادا نہ کرنے کی وجہ سے نیز برہمنوں کی عظمت کو تسلیم نہ کرنے کے باعث مندرجہ ذیل اقوام رفتہ رفتہ اچھوت بن گئیں:-
پونڈرک، دراوڑ، کمبوج، یون، اشک، پہلوی، کرات وغیرہ وغیرہ" (منو ادھیائے ۱۰، اشلوک ۴۳، ۴۴)

ع۱:۔ صاحب مقدمہ نے کم و بیش پانچ فلسکیپ صفحات پر منو اسمرتی کے مختلف ابواب سے نہایا دیتیں فراہم کر کے اپنے بیان کی تصدیق کی ہے۔ راقم الحروف نے انہیں سے صرف چند مثالیں پیش کی ہیں ابقیہ کے لئے مقدمہ کا اصل متن ملاحظہ ہو جو تالیف ہذا کے ساتھ منسلک ہے (مولف)۔

"دنیا کی تمام وہ اقوام جن کا شمار چار وَرنوں میں نہیں ہے داس (غلام) ہیں خواہ وہ زبان آریوں ہی کی کیوں نہ بولتے ہوں" (منو ادھیائے ۱۰۔ اشلوک ۴۵)۔

"چنڈالوں اور اُن جیسے دیگر لوگوں کو آبادی کے باہر بسنا چاہیے اور اُن کی دولت کتوں اور گدھوں کے سوا اور کچھ نہ ہونا چاہیے۔ لباس مُردوں کی اُترن ہو۔ کھانا ٹوٹی رکابیوں میں کھائیں۔ ان کے زیورات لوہے کے بنے ہوئے ہونا چاہئیں۔ اور زندگی خانہ بدوشوں کی طرح بسر کرنا چاہیے۔ رات کے وقت وہ گاؤں اور قصبوں میں نہ چلیں پھریں۔ دن کے وقت انھیں راجہ کے مقرر کردہ نشانوں کو لگا کر آبادی میں داخل ہونے کی اجازت ہے۔ وہ اپنے متعلقہ فرائض انجام دیں اور لاوارث لاشوں کو اٹھائیں۔ یہ طے شدہ قانون ہے" (منو ادھیائے ۱۰۔ اشلوک ۵۱ تا ۵۵)

بلا شبہ ہر زمانہ میں اعلیٰ قسم کا ہندو ازم بھی پایا جاتا رہا ہے جو مسلک کے اعتبار سے موحد، بت پرستی کا مخالف اور مساوات کا حامی رہا۔ البیرونی نے اپنا زیادہ وقت اسی قسم کے ہندو ازم کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کے بعض اشارات قابلِ تذکرہ ہیں۔ لکھتا ہے "موکش (نجات) کے بارے میں ہندوؤں میں آپس میں اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ موکش (نجات) پانے کے مستحق صرف برہمن اور کشتری ہیں کیونکہ دوسری ذاتیں وید نہیں پڑھ سکتیں۔ لیکن ہندو فلاسفروں کے نزدیک نجات کا استحقاق تمام ذاتوں اور عام بنی نوع انسان کو حاصل ہے بشرطیکہ اس کے حصول کے لئے صحیح کوشش کی گئی ہو چنانچہ ویاس منی کا کہنا ہے کہ ۲۵ باتیں یاد کر لو اس کے بعد کوئی مذہب بھی اختیار کرو تم نجات پا جاؤ گے۔"

ویاس جی شُو درگھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے توحید کی تعلیم پیش کی ہے[۱]۔

اِس قسم کے اقتباسات (ہندوؤں کی) مذہبی کتب نیز کتاب الہند سے بکثرت پیش

۱:۔ ویاس جی کی تعلیم کیلئے مقدمہ کا اصل متن ملاحظہ فرمائیے (مؤلف)

کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کسی قوم کے وجود کو قائم و دائم رکھنے کے لئے مذہبی کتب کے مقدس اصول ناکافی ہیں اگر ان پر عمل نہ کیا جائے کیونکہ دنیا کی بین الاقوامی کشمکش میں قومیں ایک دوسرے کے اعمال ہی کا جائزہ لیا کرتی ہیں۔ اور اس کے اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ صادر کرتی ہیں۔

آج تاریخ کا کوئی بھی طالب علم محمد غوری اور اس کے افسروں کی فوجی مہارت کا قائل نہیں۔ بیشک وہ لائق منتظم ضرور تھے اور جیوٹ وار آدمی کی طرح اپنے مقصد پر قائم رہنا بھی جانتے تھے لیکن اُن کی فوجی تدبیروں یا چالوں میں تخلیقی یا اختراعی قوت کارفرما نظر نہیں آتی پھر بھی ان کی فتوحات نہایت سریع و پائدار تھیں اور یہ دونوں حیرت انگیز باتیں تشریح طلب ہیں۔

تمام مسلم مورخین کا اِس امر پر اتفاق ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں مسلم ایشیائی سوسائٹی کا اخلاقی انضباط بگڑا ہوا تھا۔ اِس کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۲۰۵ء میں شمالی ہند کے فاتحین (شنسبانیہ) کو اندخود کے مقام پر خوارزمشاہیوں کے ہاتھ سے ایسی زک اُٹھانی پڑی کہ جس سے وہ پھر دوبارہ نہیں پنپ سکے۔ اِس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد یعنی ۱۲۱۸ء میں چنگیزی طوفان اُٹھا جس نے وسط ایشیاء کی ہر چھوٹی بڑی سلطنت کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکا۔ اِس طرح ترکی و عجمی سب کے سب مغلوں کے محکوم بن گئے اِسلئے علاءالدین عطا ملک جوینی کی یہ تشخیص کہ ان لوگوں کا فوجی و سیاسی مزاج فاسد ہو چکا تھا اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے۔ اِس سلسلہ میں مورخ مذکور نے ایک نہایت دلچسپ مثال پیش کی ہے جو اس عہد کے بگڑے ہوئے فوجی نظام کی عکاسی کرتی ہے۔ شہنشاہ خوارزم کے ایک انسپکٹر کو بوقت معائنہ داروغۂ اصطبل جواب دیتا ہے "بیشک شاہی گھوڑوں کا اندراج رجسٹر میں تو ہے لیکن کیا ضرور کہ وہ اصطبل میں بھی موجود ہوں"

یہ تھے وہ حالات جبکہ شمالی ہند کی تسخیر عمل میں آئی۔ اِس صورت میں کیا اِسے

ترکوں کا فوجی کارنامہ سمجھا جا سکتا ہے؟ نہیں اور یقیناً نہیں بلکہ ترکی تسخیر و تعمیر کا اصل سبب ہندی سوسائٹی کی شکستگی و زبوں حالی ہے۔ ہندوستانی مزدور پیشہ جماعتوں کو حکمراں طبقے نے اتنی سقیم و پست حالت میں ڈال رکھا تھا اور جس کی وجہ سے وہ اپنے آقاؤں سے اس قدر نالاں تھے کہ انھوں نے غنیم کے مقابلہ میں نہ صرف لڑنے سے انکار کر دیا بلکہ اسے دل کھول کر مدد دی۔ اس طرح ایسا وسیع و عریض اور خوشحال ملک جیسا کہ ہندوستان ہے سماج کی انتہائی حماقت کا شکار بن گیا۔ غرضکہ وہ اسباب جن کی وجہ سے ترکوں کو ہندوستان میں فتوحات حاصل ہوئیں وہی اُن کے استقرار کا موجب بن گئے۔

شری بشیر الدین پنڈت نے (دیباچہ میں) بتایا ہے کہ پانچ چھ صدیوں تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی بلوہ رونما نہیں ہوا تو اس میں ہمارے لئے تعجب کی کونسی بات ہے۔ شہری و قصباتی آبادی کا اکثر و بیشتر حصہ مزدور پیشہ طبقوں پر مشتمل تھا جو ہندو حاکم کے مقابلہ میں مسلمان حاکم کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ اس کے زیر سایہ وہ اپنی پوزیشن کو محفوظ و مستحکم اور بہتر حالت میں پاتے تھے۔

تیرھویں صدی کے ترکی حکمرانوں نے مقامی باشندوں کے مذہبی و معاشرتی امور میں قطعی کوئی دخل نہیں دیا۔ کیونکہ انھیں اپنے اصلی وطن (وسط ایشیاء) میں مغلوں کے غلبہ و اقتدار کی وجہ سے ہندوستان کو اپنا وطن بنا کر یہیں مرنا اور یہیں جینا تھا۔ اور اس کے لئے یہ لابدی امر تھا کہ لوگوں کے قلوب کو مسخر کیا جائے۔ چنانچہ شہنشاہی حکومت کا دائرہ اثر جہاں تک پہونچا لوگوں نے اپنے کو پہلے سے بہتر حالت میں محسوس کیا کیونکہ اب نہ وہ ذات پات کے بندھن اور اونچ نیچ کے جھگڑے تھے اور نہ چھوت کا بھوت ان کی راہ میں حائل تھا۔ وہ شہروں میں آباد ہو سکتے تھے اور آزادی کے ساتھ اپنا کام کاج کر سکتے تھے (اس لئے خوش تھے اور ترکوں کے معین و مددگار)

ترکی حکام کی آمد کے ساتھ ہی ساتھ قوانین شریعت بھی آ گئے اور قاضی بھی۔ گو انھوں

ملاحظہ تاریخی شہادتوں کے لئے مقدمہ کا اصل متن ملاحظہ ہو

نے غیر مسلموں کے مذہبی و معاشرتی آئین و رسوم کو اُن کے حال پر جیوں کا تیوں رہنے دیا لیکن ان کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ عبادات سے قطع نظر "معاملات" کے اندر وہاں ذمّی و غیر ذمّی ایک سطح پر نظر آتے ہیں اور یہ چیز ذات پات کے امتیازی قوانین کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کے لئے بالکل نئی اور انوکھی سی بات تھی (اس نے بھی ہندوؤں کو اپنانے میں بڑی مدد دی)۔

میری ان گذارشات سے کہیں یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ مسلمانوں نے کسانوں اور پیشہ ور جماعتوں سے استحصال و منفعت کے طریقوں کو خیر باد کہدیا تھا نہیں ایسا ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ قرونِ وسطیٰ میں بھی اجرت و محنت کے مسائل کو حل کرنا پڑا ہے[1] لیکن اس حل کی نوعیت دوسری تھی۔ اسلام سے پیشتر دُنیا میں استحصال کے لئے تین مختلف طریقوں پر عمل ہوتا تھا یعنی یونان کی "زرعی غلامی" یا میرو کریٹ کی "محکومانہ جبریہ غلامی" یا ہندوستان کی (مسئلہ چھوت کی بنا پر) "طبقاتی غلامی"۔ اسلامی شریعت نے ان تینوں طریقوں کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور حصول منفعت کے لئے "آزاد اُجرت اور انتقال پذیر محنت" پر عمل کیا۔ اِس سے مزدور بھی خوش ہو گیا اور پیداوار میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ترکی سلاطین نے اپنے عہد حکومت میں اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور ملک مالا مال ہو گیا[2]۔

شمسباتی ترکوں کی کامیابی کے راز کو اگر معلوم کرنا ہے تو تاریخ عالم کے سیاق و سباق کو پیشِ نظر رکھئے۔ انھوں نے "ذات پات" کی تصوری دنیا اور معاشرتی اصولوں کو خیر باد کہکر "آزاد و انتقال پذیر محنت" کی طرف توجہ دی۔ شہر کی اُن مزدور پیشہ جماعتوں کو جو اپنی ذاتی کوشش سے "ذات پات کی غلامی" سے نجات حاصل نہیں کر سکتی تھیں آزاد کرایا اور اس کا اچھا صلہ پایا۔ ہر قسم کے اہل حرفہ و ماہرین فن (جن کو ابتک

---

[1] و [2] ۔ تفصیل کے لئے اصل متن ملاحظہ فرمائیے۔

ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، جوق درجوق شہروں میں جمع ہو گئے۔ ترکوں نے انکو خوش آمدید کہا اور ان کی ہر طرح سے ہمت افزائی کی۔ اس کا فوری نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ گھریلو صنعتوں کو ترقی ہوئی اور پیداوار کی مقدار و ماہیت دونوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسی نسبت سے تجارت کو بھی ترقی ہوئی جس سے راعی و رعایا دونوں نے فائدہ اٹھایا تجارت کی ترقی کے لئے سڑکوں کی حفاظت ضروری تھی، سلاطینِ دہلی بھی اس کی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تختِ دہلی کے ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں بار بار منتقل ہونے کے باوجود تجارتی شاہراہیں کھلی رہیں۔ اور "آزاد اجرت اور آزاد محنت" کے اصول پر عمل ہوتا رہا۔

ایک عرصۂ دراز تک حکمراں رہنے کے باوجود مشرقی بنگال، سندھ اور پنجاب کے دیہی علاقوں کے علاوہ مسلمانوں کو عددی اعتبار سے ملک کے دوسرے حصوں میں شاندار کامیابی حاصل نہیں ہو سکی اور آج ہندیونین میں ان کی تعداد ۱۴ فی صدی سے زائد نہیں اور دیہی علاقے میں تو وہ صرف ۳ فیصدی ہیں۔ اس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے (۱) یا تو وہ دیہی علاقوں میں مذہب کی تبلیغ و اشاعت سے غافل رہے یا (۲) مقامی جتھوں کی مخالفت اتنی سخت تھی کہ جس کی وجہ سے وہ ناکامیاب رہے لیکن جہاں تک شہری و قصباتی آبادی کا تعلق ہے اسلام نے معتد بہ ترقی کی چنانچہ قرونِ وسطیٰ کی تاریخی شہادتوں کا استقصاء کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ علاء الدین خلجی کے دورِ حکومت تک شمالی ہند کی تمام شہری آبادیوں میں نصف کے بقدر تعدادِ اسلام پر ایمان لا چکی تھی جو زیادہ تر دو پیشہ طبقوں پر مشتمل ہے جن کے اندر خالص ہندوستانی خون رواں دواں ہے۔

ہندوستان کے سابقی ہندو حکمراں طبقے نے دہلی سلطنت کے اندر بھی اور باہر

---

(۱):۔ مقدمہ کا اصل متن ملاحظہ ہو۔

بھی) تلخ تجربوں کے باوجود اپنی پرانی ذہنیت کو کیوں باقی رکھا اور اسمیں تبدیلی پیدا نہیں کی تو اس کا جواب دینے سے ہم قاصر ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں بڑے بڑے ہندو فلاسفر اور ریفارمر پیدا ہوئے جنہوں نے البیرونی کی طرح خذ ما صفا دع ما کدر کا پرچار کیا لیکن انمیں کسی ہندو راجہ کا نام دکھائی نہیں دیتا جس نے سوسائٹی کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا ہو بلکہ اس کے برخلاف ہر خود مختار ہندو راجہ نے اپنے پیشرو راجہ داہر پرتھوی راج اور جے چند کے الناک نقشِ قدم پر چلنا اپنا فرض سمجھا اور دستکار و مزدور پیشہ طبقوں کو بدستور اسی انداز پر دبایا جاتا رہا کہ جس کے لئے منو کے قوانین کو ترتیب دیا گیا تھا اور جو آریوں کے معاشرتی نظام کی جان تھے۔

بہرحال اگر ہم یہ ذہن نشین رکھنا چاہتے ہیں کہ دہلی سلطنت کی حکمراں جماعتوں کی زندگی کسانوں اور مزدوروں کی پیدا کردہ فاضل قدر (Surplus value) سے وابستہ تھی نیز یہ کہ حکومتوں کا بقا و استحکام غیر پیشہ ور جماعتوں کے اشتراک و امداد کے غیر ممکن ہے تو آئیے قاری محمد بشیر الدین پنڈت کی تالیف کردہ تاریخ کے واقعات کو پڑھئے جو نہایت سبق آموز ہیں۔ اور قرونِ وسطیٰ کے مستند تاریخی ماخذات مبنی ہیں۔

قاری صاحب موصوف سے پوری توقع ہے کہ وہ اپنی اس قابلِ قدر تصنیف کو جو اتنے اچھے انداز پر ترتیب دی گئی ہے (طلباء و سیاک دونوں کے استفادہ کے لئے) اُردو و ہندی دونوں میں زیورِ طباعت سے آراستہ فرمائیں گے۔

محمد حبیب
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۱ جولائی سنہ ۱۹۴۹ء

(مترجمہ مولف)

ص

تقریب

از

(عالیجناب شیخ عبدالرشید صاحب

ایم اے، ایل ایل بی

صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

ہندوستان میں اسلامی دورِ حکومت کی تاریخ اب تک تشنۂ تحریر و ترتیب رہی ہے لیکن اب اس اہم ذمہ دارانہ کام کو قاری محمد بشیر الدین پنڈت نے تین جلدوں میں ترتیب دیکر عہدہ برآ ہونے کی سعی فرمائی ہے۔ یہ مہتم بالشان کام اردو زبان میں ہے جس کی دوسری جلد منظرِ عام پر لائی جارہی ہے مخصوص عالمانہ صفات سے متصف ہونے نیز عربی فارسی، سنسکرت اور ہندی میں مہارت تامّہ رکھنے کے باعث کہ جن میں ہندی قرون وسطیٰ کے نہایت اہم دور کا سرمایہ محفوظ ہے قاری صاحب موصوف حقیقتاً اس کام کے لئے موزوں ترین شخصیت کے مالک ہیں۔

تالیف پیشِ نظر مروجہ درسی کتب کی نہ صرف تصحیح کرتی ہے بلکہ ہندوستان پر اسلامی حملوں کی ماہیت و اہمیت کا اندازہ بھی کراتی ہے کہ جو محمد بن قاسم کے عہد سے شروع ہوکر ایک عرصہ تک جاری رہے۔ ہندوستان کی تمام تاریخوں میں (بلا استثنیٰ) جو بنیادی غلطی اب تک ہوتی چلی آئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی تاریخ کو تاریخ عالم اور اس کے مسلمہ اصولوں سے غیر متعلق ہوکر ترتیب دیا ہے۔ اسلئے ہمارا مطالعہ یکطرفہ، قومیت کے تنگ دائرہ میں محدود اور مجرمانہ حد تک فرقہ وارانہ رہا ہے۔ پنڈت جی صاحب موصوف ان تمام باتوں سے محفوظ رہے۔ انھوں نے ہندوستان کے معاشرتی ماحول نیز عہدِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے عمرانی، سیاسی اور تہذیبی پس منظر کی نہایت واضح و روشن

اور دلکش تصویر کھینچی ہے کہ جس میں رہکر مسلم فاتحین کو اپنی فتوحات اور اُن کے انضمام و استحکام کا کام انجام دینا پڑا۔

تالیف مذکور تاریخی شواہد و دلائل سے پُر ہے اور اس میں ہمعصر نامور مؤرخین کی کتب کے اقتباسات کو نہایت خوبی کے ساتھ سمویا گیا ہے۔ اسلئے عام درسی کتب کی عبارات مستند تواریخ کے عمدہ و بیش قیمت اقتباسات پڑھنے کے ذوق و شوق کو جتنا زائل کرتی ہیں اتنا ہی ہندی قرونِ وسطیٰ پر یہ تازہ تالیف قدیم مآخذات سے نہ صرف روشناس کراتی ہے بلکہ اس ذوق و شوق میں اور اضافہ کرتی ہے۔ علاوہ ازیں کتاب کی دلآویزی و دلکشی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس میں تاریخی واقعات کی نہایت منصفانہ وغیر متعصبانہ نیز دل نشین انداز سے تنقیح و توضیح کی گئی ہے۔ نتائج کے استنباط میں توازن کو برقرار رکھا گیا ہے اور مختلف فیہ مسائل میں تلخی پیدا نہ ہونے کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا ہے۔ مؤلف کو چونکہ اپنے مضمون پر قدرت حاصل ہے۔ اسلئے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نہایت متانت سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ۔ اور اس کو ہمعصر تاریخی دستاویزات کے حوالہ جات سے موقر بنایا گیا ہے۔

ٹریولین کا کہنا ہے "کون ایسا ہے جو تاریخ پڑھنے سے گریز کرے بشرطیکہ وہ مسحور کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ اسلئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے حتی الامکان دلکش بنائیں اور اس کی دلکشی کو قابلیت کی قربان گاہ پر ثقیل وغیرہ مانوس الفاظ کے ذریعہ بھینٹ نہ چڑھائیں۔ قاری محمد بشیر الدین پنڈت ایم۔ اے (علیگ) کی یہ تازہ تالیف اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے مؤلف کی تبحر علمی اور وقت نظر کا پتہ چلتا ہے۔ زبان نہایت سلیس و سادہ اور طرز بیان پیچیدگیوں سے پاک و صاف اور موثر ہے۔

قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت نے مغربی مؤرخین کے برخلاف کہ جنہوں نے بعض سیاسی اغراض و مقاصد کی تکمیل کی خاطر اسلامی عہد حکومت کے واقعات

کی غلط تاویلات پیش کی ہیں قرونِ وسطیٰ کے صحیح تناظر کو مدِنظر رکھ کر نہایت وسعتِ قلب اور ذہانت و ذکاوت کے ساتھ تاریخی واقعات کا جائزہ لیا ہے۔ تالیف مذکور کی اشاعت کے لئے موقع بھی نہایت مناسب ہے جبکہ قومی حکومتیں برسرِ اقتدار ہیں۔ اُمید ہے کہ کتاب قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیگی۔

تالیف میں کتابت و طباعت نیز واقعات کی چند نہایت معمولی غلطیاں ہیں جو مثال کے طور پر اضافی نوٹ ص۴۲۸ اور صحت نامہ کے ساتھ منسلک ہیں۔ اُمید ہے کہ دوسری اشاعت میں ان کی تصحیح کردی جائیگی۔

(مترجم مولف)

شیخ عبدالرشید
مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۲ اگست ۱۹۴۹ء

تعارف

از

(عالیجناب پروفیسر مولانا ضیاء احمد صاحب بدایونی (ایم اے)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

کسی نے سچ کہا ہے کہ تاریخ انسانیت کا حافظہ ہے۔ یعنی جس طرح ایک فرد حافظے کی بدولت اپنے گذشتہ تجربوں کو محفوظ رکھتا اور اُن سے آئندہ زندگی میں کام لیتا ہے۔ اسی طرح اقوام بھی تاریخ کی مدد سے سابق کارناموں کو یاد رکھتی اور اُن کو راس المال قرار دے کر کاروبار حیات میں مصروف ہوتی ہیں۔ دُنیا میں ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے۔ اور متاخرین نے متقدمین کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ غور تو کیجئے اگر ہماری زندگی کا رشتہ ماضی سے بالکل منقطع ہو جائے۔ اور ہم اگلوں کے کارناموں سے مستفید ہونے۔ اور اُن کی غلطیوں سے عبرت حاصل کرنے سے محروم ہو جائیں تو زندگی کس قدر کٹھن اور دُنیا کتنی بھیانک ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مہذب قوموں نے ہمیشہ سے تاریخ کو درخور اعتناء سمجھا ہے۔

جب ہم تاریخ کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو اکثر علوم و فنون کی طرح تاریخ میں بھی یونان ہی کو شرف تقدم کا حاصل پاتے ہیں۔ چنانچہ ہیروڈوٹس[1] یونانی جو حضرت مسیح سے ۴۸۴ سال قبل پیدا ہوا تھا تاریخ کا موجد اور اس فن کا ابو الآباء مانا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی تاریخ حقیقت اور خرافات (دیومالا) کی معجون مرکب تھی۔ تاہم اُس نے اپنے نزدیک جن اُمور کو صحیح سمجھا بے کم و کاست بیان کر دیا۔ غرض اُس نے اور اُس کے معاصرین نے اسی معیار پر زور دیا ہے۔ زینوفن (۴۴۴-۳۵۹ ق-م) کے عہد میں حقیقت نگاری ادبیت اور صناعی کے پردوں میں روپوش ہو گئی۔ یہاں تک کہ رومیوں

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔

کاسلوں آگیا جس نے ڈبلیو فی سی ایس۔ اور سمرو جیسے نامور مورخ پیدا کئے۔ مسیحیت کے عروج اور چرچ کی فتح سے تاریخ میں [illegible] دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اور اس عہد کی تاریخی تصانیف قدرۃً مذہب کے رنگ میں رنگی [illegible] ہیں۔ اور تحقیق کی جگہ تقلید اور صداقت کی جگہ تعصب کارفرما ہے۔

پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی کا زمانہ یوروپ میں نشأۃ ثانیہ کا زمانہ تھا جب کہ فرانس اور انگلستان وغیرہ میں ادب اور فنون لطیفہ کے نصب العین میں اصلاح و تجدید عمل میں آئی اور تاریخ کا مطمح نظر بھی بلند ہوا۔ انیسویں صدی تاریخ کی سائنس میں نمایاں انقلاب کا پیش خیمہ بن کر آئی۔ اگر ہیگل جس نے تصوریت اور عقلیت پر اپنے فلسفہ کی اساس رکھی ہے تاریخ کو تصوری نقطۂ نظر سے جانچتا ہے۔ تو کارلایل تاریخ کو صرف ابطال عالم کے سوانح کی حیثیت دیتا ہے۔ اُسی زمانے میں یہ خیال پیدا ہوا کہ تاریخ ماحول اور خارجی محرکات کے نتائج کا نام ہے۔ اور ماحول سے مجرد کر کے اُس کا مطالعہ گمراہ کن ہے۔ اِسی خیال کو کارل مارکس نے زیادہ قوت سے پیش کیا۔ اور تاریخ کے مادی اور معاشی تصور پر زور دیا۔ جدید ترین تھیوری کے مطابق تاریخ کے تصور میں اور وسعت پیدا ہوئی اور اہل علم نے تسلیم کیا کہ تاریخ کی کوئی ایک شاخ حیاتِ انسانی کے عظیم ۔ ۔ ۔ ـــــــــ نمونے کی ایک جھلک سے زیادہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہر شعبے میں تخصص کو پسند کیا جاتا ہے۔ ہر چند کہ یہ مختصر گریز علمی حق پوشی ہوگی اگر اس سلسلے میں مسلمانوں خصوصاً عربوں کے اہم کارناموں کا تذکرہ نظر انداز کر دیا جائے اُنھوں نے اِس فن شریف کو مذہبی فریضے کی حیثیت سے شروع کیا۔ اور جلد ایک مستقل علم بنا دیا۔ در اصل فن حدیث کی تدوین رجو بجائے خود اتنا بڑا شاہکار ہے کہ کسی قوم کے علمی آثار میں اُس کی نظیر مفقود ہے) نے ان کو تاریخ کی ضرورت کی جانب متوجہ کیا۔ اور سیر و مغازی کے شوق نے تراجم و سوانح رجال کا ذخیرہ فراہم کر دیا۔ ہجرت کی ابتدائی

صدیوں میں جو ممتاز مورخ گذرے ہیں انھوں نے تاریخ میں صحت و دیانت کا سختی سے
لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ وہ کسی واقعے کو اس وقت تک نقل نہیں کرتے جب تک کہ وہ معتبر اور
مسلسل اسناد کے سلسلے سے واقعے کے چشم دید گواہ تک منتہی نہ ہو۔ وہ حقیقت کو جوں کا توں
نقل کر دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اس کے محرکات و اسباب پر رائے قائم کرنے کا
حق قاری کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ عہد[1] اسلام کے ابتدائی زمانے کے مورخوں میں ابن
اسحٰق۔ طبری۔ کلبی۔ واقدی۔ اسدی۔ مسعودی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن
شروع میں درایت سے زیادہ روایت۔ اور استدلال و استنباط سے زیادہ جرح
و تعدیل کی گرم بازاری رہی۔ یہاں تک کہ ایک ایسا بالغ نظر مورخ پیدا ہوا جس نے
تاریخ کے نظریات میں انقلاب پیدا کر دیا جس نے اس فن کو ایک علم کی حیثیت عطا
کی۔ اور جس کو مشرق و مغرب دونوں نے تاریخ کا امام تسلیم کیا۔ یہ[2] ابن خلدون (المتوفی
۸۰۸ھ ہجری) تھا۔ اس کی تاریخ خصوصاً مقدمہ اس کے عہد سے لیکر اب تک ہر صاحب
فن کے لئے شمع راہ کا حکم رکھتا ہے۔ فاضل موصوف نے اپنی کتاب میں جو تمام عربی علوم
و تمدن پر حاوی ہے جس ژرف نگاہی۔ اصابت رائے اور سلاست بیان کا ثبوت دیا ہے
اس نے کتاب مذکور کی قدر و قیمت میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ
اس کی نظیر اسلامی تصانیف میں۔ بلکہ اس عہد کی تمام تصانیف میں نہیں ملتی۔ ایک مورخ
کے فرائض کیا ہیں۔ اس کا جواب خود ابن خلدون کی زبانی سنئے۔ وہ مقدمہ[3] میں لکھتا ہے۔
"مورخ کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ موجودات عالم کی طبیعت اور سیاست کے
قواعد و اصول اچھی طرح جانتا ہو۔ اور واقف ہو کہ سیرت و اخلاق۔ مذہب و ملت وغیرہ
میں زمان و مکان۔ ملک و قوم کے بدلنے سے کیا کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اور قدرت
رکھتا ہو کہ حاضر کو غائب کے ساتھ مماثل یا مغائر قرار دینے کے لئے وجہ توفیق و تفریق

---

[1] دائرۃ المعارف بستانی [2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام [3] ترجمہ مقدمہ ابن خلدون

پیدا کر سکے۔ اور سلطنت و ملت کے اصول اور ان کے ظہور و حدوث کی علتوں اور ملک کے رہنے والوں کے احوال و اخبار سے آگاہ ہو تاکہ ہر حادثہ کی لِم اور ہر طرح کی خبروں کے اسباب کو سمجھ سکے اور پھر خبر منقول کو اس کے اصول و قوانین پر جانچے۔ اگر ان کے موافق اور مقتضائے وقت پائے تو اس کی تصدیق کرے۔ ورنہ تکذیب و تردید۔

دوسری جگہ روایت پر درایت کو ترجیح دیتے ہوئے رقم طراز ہے "اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں جن کا صدق و کذب طبیعت عمران کے جاننے ہی سے دریافت کیا جا سکتا ہے اور یہ طریقہ اخبار کی تحقیق و تنقید اور صدق و کذب میں تمیز کرنے کے لیے سب طریقوں سے بہتر اور بھروسے کے قابل ہے۔ اور راویوں کی تعدیل پر مقدم کیونکہ راویوں کی تعدیل کی ضرورت تو اس وقت ہے کہ پہلے معلوم ہو جائے کہ خبر بجائے خود ممکن بھی ہے یا نہیں اگر ممکن ہی نہیں ہے تو پھر ان کے حال میں جرح و تعدیل کرنے سے کیا فائدہ؟" اقتباسات طویل ہو گئے لیکن مورخ علام کا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے ان کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنی تاریخ میں اقوام کے طبعی و جغرافیائی ماحول اور اس کے آثار و نتائج سے فلسفیانہ بحث کی ہے۔ اور اس کی روشنی میں عام تاریخی بیانات کے صدق و کذب کی وجوہ تلاش کی ہیں

فارسی میں بھی تاریخ کا ذخیرہ کافی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ فارسی مورخین نے ابن خلدون کے قائم کردہ معیار پر زیادہ توجہ نہ کی۔ البتہ اہل مغرب نے ابن خلدون کے نصب العین کو مشعل ہدایت بنایا۔ بلکہ اس کی رہنمائی میں اس فن کو اور زیادہ ترقی دی۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ یورپ والوں کی اکثر تاریخوں پر تاریخ سے زیادہ سیاست کا رنگ چھایا ہے اور ان سے صداقت کی بجائے۔ پروپیگنڈا مقصود ہوتا ہے۔ ہمارے ہندوستان ہی کو کیوں نہ دیکھ لیجئے۔ یہاں جو تاریخیں انگریزوں کے قلم سے یا ان کے اثر سے لکھی گئیں تقریباً سب میں تصویر کا صرف تاریک رخ

دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسا کہ بعض انصاف پسند انگریز اہل قلم نے اعتراف کیا
ہے ان تاریخوں کا مقصود یہ تھا کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول کے ماتحت ہندو
مسلمان ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں۔ ہندو لوگ مسلمان حکمرانوں کو ظالم سمجھ کر
انگریزی حکومت کو اپنے حق میں سایۂ رحمت سمجھیں اور ہندوستان میں سلطنت برطانیہ
کو استحکام حاصل ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو طلبہ ان تاریخوں کو پڑھ کر نکلے اُن کے ذریعے
سے باہمی منافرت کا تخم سرسبز ہوا۔ اور اُس کا پھل آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔
اگرچہ یہ صحیح ہے کہ کسی تخم کے پھلنے کے واسطے ضرورت ہے کہ زمین اُس کے قبول کرنے
کیلئے پہلے سے تیار اور موزوں ہو۔ تاہم اُن تواریخ کے اثر کو جھٹلانا ممکن نہیں جنھوں نے
اُس زمین میں آبیاری کا کام دیا۔

مسلمان حکمرانوں کا ذکر آ گیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بارے میں چند
جملے عرض کر دیے جائیں۔ سندھ کو چھوڑ کر ہند میں جو مسلمان فاتح آئے (خواہ وہ نام نہاد
پٹھان[1] ہوں یا مغل) وہ نسلاً عرب نہ تھے۔ اور عموماً صحیح اسلامی روایات سے بیگانہ تھے۔
کہنا چاہیئے کہ اُن کا اسلام سیکنڈ ہینڈ اسلام تھا۔ اِس لئے اُن سے خلفائے راشدین کے
طرز عمل کی توقع عبث ہے۔ اِن فاتحین اور سلاطین میں بیشتر معدلت شعار تھے۔ اور
جو ظالم اور نفس پرور تھے ان میں بھی کچھ اچھے پہلو تھے۔ لیکن یورپین مورخین۔ اور
اُن کی تقلید میں دوسرے غیر مسلم اہل قلم نے سب اچھے بروں کو ایک ہی لکڑی سے ہانکا
اور ان کی تمام برائیوں کا ذمہ دار اسلام کو ٹھہرایا ہے۔ بے شبہ عام طور پر دنیا کی یہی روش
رہی ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ کسی مسلمان نے حضرت بایزید بسطامیؒ کے عہد میں کسی

---

[1] ہندوستان کے مسلمان بادشاہ پٹھان اور مغل کے لقب سے مشہور ہیں۔ حالانکہ لفظ پٹھان کا مختلف
خاندانوں مثلاً غلام و خلجی (ترک)۔ تغلق (ولایتی اور نو مسلم کی آمیزش) سید (عرب) اور لودی و سوری (پٹھان)
پر آزادانہ اطلاق کیا گیا ہے۔ مغل بھی در اصل ترک تھے۔ ۱۲ ایڈیٹر

مجوسی کو اسلام کی تلقین کی۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ اگر تمھاری مراد اُس اسلام سے ہے جو بایزید کا ہے تو مجھے اس کی قدرت نہیں۔ اور اگر اُس اسلام سے ہے جو تمہارا ہے تو مجھ کو ضرورت نہیں۔ جیسا کہ رومی کہتے ہیں۔

ہست ایمانِ شما زرق و مجاز ۔۔۔ راہ زن مانند آں بانگِ نماز

مگر سچ پوچھئے تو یہ روش تحقیقِ حق کی راہ سے دور ہے۔

ایک[1] یوروپین مصنف نے سچ لکھا ہے کہ افراد و اقوام کی طرح ہر مذہب کا بھی ایک مزاج ہوتا ہے جو اُس کے تمام اشغال و اعمال میں کارفرما ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ جس طرح یہودیت کی اساس فرض۔ مسیحیت کی محبت۔ بدھ مت کی ضبط ہے۔ اسی طرح اسلام کی اساس عدل ہے بیشک قرآن و حدیث کی تعلیمات اول سے آخر تک عدل پر مبنی ہیں۔ انفرادی علائق میں ضرور احسان کو ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن اجتماعی معاملات میں عدل ہی اسلام کا طغرائے امتیاز رہا ہے۔ دوست تو دوست۔ مذہبِ اسلام دشمن کے ساتھ بھی (خواہ حالت جنگ کیوں نہ ہو) عدل کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ لایجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلوا۔ کسی قوم کی عداوت تمھیں اس جرم کا مرتکب نہ بنا دے کہ تم جادۂ عدل سے ہٹ جاؤ۔ غرض اسلامی شریعت کا صریح اور قطعی حکم ہے کہ مسلمان اگر حاکم ہے تو اچھا حاکم بن کر رہے۔ اور اگر بدقسمتی سے حالات نے اُس کو محکوم بنا دیا ہے تو اچھا محکوم ثابت ہو۔ اس کو اس نظر سے دیکھئے کہ مسلم کی غیر مسلم کے ساتھ تین حیثیتیں ہو سکتی ہیں۔ برتر۔ برابر۔ اور کمتر۔ پہلی صورت کے متعلق ہادیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صاف فرمان ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ماتحت (ذمی) غیر مسلم کو ستائے گا تو میں قیامت کے دن اُس مسلمان کے مقابل مدعی ہوں گا۔ اللہ اکبر جس کے مقابل سرورِ عالم خود مدعی ہوں اُس کا کہاں ٹھکانا۔ نعوذ باللہ من غضبہ وغضب رسولہ۔ بلاخوف

[1] برٹانیکا۔

تردید کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے کسی مذہب نے دوسرے مذہب کے پیرووں کو اتنا عظیم الشان چارٹر نہیں بخشا۔ دوسری صورت جب کہ دو مسلم یا غیر مسلم افراد یا حکومتوں میں برابر کا معاہدہ ہو ایسی حالت میں اسلام سختی کے ساتھ وفائے عہد کی تاکید کرتا ہے۔ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ۔ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا اور عہد کو پورا کرو کیونکہ عہد کی ضرور باز پرس ہوگی یہاں تک کہ اس غیر مسلم معاہد کے خلاف کسی مسلمان کو مدد دینا۔ یا بغیر کافی نوٹس دئے ہوئے معاہدے کا ختم کر دینا حرام ہے۔ رہی تیسری صورت سو اس میں کبھی کوآپریشن یعنی تعاون کا حکم ہے۔ بشرطیکہ یہ تعاون بر و تقویٰ پر مبنی ہو۔ اِثم و عدوان پر نہ ہو۔ کیونکہ لا طاعۃ المخلوق فی معصیۃ الخالق۔ کوئی انصاف پسند بتائے کہ اس سے بڑھ کر عادلانہ اور متوازن قانون کونسا ہو سکتا ہے۔ اور یہ صرف قول نہیں۔ عہد رسالت و خلافت راشدہ میں اس کے عملی مثالیں بکثرت ہیں جو واقفان آثار سے مخفی نہیں۔

اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلم سلاطین اگرچہ اسلامی تعلیم کا صحیح نمونہ نہ تھے اور ان میں بعض جفا پیشہ بھی تھے تاہم وہ مجموعی طور پر اصول عدالت پر کاربند تھے۔ اور کلیتہً مطلق العنان نہ تھے۔ کیونکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ الملک یبقی مع الکفر ولا یبقی مع الظلم۔ حکومت کفر کے ساتھ تو باقی رہتی ہے مگر ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔ ہندوستان کی اکثر تاریخوں میں خصوصاً جو آج کل اسکولوں اور کالجوں میں رائج ہیں ایک عیب یہ بھی ہے کہ ان میں سلاطین کے کیرکٹر۔ فتوحات۔ اور ملکی انتظامات کے دائرے سے نکل کر عام اہل ملک کی تہذیب و تمدن۔ علوم و فنون صنعت و حرفت سے کم اعتنا کی گئی ہے۔ ہم بادشاہوں۔ ان کے درباروں اہل دربار سے تو روشناس ہو جاتے ہیں۔ مگر ملک کے ذہنی و ثقافتی کارناموں کے آئینے میں اہل ملک کی جیتی جاگتی

---

[1] نہ صرف تعاون بلکہ مسلمانوں کو ان حالات میں وفاداری کی تعلیم دی گئی ہے جیسے کہ صحابہ نے نجاشی کے ساتھ برتی۔ البتہ خدا کے ساتھ وفاداری مقدم ہے۔

چلتی پھرتی شکلیں نظر نہیں آتیں۔ مثلاً ہمارے طلبہ جب غزنوی یا غوری کا حال پڑھتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ فاتح تھے (لٹیرے نہ سہی) جنھوں نے اپنے زورِ بازو سے ہند کو فتح کیا۔ اور عسکری قوت کے ذریعے سے اس کو ایک گونہ وحدتِ نظام بخشی۔ لیکن وہ اس سے بالکل نابلد ہوتے ہیں کہ مسلمانوں نے آکر ہندوستان کو کیسا پایا۔ کیا لے کر آئے اور اس کو کیا دیا۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کی تہذیب قدیم ہے۔ یہاں کی ویدانت، فلسفہ، ہیئت، جوتش صدیوں سے مشہور ہیں۔ اور یہاں کے رشی اور منی اپنی راہبانہ اور حکیمانہ تعلیمات کے لئے خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے اگر ہندوستان سے کچھ لیا تو اس سے زیادہ دے بھی دیا۔ توحید کا تصور۔ دختر کشی اور ستی کی روک تھام عقدِ بیوگان اور مساوات کی تعلیم مسلمانوں ہی کی آمد کے نتائج و برکات ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے رہنے سہنے۔ کھانے پینے۔ اور تہذیب کے دوسرے پہلوؤں میں تکلف وتجمل و آسائش کی نئی نئی ایجادوں کی بدولت یہاں کے تمدن کی سادہ تصویریں نہایت دلکش اور دیرپا رنگ بھرے۔ پادشاہ بابر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ ہند میں آیا ہے تو یہاں روزمرہ کی ضروریات کی بیسیوں چیزیں ناپید تھیں۔ تزکِ بابری کے الفاظ[1] ملاحظہ ہوں: "اسپ خوب نے، گوشت خوب نے، انگور و خربزہ و میوہائے خوب نے، یخ و آبِ سرد نے، حمام و مدرسہ نے، شمع و مشعل نے، شمعدان نے، بجائے شمع و مشعل... چرکینے می باشد کہ دیوٹ می گویند...... در باغ و عمارت ہا آب ہائے رواں نے، در عمارات صفا و ہوا و اندام و سیاق نے، رعیت و مردم عام، پاہائے برہنہ می گردند، لنگوتہ گفتہ یکچیزے می بندند"۔ آج[2] کل کلچر کی وحدت کا موضوع

---

[1] ترجمہ فارسی از ترکی

[2] اس بحث پر بعض اسلامی جرائد مثلاً معارف۔ صدق۔ جمعیت۔ مدینہ وغیرہ میں حال میں نہایت مدلل اور بلند پایہ آرٹیکل نکلے ہیں۔ جو پڑھنے کے قابل ہیں۔

بڑی بلند آہنگی سے پھونکا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو اُس وحدت کی طرف نہایت تحکّم کے ساتھ بلایا جا رہا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو اِس دعوت میں کئی مغالطے پوشیدہ ہیں۔ جن کو صاف کئے بغیر آگے بڑھ جانا ایک غلط اقدام ہوگا۔ مثلاً کیا ہندوستان کے طویل وعریض بّرِ عظیم میں واقعی ایک ہی کلچر ہے یا مختلف۔ اگر مختلف ہیں تو کون اجزا مشترک ہیں کون متباین۔ اجزائے متباینہ میں کون کون پہلو کسی جماعت کی انفرادیت کی بقا کے لئے ضروری ہیں۔ اور کن میں مفاہمت ممکن ہے۔ کیا یہ مفاہمت یک طرفہ ہونی چاہئے یا طرفین کی جانب سے۔ اور بالجبر ہو یا بالرّضا۔ کیا وحدت کے داعی خود اُردو زبان کو جو مشترک کلچر کی زندہ نشانی ہے مٹانے پر نہیں تُلے ہوئے ہیں۔ ایسا تو نہیں کہ اِس دعوت کی تہ میں ایک جماعت کی انفرادی حیثیت کو مٹانا مقصود ہو۔ کیا یہ غیر ممکن ہے کہ ایک جماعت اپنی انفرادی حیثیت سے دست بردار ہوئے بغیر دوسری جماعتوں کے ساتھ سیاسی اور ملکی مفاد کی خاطر جدّوجہد کر سکے۔ اور کیا اقوام کی تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں موجود نہیں یہ اور ایسے ہی متعدّد سوالات ہیں جن کا جواب دینا داعیانِ وحدت کا فرض ہے۔

الغرض کہنا یہ ہے کہ جس طرح انگریزوں نے ہمارے ملک کے تمدّن پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ مسلمانوں نے بھی زبردست اثر ڈالا ہے۔ فرق یہ ہے کہ انگریز یہاں اجنبی کی طرح آئے اِسی طرح رہے۔ اور اِسی طرح چلے گئے۔ اِس کے برخلاف مسلمان یہاں رہنے بسنے کی غرض سے آئے تھے۔ اُن کے اسلاف و اخلاف نے مرنے جینے کے لئے اِسی سرزمین کو پسند کیا۔ اور اُن کو یہاں قیام کا ایسا ہی حق ہے جیسا دوسروں کو۔ اگر ایک ہزار سال کے قیام کے باوصف وہ اجنبی اور بدیشی ہیں تو خطا معاف بات دور تک پہونچتی ہے۔ با ز آمدم۔ بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی ؎ شبِ کہ خوگشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد ❊ دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

اس تمام تفصیل سے یہ مقصود تھا کہ متداول تاریخوں میں اِس طرح کی متعدد کوتاہیاں پائی جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اب جو تاریخیں مرتب کی جائیں وہ اپنے موضوع کے ہر پہلو کو روشنی میں لائیں۔ جس سے حقائق تاریخی کے ساتھ اُن کا اصلی پس منظر بھی اپنے تمام آثار و نتائج کے ساتھ پیش نظر ہو جائے۔ یہ امر موجب مسرت ہے کہ ہمارے کرم فرما قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت ایم اے نے اسلامی ہند کی جو تاریخ مرتب کی ہے وہ بڑی حد تک اِس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ قاری صاحب موصوف ایم اے اور ہندی و سنسکرت کے عالم ہیں۔ اُنھوں نے اپنے موضوع پر انگریزی فارسی اور ہندی کے متعلقہ مواد سے پورا فائدہ اُٹھایا ہے۔ اور پراچین بھارت کے متعلق ایک عامی (LAY-MAN) کی طرح نہیں۔ بلکہ ماہر فن کی حیثیت سے بحث کی ہے۔ اِسی کے ساتھ عبارت کا زور چستی سلاست و دلکشی اِس درجہ ہے کہ کتاب زیر نظر میں تاریخ کی حقیقت نگاری کے دوش بدوش افسانے کی سی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب واقعات کی کھتونی نہیں۔ بلکہ منطقی نتائج کی مدلل بحث ہے۔ جس میں مختلف قوموں اور حکومتوں کے بننے بگڑنے۔ عروج و زوال محاسن و معائب کی مکمل داستان پیش کی گئی ہے۔ اور رفتارِ زمانہ پر ماحول کے طبعی محرکات کی کارفرمائی دکھائی گئی ہے۔

فاضل مؤلف نے اصل کتاب کو تین جلدوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی جلد محمود غزنوی کی آمد سے قبل ہندوستان کی حالت۔ محمود کے حملوں۔ فتوحات اور دیگر سوانح پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد میں محمد غوری۔ غلاموں۔ اور خلجیوں کا تذکرہ ہے۔ اور تیسری سلطنت مغلیہ کے آغاز پر منتہی ہوتی ہے۔

اِس وقت کتاب مذکور کی دوسری جلد ہمارے پیش نظر ہے جو "ہندی قرون وسطیٰ" کے نام سے موسوم ہے۔ کتاب کے آغاز میں ایک طویل محققانہ دیباچہ ہے جس کو کتاب کا عطر یا خلاصہ کہنا چاہئیے۔ اِس مقدمے میں مؤلف نے کامل دیانت و متانت کے

ساتھ نکتہ سنجانہ اور محققانہ انداز میں وہ مبادیات یا اصول متعارفہ پیش کئے ہیں جن کے بغیر اسلامی ہند کی تاریخ کا مطالعہ نہ صرف ناقص ۔ بلکہ گمراہ کن ہو سکتا ہے ۔ آنھوں نے دکھایا ہے کہ کیونکر مسلمان ہندوستان میں ہندوستانی بن کر رہے ۔ کیونکر انھوں نے یہاں کی تہذیب پر اثر ڈال کر اور خود اس کا اثر قبول کر کے ایک مشترک تمدن کی بنیاد ڈالی ۔ اور کس طرح تفرقوں کو مٹا کر ایک وحدت سیاسی قائم کی ۔ اور یہ بتایا ہے کہ اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ کرنے والے کے لئے عہد مذکور کے مقتضیات ۔ اور دوسری قوموں کے تقابلی حالات کا پیش نظر رکھنا کس قدر ضروری ہے ۔ اس کے بعد اسلامی جہاد کی حقیقت"[1] پر بحث کی ہے اور متکلم اسلام حضرت مولٰنا ابو الاعلیٰ مودودی کی مشہور تصنیف الجہاد فی الاسلام سے متعدد اقتباسات دئے ہیں ۔ وقت نہیں کہ مسئلہ جہاد کی جس کو ہمیشہ اغیار نے بدنما صورت میں پیش کیا ہے شرعی حیثیت یہاں تفصیلاً نہ سہی اجمالاً ہی واضح کی جا سکے ۔ البتہ ذیلی عنوانات سے مسئلے کی اہمیت کا کسی قدر اندازہ ممکن ہے ۔ عنوانات یہ ہیں ۔ حرمت نفس ۔ قصاص ۔ مقصد جنگ ۔ مجاہدین کا درجہ ۔ مدافعانہ جنگ ۔ مصلحانہ جنگ ۔ مقدمے کے آخر میں مؤلف نے اسلامی نظام حکومت کے بنیادی اصول ، کے عنوان سے یہ واضح کیا ہے کہ حکومت کا تصور اسلام میں کیا ہے ۔ اور دوسرے مذاہب و اقوام میں کیا ہے ۔ یہاں سے اصل کتاب کی ابتدا ہوتی ہے ۔ جس کے باب اول کا موضوع ہندوستان میں آمد کے وقت اسلامی سوسائٹی کا رنگ "ہے ۔ اس باب کا مقصد یہ ہے کہ بقول مؤلف "اس کی روشنی میں ہندوستان کے مسلم سلاطین کے اعمال و کردار کا جائزہ لیکر ہندوستان کی تاریخ میں اُن کا صحیح درجہ متعین کیا جا سکے "۔ نیز اسلامی سوسائٹی سے ہندوستانی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوئے اُن کی افادی

---

[1] تاریخ مذکور صفحہ ۱۴۱ وما بعد ۔

حیثیت متحقق ہو سکے۔ اِس میں مولف نے تحریک اسلامی کے متعدد فروعی نقش و نگار جن کا ارتقا صدیوں کا رہینِ منّت ہے پوری جامعیت مگر اختصار کے ساتھ اُجاگر کرکے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ تصوّف[1] کے عنوان کے تحت اُنھوں نے فقہ باطنی (تصوّف) اور فقہ ظاہری (شریعت) کی تقسیم کرنے کے بعد دونوں کے مجموعے کو تفسیر شریعت کے نام سے تعبیر کیا ہے اور دونوں میں کُل وجزو کا رشتہ قرار دیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ تقسیم "متراکب" ہے۔ اور دونوں میں کُل وجزو کی بجائے باہم تقسیم کا رشتہ ہے۔ لیکن لامشاحتہ فی الاصطلاح۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ دونوں ایک دوسری کی متمم ہیں۔ اور شریعت، طریقت (یا تصوّف) سے جدا "لفظِ بے معنیٰ" اور طریقت شریعت سے الگ "معنیٰ بے لفظ" سے زیادہ نہیں۔ اور اسلام بیک وقت دونوں حیثیتوں کا جامع ہے۔ اِسی[2] طرح اِحداث فی الدین۔ اور اِحداث للدین میں جو فرق دکھایا گیا ہے ہمارے خیال میں جمہور اہل سُنّت اُس کے موئد نہیں۔

بہرحال یہ جزوی اُمور ہیں۔ جن سے کتاب کی افادیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اِس باب کی وہ فصل جس میں ہندوستان میں آنے سے پہلے مسلمانوں کی علمی ترقیاں گنائی گئی ہیں۔ بجائے خود نہایت قیمتی اور قابل قدر ہے۔ تیسری فصل سیاسی کشمکش بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اور پوری توجہ سے پڑھنے کے لائق ہے۔

باب دوم یعنی "ہندوستان عہد معنی سے پہلے" نہایت اہم اور مفید معلومات پر مشتمل ہے جس میں ہندوستان کے مذہبوں۔ فرقوں۔ رسم۔ رواج۔ اعتقادات اور توہمات کی نہایت صاف تصویر کھینچی گئی ہے۔ درحقیقت مقدمے کے بعد کتاب کا پہلا اور دوسرا باب کتاب کی جان ہیں۔ اور فاضل مولّف مستحق مبارکباد ہیں کہ اُنھوں نے پوری جانفشانی اور جگر کاوی سے اِن حقائق کو ڈھونڈھ کر حوالوں سمیت بے کم وکاست۔ اور بے غلو و تعصّب

---

[1] ایضاً صفحہ ۴۱ وما بعد۔ [2] ایضاً ص ۵۲۔

قلم بند کردیا اور تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی سہولت بہم پہونچادی۔

غرض یہ دونوں باب درحقیقت پس منظر کا حکم رکھتے ہیں۔ اصل تصویر یعنی ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا آغاز باب سوم سے ہوتا ہے۔ اِس باب اور ابواب مابعد میں مولف نے شمالی ہند اور جنوبی ہند کی مختلف مشہور و غیر مشہور حکومتوں کا بیان کرنے کے بعد خاندان غور کی اصل۔ محمد غوری کے کارناموں۔ فتوحات اور وفات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اور پھر غلام خاندان اور دوسرے خاندانوں کے مفصل حالات قلم بند کئے ہیں۔ اور جیسا کہ اوپر کہا گیا واقعات کے ذکر میں اُن کے اسباب و عواقب۔ ما لۂ وما علیہ کا بیان کامل دِقتِ نظر کے ساتھ کیا ہے۔ ممکن ہے کہ قارئین میں سے بعض کو مولّف کی رایوں سے کہیں کہیں اختلاف ہو۔ لیکن اُن کی مورّخانہ بصیرت۔ اور علمی دیانت سے شاید کسی کو انکار نہ ہو۔

اِن اوراق کو پڑھنے کے بعد ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کا مرتبہ حیوانیت کی پستی سے اُٹھا کر انسانیت کی کس بلندی پر پہونچا دیا تھا کہ اب غلامی اُن کو سوسائٹی میں بڑے سے بڑے درجے تک پہونچنے میں بھی مانع نہ ہوسکتی تھی اِسلامی تاریخ پر جن کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ اِنھیں غلاموں میں سیکڑوں مقتدایان عظّام۔ صوفیائے کرام۔ شاہانِ باقتدار اور امیرانِ ذی وقار ہوگذرے ہیں۔ خود ہندوستان کا غلام خاندان ہمارے دعوے کا شاہد عدل ہے۔ اِن غلاموں نے اپنی محنت و لیاقت سے چھوٹے درجے سے ترقّی کر کے حکومت ہند کی باگ سنبھالی اور بڑے بڑے سادات اور شیوخ نے خوشی سے اُن کی اطاعت قبول کی۔ قطب الدین۔ شمس الدین۔ ناصر الدین اور غیاث الدین جیسے جوہر قابل تھے اُن کے کارناموں سے ظاہر ہے۔ قاری صاحب نے اسلامی ہند کے ابتدائی عہد میں صوفیہ کرام کی خدمات کا بھی ضمناً تذکرہ کیا ہے۔ دراصل یہ موضوع مستقل باب کا محتاج تھا۔ اِسمیں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کی اشاعت میں بادشاہوں کی قوّت سے

زیادہ درویشوں کی ہمت اور تاجروں کی استقامت کو دخل ہے جسکی تصدیق چین وجاوا وغیرہ کی اسلامی آبادیوں سے ہوتی ہے۔ ہندوستان کے بھی بعید ترین گوشوں میں آفتابِ اسلام کی شعاعیں انھیں بوریا نشین خرقہ پوشوں کے ذریعے سے پہونچیں۔ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی بدایونی[1] اور دوسرے صوفیۂ کبار اور اُنکے خلفائے نامدار کی خدمات کون نہیں جانتا۔

مُسلم ہند کی تاریخ کے ضمن میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مسلم حکمرانوں نے اگر ہند پر قبضہ کیا تو عموماً اپنے امکان بھر اُس کا حق بھی ادا کیا۔ انھوں نے ہند کے سیاسی انتشار کو دور کرکے ملکی وحدت قائم کی۔ تمدن کے سادہ خاکے میں نئے نئے رنگ بھر کر دیس کا تہذیبی معیار بلند کیا۔ ایک طرف ملک کو ڈاکوؤں اور چوروں سے پاک کیا اور دوسری طرف بیرونی حملہ آوروں (مثلاً منگولوں) کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو پتھر کی چٹان بن کر روکا۔ اور مظلوموں کی دادرسی اور ظالموں کی سرکوبی میں کبھی ملّت و مذہب کا امتیاز روا نہ رکھا۔ اُن کی ذمہ دارانہ خوش انتظامی اور فرض شناسی کی بیّن دلیل یہ ہے کہ "ایک ہزار سال کی طویل مدّت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صرف دو بلوے ہوئے۔ اور وہ بھی مغلیہ حکومت کے آخری دور میں۔"

بیشک مسلمان بادشاہوں میں بعض ناانصاف اور خودغرض افراد بھی گذرے ہیں لیکن "سیاہ بھیڑیں" کس گلے میں نہیں ہوتیں۔ اُن کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کی تمام خوبیوں سے اِغماض کرنا یقیناً ناانصافی ہوگی۔

المختصر قاری صاحب موصوف نے زیرِ نظر تاریخ لکھ کر ایک مفید خدمت انجام دی ہے اور ہمیں توقع ہے کہ علم دوست بے تعصب حلقوں میں اُنکی یہ علمی سعی مشکور ہوگی۔

ضیاء احمد ایم اے بدایونی
مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۵ اگست ۱۹۴۹ء

---

[1] ایضاً۔ صفحہ ا۔

اصل متن

تاریخ

ہندی قرونِ وسطیٰ

جلد دوم

از عہد

سلطان محمد غوری تا سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی

یعنی

سنہ ۱۱۸۶ء تا سنہ ۱۳۲۰ء

مرتبہ

قاری محمد بشیر الدین پنڈت (بدایونی)

ایم۔ اے (علیگ)

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

اگست سنہ ۱۹۴۹ء

قیمت ۶ روپے ۸ علاوہ محصول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمحۂ فکریہ

انگریز کے زر گرانہ افسانوں پر — یکسر خطِ تنسیخ یہ دیباچہ ہے
لٰہذا ذرا غور سے پڑھیے اس کو — روشن گرِ تاریخ یہ دیباچہ ہے

۱۔ ہندوستان میں اسلامی دورِ حکومت ۷۱۲ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک سمجھا جاتا ہے یعنی مسلمان ایک ہزار برس سے زیادہ ہندوستان پر قابض رہے۔ اس طویل عرصہ میں نسلِ انسانی کی بیسیوں پشتیں گزر چکی ہیں جنھوں نے مسلمان حکمرانوں کے زیرِ سایہ اپنی عمریں گزاریں اور زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کے تدریجی مدارج طے کئے جن کا انکار کرنا کفرانِ نعمت ہے۔

۲۔ انگریزوں کے برخلاف مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کر کے اس کو اپنا وطن بنایا اور اپنی بہتر و برتر تہذیب و تمدن سے ہندو سبھیتا اور ہندو سنسکرتی کو کچھ اس طرح متاثر کیا کہ معاندین کی اُن تمام کوششوں کے باوجود جو انگریزی عہدِ حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے کی گئیں یہ مشترکہ تہذیب مٹائی نہیں جا سکی۔ آپس میں ارتباط سے محبت و اخوت کی جو کیفیت رہی اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ہزار سال کی طویل مدت میں "ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صرف دو بلوے ہوئے"[۱]

---

[۱] یہ بلوے مغلیہ حکومت کے آخری دور میں ہوئے جبکہ فرخ سیر برسرِ اقتدار تھا۔

۳۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان انگریزی تہذیب کے فروغ پانے سے پہلے یہاں کے لئے غیر نہ تھے اور نہ اُن کو غیر سمجھا جاتا تھا۔ ان کی تہذیب ہندوستانی تہذیب تھی ان کا تمدن ہندوستانی تمدن تھا اور ان کی حکومت ہندوستانی حکومت تھی جس کو اگر کسی غیر کے ہاتھوں صدمہ پہونچتا تو اس سے جتنی تکلیف ایک مسلمان کو ہوتی تھی اتنی ہی ایک ہندو کو بھی چنانچہ جس وقت نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا اس وقت پیشوا نے سندھیا کو جو خط لکھا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ لکھتا ہے "اس ملک میں دو دشمن نمودار ہوئے ہیں ایک پرتگالی اور دوسرا نادر۔ اگر ہم نے مِل کر مقابلہ نہ کیا تو خوف ہے کہ مغلوں کی حکومت (جو اپنی حکومت ہے) کہیں برباد نہ ہو جائے"[1] اور پھر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ غدر تک ہندوؤں نے مسلمانوں کی طرح یہ ہی مغلیہ حکومت کو اپنی حکومت سمجھا اور ۱۸۵۷ء میں آخری مرتبہ بدیسی انگریز کو ہندوستان سے نکالنے اور مغلیہ حکومت کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لئے جنگِ آزادی لڑی اور اس میں اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے سے گریز نہ کیا اور پھر غدر فرو ہونے کے بعد جب ان سے انتقام لیا گیا تو دونوں نے پھانسی کے پھندے کو خوشی خوشی قبول کیا؟

۴۔ غدر کے بعد حالات یکسر بدل گئے۔ انگریز نے اپنی حکومت کے استحکام و بقا کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ان گہرے دوستانہ تعلقات کو خطرناک سمجھتے ہوئے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کیا۔ گو اس کی ابتدا فورٹ ولیم کالج کے افتتاح کے وقت پڑ چکی تھی جبکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان لسانی افتراق پیدا کیا گیا لیکن اس پر شدت کے ساتھ عمل غدر کے بعد ہی ہوا۔ اس کام کے لئے تاریخ کے مضمون کو منتخب کیا گیا یہی ایک مضمون ایسا تھا جس کے غلط سلط اور بے بنیاد واقعات کو تاریخی حقیقت بنا کر پیش کرتے

---

[1] روزنامہ انجام دہلی صفحہ ۲ مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۴۸ء

سے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے طالب علموں کے دل و دماغ کو زہر آلود کیا جا سکتا تھا چنانچہ آج یہ کتنی تکلیف دہ اور افسوسناک حقیقت ہے کہ ان اداروں کے فارغ التحصیل طلباء میں سے اکثر و بیشتر اگر وہ ہندو ہیں تو اپنے کو فرضی رانا پرتاب سنگھ اور سیواجی سمجھتے ہیں اور مسلمان اپنے کو محمود غزنوی اور اورنگ زیب، حالانکہ نہ ان کو رانا پرتاب سنگھ اور سیواجی جیسی بلند حوصلہ ہستیوں سے کوئی تعلق ہے اور نہ ان کو محمود غزنوی اور اورنگ زیب جیسی مایۂ ناز شخصیتوں سے۔ دونوں اپنی جگہ پر فرضی ہیں۔ اصلی کوئی بھی نہیں انگریز کا اس میں دوہرا فائدہ تھا۔ سلاطین ماضیہ کی صورت مسخ ہو جانے سے اگر مسلمان اپنے ماضی سے بیزار ہو جائیں یا ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت پیدا ہو جائے دونوں صورتوں میں انگریز کا بھلا تھا کیونکہ اس طرح انگریزی عہد حکومت کے برکات کو سراہنے یا بہ الفاظ دیگر غلامی کا طوق زیب گلو کرنے میں دونوں پس و پیش نہ کرتے[۵]۔ انگریز کو اپنے مقصد میں پوری پوری کامیابی ہوئی اس کا ادنیٰ ثبوت بہار و پنجاب کا وہ خونی ڈرامہ ہے جو ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء سے پہلے اور بعد کو کھیلا گیا اور جس میں اخلاق و شرافت کے تمام بندھن توڑ ڈالے گئے۔ انسانیت اس پر جتنا بھی ماتم کرے کم ہے۔

۵: اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ ایک کچی دھات کے مانند ہے اس کو مختلف سانچوں سے جوڑ کر جیسی شکل آپ چاہیں بنا سکتے ہیں انگریز ہندوستان کو چونکہ اپنے سامراجی بندھن میں جکڑنا چاہتے تھے اس لئے ان کے ایماء سے جو تاریخیں انگریزوں اور ان کے اتباع میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے لکھیں ان سب نے اس مقصد کو بدرجۂ اتم پورا کیا۔ سر ایچ، ایم، ایلیٹ کی ہسٹری

---

[۵]: — ان سرفروشوں اور جانبازوں کی جماعت کو اس سے مستثنیٰ سمجھنا چاہئے جنھوں نے غدر کے بعد بھی آزادی ہند کی جدوجہد کو جاری رکھا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کالا پانی، اسیر مالٹا، تاریخ کانگریس، ہمارے ہندوستانی مسلمان)

لایق صد ستایش ہے کہ اس نے انگریز کے اس مقصد کو چھپایا نہیں بلکہ اپنی کتاب کے شروع میں اس کو صاف طور سے ظاہر کردیا کہ "اس کے پیش نظر یہ ہے کہ اگلے پیشرو اور حاکموں کے غیر منصفانہ عہد کی تاریکی کو دکھا کر اپنی (انگریز) قوم کے عہد حکومت کی روشنی دکھائے تاکہ ہندوستان کے رہنے والے اس کو سایۂ رحمت سمجھ کر ہمیشہ اطاعت مندانہ اخلاص کا خراج پیش کیا کریں"[سلہ] سر ہنری ایلیٹ شروع انگریزی عہد کا ایک نیم سرکاری نامور مورخ ہے اس کا یہ احسان ناقابل فراموش ہے کہ اس نے اسلامی عہد حکومت کی کمیاب و نادر تاریخ و جغرافیہ کی عربی، فارسی کتابوں کے ترجمے اور اقتباسات اپنی کتاب میں محفوظ کر دیئے جس سے ہر محقق نے فائدہ اٹھایا ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس نے جن جن کتابوں کے ترجمے اور اقتباسات اپنی کتاب میں شامل کئے ان میں اگرچہ جابجا علمی، تمدنی، اور غیر سیاسی تفصیلات کچھ نہ کچھ ضرور موجود ہیں لیکن ان کو اس نے جان بوجھ کر حذف کر دیا جس کی وجہ سے اس کو اپنا رہنما بنانے والا ایک محقق اسلامی عہد حکومت کو صرف خون آلود اور خون آشام پاتا ہے۔

۶۔ قصۂ مختصر یہ کہ تاریخ ہند کی جس طرح صورت مسخ کی گئی ہے اور ابتدائی اسکولوں سے لیکر کالجوں تک میں تعلیم پائے ہوئے طلبار کو گمراہ ہونے کا جو موقع ملا ہے اس کی نظیر غالباً دنیا کا کوئی ملک پیش نہیں کر سکتا۔ بات یہیں تک محدود ہوتی تو خیر صبر کیا جاتا لیکن مشکل یہ آپڑی کہ مغربی طرز جمہوریت اور طرز فکر نے ہندوستان میں قومیت و وطنیت کا بیج بویا جس کا پودا قومی عصبیت کی صورت میں نمودار ہوا اس لئے کچھ تو انگریز کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کی وجہ سے اور کچھ قومی عصبیت کی بنا پر ہندوؤں کے اندر ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی ہے جو مسلمانوں پر اپنے عددی تفوق کے ساتھ ساتھ ان پر سیاسی اثر قائم رکھنے کے لئے ہر اس اثر کو مٹا دینا ضروری سمجھتی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک ہزار سال کے میل ملاپ

سلہ:۔ دیباچہ صفحہ ۲۲، معارف نمبر ۴ جلد ۵۶۔

سے ہندوستان میں پیدا ہوا ہے۔ یہ صورت حال تا دیر قائم نہیں رہنا چاہیئے۔ زمانہ بدل چکا ہے ہم آزاد ہیں اور غلامی کے چکر سے نجات پا چکے ہیں اس لئے آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہوئے یہ ہمارے لئے نہایت شرمناک بات ہے کہ ہم اپنے پیشرو انگریز کے عطا کردہ طرز فکر اور نظریات سے تاریخ ہند کو لکھنے اور جانچنے کا شغل جاری رکھیں۔

۷۔ طریق کار اب تک یہ رہا ہے کہ اسلام کو مورد الزام بنانے کے لئے بعض نام کے مسلمان سلاطین کی بداعمالیوں کا تذکرہ نہایت بلند آہنگی کے ساتھ بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے حالانکہ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں بتایا جا سکتا جس سے منسوب ہونے والا کوئی شخص اس مذہب کی خلاف ورزی پر قادر نہ ہو سکے احکام مذہبی کی پابندی میں سب سے زیادہ سست پادشاہوں اور امیروں کا گروہ ہوا کرتا ہے دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے ان فرمانرواؤں کے طبقہ کی بھی اصلاح کر کے مطلق العنانی کا خاتمہ کیا۔ اور شاہ و گدا دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ کسی قوم یا ملک کے مزاج اور مجموعی اخلاق کا اندازہ اس قوم یا ملک کے صرف قلیل ترین حصہ کے مطالعہ سے نہیں بلکہ کثیر حصہ کے مطالعہ سے کیا جاتا ہے تاریخ ہند میں دو چار نفس پرست پادشاہوں کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت ان بے شمار نیک نفس سلاطین کے کارناموں کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے جنھوں نے ہندوستان کی اخلاقی و سیاسی حالت کو بلند کرنے کی انتہائی کوششیں کی ہیں۔

۸۔ اسی سلسلہ میں اس فریب سے بھی آگاہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اکثر چالاک مورخین کسی مسلمان بادشاہ کی تعریف و توصیف کرتے وقت اپنی بے تعصبی کا یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن پھر اس کے عیوب گنانے وقت آخر میں یہ فقرہ تحریر کر دیتے ہیں کہ یہ تمام غلطیاں اس بادشاہ سے صرف اس لئے سرزد ہوئیں کہ وہ اسلام کا زیادہ پابند تھا گویا ان کے نزدیک اسلام کی پابندی نام ہے ظلم و عصیاں و بے راہ روی کا۔ کسی پادشاہ

کی بے راہ روی کو بھلا اسلام کے اٹل قوانین سے کیا واسطہ اس کے اعمال و افعال کی ذمہ داری خود اس کی ذات سے متعلق ہے اس کے غیر شرعی افعال کو اسلام سے وابستہ کرنا کھلی ہوئی ہٹ دھرمی ہے۔ آج بھی مہذّب دنیا کے عیسائی سلاطین انجیل کی تعلیمات کے خلاف عمل در آمد کر رہی ہیں اور ایک گال پہ طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے نہیں کرتے بلکہ رات دن نوعِ انسانی کے قتل و غارت کے لئے مختلف قسم کے آلاتِ حرب و اسلحہ ایجاد کرنے میں مصروف ہیں لیکن عیسائی پادریوں نے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی عیسائی مذہب کا ناقص و نادرست ہونا تسلیم نہیں کیا اور نہ کرنا چاہیے کسی کی نیت پر حملہ کئے بغیر اتنا میں ضرور عرض کروں گا کہ اس قبیل کے مؤرخین نے یا تو اسلام کی حقیقت کو سمجھا نہیں یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی اگر وہ اسلامی تعلیمات کا بنظر غائر مطالعہ کر لیتے اور اسلامی طرزِ حکومت کو سمجھ لیتے تو پھر شاید اس قسم کی غلطیاں نہ کرتے۔

۹۔ قابلِ غور ایک چیز اور بھی ہے جس کی طرف اب تک بہت کم توجّہ کی گئی ہے اور وہ یہ کہ پیشِ نظر اسلامی عہدِ حکومت کا کم از کم اوّلین دور بڑی حد تک مجاہدانہ و سپاہیانہ جدّوجہد کا زمانہ ہے۔ اس عہد "سپہ گری" کے معاصر اہلِ قلم نے جو فارسی تاریخیں لکھیں وہ بالعموم ایرانی مذاق کے مطابق لکھیں اس لئے اول تو ان کی تاریخیں زمانہ کے ذوق کے مطابق جنگ و جدل اور معرکہ آرائی کا مرقع ہیں دوسرے چونکہ ان کا تعلق کسی نہ کسی حد تک شاہی دربار سے ہوتا تھا اس لئے انھوں نے اپنے مربّیوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی جنگوں کا مقصد مذہب و تہذیب کی اشاعت بتایا اور یہ صحیح نہیں۔ آج یہ تماشا ہم اپنے زمانہ میں بھی دیکھ رہے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک پسماندہ اقوام کو محکوم بناتے وقت اپنا مقصد تہذیب و تمدّن کی اشاعت بتاتے ہیں حالانکہ ان کا مقصد اپنی حکومت و تجارت کی توسیع و ترقی ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح زمانہ وسطیٰ کی لڑائیوں میں بھی اشاعتِ مذہب و تہذیب کے جذبہ کے مقابلہ میں شان و شوکت اور طاقت کے اظہار کا جذبہ بالخصوص زیادہ ہوتا تھا اور یہ چیز اس زمانہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔

۱۰۔ اس خصوصیت کے علاوہ اس عہد کے طرزِ تحریر پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے مبالغہ اور لفاظی فارسی نثر نویسوں بلکہ عام مشرقیوں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر اتفاق سے کسی بادشاہ نے ایک یا دو مندر مسمار کر کے ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کردیں تو یہ مؤرخین تحقیق کئے بغیر اس واقعہ کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ گویا ہزار ہا بُت خانے توڑے گئے اور ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کی گئیں حالانکہ یہ سراسر مبالغہ اور لفاظی ہے۔ مثال کے طور پر قطب الدین ایبک کے نہایت قلیل عہدِ حکومت پر نظر ڈالئے اس کے متعلق ایک فارسی مورّخ لکھتا ہے کہ اس نے دہلی میں ایک ہزار بُت خانے گرا کر ایک ہزار دار العلوم قائم کئے۔ اس بیان کو اگر سنجیدگی کے ساتھ پرکھا جائے تو قطعی ناقابل تسلیم معلوم ہوتا ہے کہ جس بادشاہ نے ایک شہر میں چار سال سے زیادہ حکومت نہیں کی اور یہ چار سال بھی بیشتر لڑائیوں اور دوسری اُلجھنوں کی نذر ہوئے وہ اس قلیل مدّت میں کس طرح ایک ہزار مدرسے قائم کر سکا۔ چنانچہ ڈاکٹر ٹائی ٹس اور ڈاکٹر حبیب اللہ وغیرہ[1] نے اس تعداد کو مشکوک قرار دیا ہے۔ بہر حال ان مؤرخوں کی تحریروں کو زمانہ حال کے تنقیدی اصولوں پر جانچے اور پرکھے بغیر لفظاً و معناً صحیح سمجھ لینا سخت غلطی ہے۔

۱۱۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مور دِ الزام مسلمان بادشاہ کے عہدِ حکومت کا ذکر کرتے وقت بُعدِ زمانی اور اس کے متعلقات کو بالکل فراموش کر دیا جاتا ہے۔ لکھنے والے اس کے زمانہ کے ہندوستان کو آج کا ہندوستان، اس زمانہ کی دنیا کو آج کی دُنیا اور اس زمانہ کے تمدّن و معاشرت کو آج کا تمدّن و معاشرت فرض کر لیتے ہیں اور اسی مفروضہ کی بناء پر لوگوں کو یقین دلاتے ہیں اور اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے پیشتر اس ملک کے باشندوں کی معاشرتی و تمدّنی حالت کیا تھی اور پھر مسلمانوں نے اس ملک

---

[1] فاؤنڈیشن آف دی مسلم رول اِن انڈیا از ڈاکٹر حبیب اللہ صفحہ ۲۹۵۔

میں داخل ہوکر اہل ہند کو کس قدر فوائد پہونچائے اور ان میں کیسی روشن خیالی پیدا کی۔ آج کل ہماری آنکھیں یورپ کی تہذیب و ترقی کے آگے خیرہ ہورہی ہیں اس بات کے تحقیق کرنے کی فرصت کہاں کہ یورپ کی یہ تمام ترقیات اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے اخلاق اور ترقی کا نتیجہ ہیں لیکن کم از کم اتنا تو ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ جس زمانہ میں یہاں مسلمان حکمراں صاحب تخت و تاج تھے اس زمانہ میں دنیا کے دیگر گوشوں میں غیر مسلم فرمانرواؤں کا طرزِ عمل اپنی رعایا کے ساتھ کیسا تھا۔ تفصیل کی گنجائش نہیں صرف چند تاریخی واقعات مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:—

(۱) روم کے پوپ انوسینٹ نے حکم دیا تھا کہ غیر کیتھولک دنیا میں زندہ رہنے کے حقدار نہیں۔

(۲) علم و عقل کی باتیں جو اندلس کی اسلامی درسگاہوں کے ذریعہ یورپ میں شائع ہورہی تھیں اُن کو روکنے اور تاریکی و جہالت کو باقی رکھنے کے لئے جاسوسی کا ایک محکمہ قائم کیا تھا کہ کوئی کتاب پوپ کی اجازت کے بغیر شائع نہ ہوسکے چنانچہ اس محکمہ کے ذریعہ ۱۴۸۱ء تا ۱۴۹۱ء یعنی دس سال کے اندر ایک لاکھ چودہ ہزار ۲ سو ۹۰ آدمی محض اس لئے مجرم قرار دیئے گئے کہ وہ علم و حکمت کی باتوں کو زبان تک کیوں لائے۔ ان میں سے ایک ہزار تینیس کو زندہ آگ میں ڈال کر جلا دیا گیا اور سولہ ہزار آٹھ سو آٹھ کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ باقی کو دوسری سخت سزائیں دی گئیں۔

(۳) اسی زمانہ کے لگ بھگ انگلستان کے اندر یہ عجیب و غریب قانون جاری تھا کہ جس عورت پر ساحرہ ہونے کا الزام لگایا جائے اُسے امتحان کی غرض سے کسی دریا یا تالاب یا سمندر میں ڈالا جائے اگر وہ عورت پانی میں ڈوب کر مرجائے تو ساحرہ نہیں تھی اور اگر ڈوبنے سے بچ گئی تو اس کا ساحرہ ہونا ثابت ہوگیا لہٰذا وہ قتل کردی جاتی تھی۔ اس طرح ہزاروں بے گناہ عورتیں لقمۂ اجل بنیں کبھی ان

بیگناہ عورتوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونکی جاتی تھیں اور لوہا گرم کرکے داغا جاتا تھا اور اس طرح ان سے پہلے اقرار جرم کرایا جاتا تھا اور جب وہ اذیتوں کی وجہ سے جرم کا اقرار کرلیتی تھیں تو فوراً اُن کے قتل کا حکم دیدیا جاتا تھا کیا اس عجیب و غریب طرز حکومت کے مقابل اس زمانہ میں ہندوستان میں عدل و انصاف کے دریا نہیں بہہ رہے تھے ؟ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان میں سلاطین لودھی اہل ہند کو بڑے بڑے عہدے تفویض کررہے تھے۔ اور کبیرداس اپنے خیالات کی آزادانہ نشر و اشاعت اور کبیر پنتھی فرقہ کی بنیاد رکھنے میں مصروف تھے جبکہ یورپ کے اندر اختلاف عقائد کی بنا پر ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے افراد کو آگ میں زندہ جلانا ثواب کا کام سمجھتا تھا۔

(۴) سولھویں صدی کے نصف اوّل میں جبکہ شیرشاہ سوری ایک ادنیٰ طبقہ کے ہندو کی شکایت پر اپنے عزیز بیٹے اور ولیعہد سلطنت کو سزا کا حکم دیکر عدل و انصاف کی پوری پوری داد دیچکا تھا تہذیب کے علمبردار اور عدل و انصاف کے دعویدار یورپ کے بعض سپہ سالاروں نے یہ عزم کرلیا تھا کہ میکسیکو کی مفتوح باشندوں کی نسل ختم کرکے وہاں اپنی ایک نو آبادی قائم کریں اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہزارہا بندگانِ خدا کو آگ میں جلانے کے علاوہ پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ لینے والوں کو شکاری کتوں سے پھڑوایا گیا۔

(۵) لاس کیمس جو ایک ہسپانوی تعلیم یافتہ شخص تھا ان مظالم کے چشم دید حالات بیان کرتا ہے جن سے امریکہ والوں کو صفحۂ ہستی سے نابود کیا گیا۔ ان حالات کو پڑھکر آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں وہ لکھتا ہے۔ اہل یورپ کی آمد سے قبل ہسپانیولا میں

تیس لاکھ آدمی آباد تھے اور اب تین سو سے بھی کم رہ گئے ہیں۔ کیوبا کے جزیرہ میں ایک بھی دیسی نہیں رہا۔ سینٹ جان اور جمیکا کے جزیروں کا بھی یہی حال ہے حالانکہ یہ جزیرے پہلے زرخیز اور آباد تھے۔ سینٹ جان کے قریب تیس جزیرے غیر آباد ہو گئے ہیں برّاعظم میں بھی یہی نوبت پہونچی ہے۔ دس سلطنتیں جو بلحاظ رقبہ اسپین سے بڑی تھیں اُن میں ایک آدمی بھی اہل اسپین کے ظلم سے زندہ نہیں بچا۔ بچوں۔ عورتوں مردوں سب کو انھوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا دیسی سرداروں کو دھیمی دھیمی آگ جلا کر فنا کیا گیا۔ بعض کو کتّوں سے پھڑوا دیا گیا۔ ایک ایک شخص بعض اوقات اپنے کتّوں سے بیس بیس دیسیوں کا آنِ واحد میں شکار کر لیتا ہے.... (غرضکہ) نئی دنیا کے لئے اہل یورپ قہر خدا یا آتشِ دوزخ تھے۔ ان نام نہاد مہذب لوگوں کے مقابلہ میں مردم خور وحشی بھی ہیچ ہیں۔ اٹیلا اور چنگیز خاں ان انسانی شکل کے بھیڑیوں کے پاسنگ بھی نہ تھے۔ انھوں نے صرف اپنے دشمنوں کو قتل کیا مگر ان لوگوں نے مطیع و فرماں بردار رعایا کو بلا امتیاز مرد و عورت بے دریغ تہ تیغ کیا۔[۱]

(۶) اسی طرح جنوبی امریکہ کے ملک پیرو میں اٹلی کے ایک سپہ سالار نے وہاں کے قدیم باشندوں کو فنا کیا۔ اہل بلجیم نے افریقہ کے ملک کانگو میں وہاں کے باشندوں کو صرف چند تولہ ربڑ کی چوری کے الزام میں جس طرح ستایا اور قتل و غارتگری کے ہنگامے برپا کئے اس کی مثالیں چنگیز اور ہلاکو کے کارناموں میں بھی تلاش نہیں کی جا سکتیں۔

۱؎ تاریخ امریکہ صفحہ ۱۰۵۔۱۰۰ بحوالہ علماء ہند کا شاندار ماضی صفحہ ۸۳۔۸۴

(۷) آسٹریلیا اور تسمانیہ کے باشندوں کو جس طرح صفحۂ ہستی سے معدوم ہونا پڑا وہ بھی کچھ کم حسرت انگیز نہیں ہے۔

(۸) خود ہندوستان میں آریوں نے غیر آریوں کے ساتھ جیسا برتاؤ کیا وہ سب پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے اچھوت و سچھوت ہندوؤں کے درمیان اس روشنی کے زمانہ میں بھی جھگڑے جاری ہیں۔ اعلیٰ ذات کے ہندو اپنے سے کمتر ہندوؤں کو سوسائٹی میں برابر کا درجہ اب بھی نہیں دیسکتے "ہمالیہ پہاڑ کے علاقہ میں اچھوت و سچھوت ہندوؤں کے درمیان" ڈولہ اور پالکی "کا تنازعہ اب بھی جاری ہے۔ چنانچہ ہریجنوں کی ایک برات کو جس میں دلہن کو پالکی پر بٹھا کر کوٹ[1] دوار سے جمار گڈھی واقع ضلع بجنور کی طرف لیجایا جا رہا تھا راستہ میں اعلیٰ ذات کے ۶۰ ہندوؤں نے گھیر کر مارا کوٹا اور رات بھر جنگل میں محصور رکھا دوسرے دن جب اس حلقہ کا پٹواری آیا تو برات دولہا کے گھر پہونچ سکی۔ اسی طرح ہریجنوں کی ایک دوسری برات پر ڈولہ پالکی کی وجہ سے تشدد کیا گیا یہ برات دہرہ دون سے بھوگ پور کو جا رہی تھی ڈولہ پالکی کمیٹی کے سکریٹری سری بلدیو سنگھ کے درمیان میں پڑنے سے شادی کے مراسم گاؤں سے دور ایک میل کے فاصلہ پر ٹھکر پورے کئے گئے۔ اعلیٰ ذات کے ہندو وہاں بھی جمع ہو گئے لیکن دور کھڑے رہے اور پھر کوئی فساد برپا نہیں کیا"[2]

۱۲۔ آٹھویں صدی عیسوی میں جبکہ مسلمانوں نے سندھ کے ساحل پر

---

[1] کوٹ دوار ہمالیہ پہاڑ کی تلہٹی میں واقع ہے نجیب آباد و کوٹ دوار برانچ لائن کا آخری اسٹیشن ہے یہاں سے لینڈاؤن کے لئے موٹر سروس جاری ہے (مولف) لینسڈاؤن

[2] ماخوذ از "ہندوستان ٹائمز" مورخہ یکم مئی ۱۹۴۳ء صفحہ ۲ کالم ۴۔

قدم رکھا مملکت سندھ میں اچھوتوں کے لئے نہایت سخت قوانین جاری تھے۔ بقول ڈاکٹر تاراچند سندھ کا برہمن راجہ چچ بڑا متعصب تھا۔ اس نے اپنی رعایا میں بعض فرقوں کے لئے بہت سخت اور جابرانہ قوانین جاری کئے ان کو ہتھیار باندھکر چلنے کی، ریشمین پوشاک پہننے کی، زین لگاکر گھوڑے پر بیٹھنے کی قطعاً ممانعت تھی ان کو حکم تھا کہ وہ کتوں کو ساتھ لیکر ننگے سر اور ننگے پاؤں چلیں[1]"

۱۳۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے اختلاف عقائد کی بنا پر بھی ہندوستان کے اندر کافی کُشت و خون ہوا ہے چنانچہ تاریخی صفحات شاہد ہیں کہ (۱) مہرگل نے جو شو کا پرستار تھا بودھ راہبوں کو تہہ تیغ کرادیا۔ اور ان کی خانقاہوں اور معبدوں کو زمین دوز کرادیا" (ب) "برہمنوں نے ۶۴۳ء میں راجہ ہیرش کی جان لینے کی کوشش کی کیونکہ اس نے قنوج میں ایک تیوہار کے موقع پر بودھوں کے ساتھ غیر معمولی مراعات روا رکھی تھیں (ج) مغربی بنگال کے راجہ ساسانکا نے بدھ گیا کے متبرک برگد کے درخت (Bo-tree) کو جڑ سے اکھڑواکر پھکوادیا۔ اور بودھوں کی خانقاہوں کو اُجاڑ دیا۔ (د) سین خاندان کے راجہ برہمنوں کے بڑے طرفدار تھے انھوں نے اپنے عہد حکومت میں بودھوں پر بڑے سخت مظالم ڈہائے[2]"

(ه) "ہرمن گویز (HERMANGOES) ایک فرنچ مورخ اپنی کتاب ایپکس آف انڈین کلچر مطبوعہ ۱۹۲۹ء کے صفحہ ۱۸۱ پر تحریر کرتا ہے کہ سونگا یا سنگا خاندان کے بانی راجہ پشتیہ متر کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ پہلا راجہ ہے جس نے ہندو دھرم کا نام لیکر ہندو دھرم کی خاطر بودھوں پر

---

[1] ماخوذ از اہل ہند کی مختصر تاریخ، صفحہ ۱۲۸ مصنفہ ڈاکٹر تاراچند

[2] " " " اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز، صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۱ مصنفہ مسٹر ظہیر الدین فاروقی۔

قتل و غارتگری کے ہنگامے برپا کئے (و) کشمیر کے ایک ہندو راجہ کی رانی کا ایک بودھ نے اغوا کیا جس پر راجہ کو اتنا غصّہ آیا کہ اس نے بودھوں کے صدہا مندروں کو توڑ ڈالا اور ان کی متعلقہ جائداد برہمنوں کو بخشدی[۱]" (ز) "شہر سرادستی جو اب "سہیت مہیت" کہلاتا ہے اور جس کے کھنڈرات اب بھی ضلع بہرائچ میں پائے جاتے ہیں مہاتما بودھ کے زمانہ میں راجہ "پرسنجیت" کا دارالحکومتہ تھا۔ اس راجہ نے بودھ دھرم قبول کرلیا تھا اور مہاتما بودھ کا بڑا ہمدرد و سرپرست تھا۔ لیکن اس کا لڑکا "ودردڈھک" ساکیہ[۲] قبیلہ کا دشمن تھا اس نے گدّی نشین ہوکر ساکیہ قبیلہ کی ۵۰۰ عورتوں کو جو اس کے حرم کے لئے منتخب کی گئی تھیں قتل کرا دیا۔ اس پر مہاتما بودھ نے پیشینگوئی کی تھی کہ راجہ سات دن کے اندر آگ سے جل کر مرجائے گا چنانچہ یہ پیشینگوئی پوری ہوئی[۳]۔ (ح) ۷۴۱ء کے قریب ختن میں اور ۸۴۰ء میں تبت میں بودھوں پر مظالم کئے گئے اسی طرح جنوبی دکن اور گجرات میں جینیوں پر بڑے بڑے ظلم[۴] ڈھائے گئے۔"

۱۴۔ غرضکہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں بتائی جاسکتی جس نے فتحمند ہوکر مفتوحوں کے ساتھ اس مسالمت رواداری، نرمی، رعایت و مساوات اور عدل و انصاف کا سلوک کیا ہو جیساکہ مسلمانوں نے عام طور پر اپنے مفتوحین کے ساتھ کیا۔ تاریخ ہند میں اسلامی عہد حکومت کے حالات پڑھتے وقت مذکورۂ بالا

ع۱ ماخوذ از "اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز" صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۱ مصنفہ مسٹر ظہیر الدین فاروقی "اور گارڈن آف انڈیا" صفحہ ۷ مصنفہ ایچ سی اردن۔

ع۲ مہاتما بودھ کے والد سدھودن ساکیہ قبیلہ کے سردار تھے۔ (مولف)

ع۳ ماخوذ از "اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز" صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۱ مصنّفہ مسٹر ظہیر الدین فاروقی

ع۴ " " " " " " " " " "

تمام صحیح لیکن تلخ حقیقتوں کو مدّنظر رکھنا چاہیئے۔

اِسلامی جہاد کی حقیقت

ساتھ ہی ساتھ اسلام کے قوانین صلح و جنگ اور طرز حکومت پر بھی نظر رکھنا چاہیئے تاکہ مسلمانوں کی حکومت و پادشاہت کا صحیح درجہ دنیا کی تمام دیگر غیر مسلم حکومتوں کے مقابل متعین ہو سکے۔

اس مختصر باب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ جنگ کے متعلق دنیا کے تمام چھوٹے بڑے مذاہب کی تعلیمات کا احصار کیا جائے۔ تقابل ادیان کی بحثیں صرف ان مذاہب تک محدود رہتی ہیں جو اپنے پیروؤں کی کثرت اپنے اثرات کی وسعت اور اپنی گذشتہ و موجودہ عظمت کے اعتبار سے دنیا کے بڑے مذہب شمار کئے جاتے ہیں یہ مذاہب چار ہیں ہندو مذہب، بودھ مذہب، یہودیت اور مسیحیت مسئلہ جنگ کے لحاظ سے ان کی دو قسمیں ہیں ایک قسم وہ ہے جس نے جنگ کو جائز رکھا ہے اسمیں ہندو مذہب اور یہودیت شامل ہیں دوسری قسم وہ ہے جس نے جنگ کو جائز نہیں رکھا پھر بھی بعض قوانین جنگ پر ان کا عمل ہے۔ راقم الحروف نے یہاں صرف اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا ہے بقیہ مذاہب کا نقطۂ نظر اگر معلوم کرنا ہے تو الجہاد فی الاسلام کے صفحات ۲۶۴ تا ۳۶۸ کا مطالعہ کرنا چاہیئے جس کا خلاصہ یہ ہے:-

مقدم الذکر دونوں مذہب انسان کو ان تمام اغراض کی خاطر لڑنے کی اجازت دیتے ہیں جن کے لئے اُن کا نفس خواہشمند ہو وہ لڑنے کے لئے انسان کے سامنے کوئی بلند نصب العین پیش نہیں کرتے اس کے علاوہ انھوں نے انسانیت کو جغرافی و نسلی و لونی اصول پر تقسیم کیا ہے اور کسی خاص

نسل کے لوگوں کو کچھ ایسی رعایات دی ہیں جن سے باقی تمام ابنائے نوع محروم ہیں۔ دوسری طرف موخرالذکر دو مذہب یہ تو محسوس کرتے ہیں کہ انسان کو خود انسان کا شکار کرنے کی اجازت دینا درست نہیں ہے لیکن اس احساس کی وجہ سے وہ خود انسانی فطرت ہی سے جنگ کرنے لگتے ہیں کیونکہ اللہ نے انسان کی زندگی میں اعتدال قایم رکھنے کے لئے جو مختلف قوتیں ودیعت کی ہیں وہ ان میں سے بعض کو بالکل فنا کردینا چاہتے ہیں اور بعض کو پوری انسانی سیرت پر حاوی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں وہ تنزل، انحطاط اور مغلوبی ومقہوری کی انتہائی پستیوں میں گر جاتے ہیں ان کو عملی زندگی کے کسی شعبہ میں ہدایت کی روشنی نہیں ملتی۔ اور وہ ناچار اپنے اہواء وامیال کی پیروی اختیار کرکے کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ افراط وتفریط کے ان دو انتہائی نقطوں کے درمیان اسلام نے توسط واعتدال کی ایک درمیانی راہ پیدا کی ہے وہ انسانیت کی اصلاح کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر جنگ کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہے ایک وہ جنگ جو ملک و مال، جاہ و اقتدار اور نفسانی اغراض کے حصول کے لیۓ کی جاتی ہے اور دوسری جنگ جو حق کی حفاظت اور ظلم وجور کو دفع کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ پہلی جنگ کو وہ فتنہ وفساد اور ایک بڑی معصیت قرار دیکر کامل اجتناب کا حکم دیتا ہے دوسری جنگ میں اگر نفسانی غرض شامل نہ ہو اور انسانیت کے معیار کو بلند کرنے کے لئے لڑی جائے تو وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس کی تشریح اگلی سطور میں کی جائے گی۔

۱۶

حرمتِ نفس

یورپی ممالک کی مختلف عیسائی اقوام نے جب مشرقی ممالک کو اپنی حرص وآز کا شکار بنانا شروع کیا تو چونکہ ان کے مدمقابل زیادہ تر مسلمان ہی تھے اس لئے مسلمانوں کو بدنام کرنے کی خاطر اور اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کے لئے مفتوحین سے یہ کہنا شروع کیا کہ مسلمان تو تلوار کے شیدائی ہیں ان کو امن وامان کے قیام سے کیا غرض ہم تمہارے نجات دہندہ اور ایک اعلیٰ تہذیب وتمدن کے علم بردار ہیں لیکن حقیقت پھر حقیقت ہے اس پر پردہ ڈالنا سعی لاحاصل کے مترادف ہے ان کو شاید اس کا علم نہیں کہ آج دنیا کے مہذب قوانین میں حرمتِ نفس کو جو درجہ حاصل ہوا ہے وہ اس انقلاب کے نتائج میں سے ایک شاندار نتیجہ ہے جو اسلامی تعلیم نے دنیا کے اخلاقی ماحول میں یہ بپا کر برپا کیا تھا کہ "اس جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے ہلاک نہ کرو مگر یہ کہ حق کا تقاضا ہو" (پارہ ۱۵ رکوع ۶) ورنہ جس تاریک دور میں یہ تعلیم اتری تھی اس میں انسانی جان کی فی الحقیقت کوئی قیمت نہ تھی۔ روم کے کولیسم (colosseum) کے افسانے اب تک تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہیں جس میں ہزارہا انسان شمشیر زنی کے کمالات اور رومی امراء کی شوق تماشا کی نذر ہو گئے۔ انسانوں کو درندوں سے پھڑوانا۔ یا جانوروں کی طرح ذبح کرا دینا۔ یا ان کے زندہ جلنے کا تماشا دیکھنا معمولی بات تھی۔ یونان وروما میں باپ کو اپنی اولاد کے قتل کا پورا حق حاصل تھا۔ شوہر کا بیوی کو قتل کر دینا بھی ایسا ہی تھا جیسے کسی پالتو جانور کو ذبح کر دینا۔ ہندوستان بھی اس معاملہ میں کسی سے پیچھے نہ تھا یہاں مرد کی لاش پر عورت کو زندہ جلا دینا مذہباً جائز

تھا۔ شودر کی جان کوئی قیمت نہ رکھتی تھی اس کا خون برہمن کے لئے حلال تھا۔ وید کی آواز سن لینا شودر کے لئے اتنا بڑا اگناہ تھا کہ اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری تھا۔ جل پرواہ کی رسم عام تھی جس کے مطابق پہلوٹھی کا بچہ گنگا کے نذر کیا جاتا تھا۔ خودکشی ایک فعل مستحسن تھا۔

قصاص

اسلام کی یہ تعلیم کہ جان کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو قتل نہ کرو بجز اس صورت کے کہ حق اس کے قتل کا مطالبہ کرے"۔ بالکل ادھوری اور ناقص رہجاتی اگر صرف یہ حکم ہوتا کہ کسی حال میں قتل نہ کرو کیونکہ اس سے دُنیا میں بجائے امن و امان کے فساد کی تخم ریزی ہوتی اس لئے یہ صاف طور سے بتا دیا کہ انسان کو زندہ رہنے کا حق جائز حدود کے اندر دیا جائے۔ مگر جب وہ ان حدود سے تجاوز کر کے فتنہ و فساد پھیلائے اور دوسرے کی جان پر ناحق حملہ کرے تو وہ ایسا کرنے سے اپنے حقِ زندگی کو خود بخود کھو دیتا ہے اور پھر اس کی موت ہی انسانیت کے لئے حیات ہوتی ہے۔

یہ قصاص کا قانون جس طرح افراد کے لئے ہے اسی طرح جماعتوں کے لئے بھی ہے جس طرح افراد سرکش ہوتے ہیں۔ اسی طرح جماعتیں بھی سرکش ہوتی ہیں۔ افراد کا فتنہ محدود ہوتا ہے لیکن جماعتوں کا فتنہ ایک غیر محدود مصیبت ہوتا ہے۔ بعض جماعتیں دھن دولت کی لالچی ہوتی ہیں وہ غریب قوموں پر ڈاکے ڈالتی ہیں ان کی تجارت اور صنعت و حرفت پر قبضہ کرتی ہیں اپنی خواہشوں پر کمزوروں کے حقوق قربان کر دیتی ہیں ان کے ناپاک اثر سے مغلوب قوموں کے اخلاق تباہ ہو جاتے ہیں۔ اپنی خواہش اقتدار کو پورا کرنے کے لئے زمین

میں فساد پھیلاتی ہیں اور خدا کے بیگناہ بندوں کا خون بہاتی ہیں۔ ایسی صورت میں جنگ جائز ہی نہیں بلکہ فرض ہو جاتی ہے اس وقت انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہوتی ہے کہ ان ظالموں کے خون سے زمین کو سُرخ کر دیا جائے۔ اور ان کے شر سے اللہ کے مظلوم اور بے بس بندوں کو نجات دلائی جائے۔ کوئی سچا اخلاقی مصلح تلوار اور قلم میں سے ایک چیز کو اختیار کرنے اور ایک ہی کے ذریعہ سے فریضۂ اصلاح کو انجام دینے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس کو اپنا کام پورا کرنے کے لئے دونوں چیزوں کی یکساں ضرورت ہے۔

مقصد جنگ

جب تک تبلیغ و تلقین سے شورہ پُشت جماعتیں اخلاق و انسانیت کے حدود کے اندر رہیں اس وقت تک ان کے خلاف تلوار اُٹھانا حرام ہے۔ لیکن جب وہ انسانیت کے حدود کو توڑ ڈالیں اور انسانی شرف و مجد کو پامال کر دیں تو اُس وقت ہر سچے بہی خواہ انسان کا یہی فرض ہے کہ ان کے خلاف تلوار اُٹھائے۔ اور اس وقت تک آرام نہ لے جب تک خدا کی مخلوق کو اس کے کھوئے ہوئے حقوق واپس نہ مل جائیں اسی کو جہاد فی سبیل اللہ کہتے ہیں کیونکہ یہ جنگ بندوں کی ذاتی اغراض کی تکمیل کی خاطر نہیں بلکہ خدا کی خوشنودی کے لئے لڑی جاتی ہے۔ دُنیا کی تمام دیگر اقوام کا مقصدِ جنگ یا تو حصول دولت ہے یا پھر ان کی جوع الارض کی تسکین کا تقاضا۔ مسلمانوں کو قتال فی سبیل اللہ کی جانب یہ کہکر کہیں بھی رغبت نہیں دلائی گئی کہ اُس کے عوض انھیں دولت یا حکومت ملے گی بلکہ اس کے برخلاف صرف خدا کی خوشنودی حاصل کرنا اور عذاب آخرت سے محفوظ رہنا اُن کا مقصود زندگی قرار دیا گیا۔ نیز زبردستی دین قبول کرانے کے لئے تلوار اُٹھانا

تو درکنار ادنیٰ درجہ کی سختی کی بھی ممانعت کردی گئی ہے[1]۔

مجاہدین کا درجہ

اللہ جب یہ نہیں چاہتا کہ اس کی زمین پر فتنہ و فساد پھیلایا جائے اور اس کے بندوں کو بے قصور ستایا اور تباہ و برباد کیا جائے۔ اسے جب یہ منظور نہیں کہ دنیا میں سیہ کاری، بداعمالی اور قتل و غارتگری جاری رہے اور انسان جو کہ واقعتہً اسی کی غلامی اور بندگی کے لئے ہیں ان کو مخلوق کا غلام بنا کر ان کی انسانی شرافت پر ذلت کا داغ لگایا جائے تو جو گروہ بغیر کسی معاوضہ کی خواہش بغیر کسی دھن دولت کے لالچ اور بغیر کسی ذاتی نفع کی تمنا کے محض خدا کی رضامندی و رضاجوئی کے لئے دنیا کو اس فتنہ سے پاک کرے اور ظلم کی جگہ عدل قائم کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے اور اس نیک کام میں اپنی جان و مال، اپنی تجارت کے فوائد اپنے اہل و عیال کی محبت اور اپنے گھر بار کے عیش و آرام سب کو قربان کردے اس سے زیادہ اللہ کی محبت اور اس کی رضامندی کا کون مستحق ہو سکتا ہے؟

انسان کی یہ اسپرٹ کہ وہ بدی کو کسی حال میں انگیز نہ کرے اور اسے دفع کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہو جائے انسانی شرافت کا سب سے اعلیٰ معیار ہے اور علی زندگی کی کامیابی کا راز اسی اسپرٹ میں مضمر ہے جو شخص دوسروں کے لئے بدی کو برداشت کرتا ہے اس کی یہ اخلاقی کمزوری اسے بہت جلد اس پر بھی آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ خود اپنے لئے بدی کو برداشت کرے۔ اور جب اس میں برداشت کا یہ مادّہ بھی پیدا ہو جاتا ہے تو اس پر ذلت کا وہ درجہ آتا ہے جہاں اس کے اندر شرافت و انسانیت کا کوئی احساس باقی نہیں رہتا وہ

---

[1] ۔ چنانچہ لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی اس کی روشن دلیل ہے (پارہ ۳ رکوع اوّل)

جسمانی و مادّی غلامی ہی میں نہیں بلکہ ذہنی روحانی غلامی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف جس شخص میں یہ اخلاقی قوت موجود ہو کہ وہ بدی کو محض بدی ہونے کے باعث برا سمجھے اور انسانی برادری کو اس سے نجات دلانے کے لئے انتھک جدوجہد کرتا رہے۔ وہ ایک سچّا اور اعلیٰ درجہ کا انسان ہوتا ہے۔ اور اس کا وجود عالم انسانی کے لئے باعث رحمت ہوتا ہے۔

اسی بنا پر مجاہدین کی وہ جماعت یا گروہ جو بدی کے مقابلہ میں اپنے عیش و آرام اپنی دولت و ثروت، اپنی نفسانی لذّات اور اپنی جان کی محبت غرض کسی چیز کو عزیز نہیں رکھتا دنیا کے لئے باعث رحمت ہے۔ ایسی جماعت یا قوم کبھی ذلیل و خوار ہو کر نہیں رہ سکتی اور اس کی عزّت کو کوئی قوت پامال نہیں کر سکتی۔ حق کے آگے سر جھکانا اور ناحق کے آگے سر جھکانے پر موت کو ترجیح دینا ایک شریف و زندہ قوم کا خاصّہ ہونا چاہئے اور اگر وہ اعلائے حق اور نصرت حق کی قوت نہ رکھتی ہو تو اسے کم از کم تحفظ حق پر سختی کے ساتھ ضرور قائم رہنا چاہئے جو شرافت کا کم سے کم درجہ ہے۔ لیکن اس درجہ سے گر کر جو قوم حق کی حفاظت بھی نہ کر سکے اور اس میں ایثار و قربانی کا فقدان اس قدر ہو جائے کہ بدی و شرارت جب اس پر چڑھ کر آئے تو وہ اسے مٹانے یا خود مٹ جانے کے بجائے اس کے ماتحت زندہ رہنے کو قبول کرے تو ایسی قوم کے لئے دنیا میں کوئی عزّت نہیں اور اس کی زندگی یقیناً موت سے بدتر ہے۔

مدافعانہ جنگ

سطور بالا کے پڑھ لینے سے یہ بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کا مقصد جنگ کیا ہے اور انھیں جنگ کرنے کا کیوں حکم دیا گیا ہے سطور ذیل

میں اس امر کی وضاحت مقصود ہے کہ یہ جنگ کب اور کن صورتوں میں کس کس سے کی جائے مسلمانوں کے خدائی قانون یعنی کلام پاک میں اس پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جس کے بیان کرنے کی ان صفحات میں گنجائش نہیں پھر بھی اجمالاً اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ مدافعانہ جنگ کی بعض ناگزیر صورتیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) جب مسلمانوں سے بلا وجہ جنگ کی جائے اور ان پر مظالم ڈھائے جائیں تو مدافعانہ جنگ کی اجازت ہے۔

(۲) جو لوگ مسلمانوں کے گھر بار چھینیں ان کے ساتھ جنگ کرنا چاہیئے۔

(۳) جب مسلمانوں پر محض اس لئے ظلم کیا جائے کہ وہ مسلمان ہیں تو مذہبی آزادی کی خاطر جنگ کرنا جائز ہے۔

(۴) اگر دشمن غلبہ کرکے کسی سرزمین سے مسلمانوں کو نکال دے تو مسلمانوں کو جب کبھی بھی طاقت حاصل ہو تو انھیں (دشمنوں کو) اس سرزمین سے نکالنے کے لئے جنگ کریں۔ (سورہ بقر آیۃ ۲۴)

(۵) اسلام کی ترقی کو تلوار یا اقتصادی یا سیاسی قوت سے یا ان کو مذہبی فرائض ادا کرنے اور مذہبی احکام کی تعمیل کرنے سے روکا جائے تو ان تمام صورتوں میں جنگ کرنے کی اجازت ہے۔ (سورہ ۴۷ آیۃ ۱تا۴)

(۶) سورۂ انفال و سورۂ توبہ میں نہایت صراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ (ا) جو لوگ مسلمانوں سے عہد کرکے توڑیں ان سے جنگ کرنی چاہیئے۔

(ب) جو لوگ بار بار بدعہدی اور دغابازی کریں اور جن کے عہد و پیمان کا کوئی اعتبار نہ رہے اور جو مسلمانوں کو نقصان پہونچانے میں اخلاق و انسانیت کے کسی آئین کا لحاظ نہ رکھیں ان سے دائمی جنگ کا حکم ہے۔ تاوقتیکہ ان کے فتنہ کا آئندہ کے لئے سدباب نہ ہوجائے۔

(۷) اسی طرح منافقین کے ساتھ بھی جنگ کرنے کا حکم ہے یہ گروہ جو زبان سے بدستور اسلام کا اقرار کرتا ہے لیکن خفیہ طور سے دشمنوں سے سازباز رکھتا ہے یہ گروہ اسلام کے لئے ان کے بیرونی دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہے اس لئے جب ان سے بھی ان جرائم کا صدور ہو تو جسم اسلامی کو ان پھوڑوں پر سختی کے ساتھ اصلاح کا نشتر استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ (سورہ ۹ آیۃ ۱) (سورہ ۴ آیۃ ۱۲)

مسلمانوں پر یہ فرض بھی عاید کیا گیا ہے کہ وہ دوسری جگہ کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کو پہونچیں بشرطیکہ جس دشمن کے خلاف مدد مانگی گئی ہو۔ اس سے ان مدد کرنے والے مسلمانوں کا پہلے سے معاہدہ نہ ہو۔ کیونکہ معاہدہ ہونے کی حالت میں مسلمانوں کے لئے عہد کی پابندی اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد سے زیادہ ضروری ہے۔ اس لئے ان کے لئے یہ جائز نہیں کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے مظلوم مسلمانوں کی مدد کریں۔ (سورۃ ۴ آیۃ ۱۰) (سورۃ ۸ آیۃ ۱۰)

دفاعی جنگ کی ان تمام صورتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان سب کے اندر ایک ہی جذبہ کام کر رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین اور اپنے ملی وجود کو کسی حال میں بدی و شرارت سے مغلوب نہ ہونے دیں۔ اور یہ بدی جس راہ سے بھی خروج کرے خواہ باہر سے یا اندر سے اس کا سر کچلنے کے لئے ہر وقت مستعد رہیں کیونکہ اگر ان کے اندر سیاسی و دینی یکجہتی نہ رہے اور وہ فتنوں اور خرخشوں سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکیں تو خدا نے انھیں انسانیت کی جس خدمت کے لئے[۱] مامور کیا ہے وہ اچھی طرح سرانجام نہیں پاسکتی اور ایسا ہونا نہ صرف ان پر بلکہ تمام عالم انسانی پر ظلم ہوگا۔

---

[۱] ۲، ۳ کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ حج آیۃ ۶

مصلحانہ جنگ

انسانیت کی وہ کونسی خدمت ہے جس پر مسلمانوں کو مامور کیا گیا ہے اور اس خدمت کو کس طرح انجام دینے کا حکم ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے انسانوں کے اجتماعی فرائض کو سامنے رکھنا چاہئے۔ علم الاخلاق میں انسان کے فرائض کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک وہ فرائض ہیں جن کے کرنے کا اس سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے اور دوسرے وہ فرائض ہیں جن کا کرنا نہ کرنا خود انسان کی مرضی پر موقوف ہے۔ دوسرے کے حقوق نہ چھیننا۔ دوسروں پر ظلم نہ کرنا اور ان کے امن و امان میں خلل نہ ڈالنا۔ اسی طرح ان تمام دیگر اعمال سے پرہیز کرنا جن سے سوسائٹی کو نقصان پہونچتا ہو۔ یہ وہ تمام فرائض ہیں جن کے ادا کرنے کے لئے سوسائٹی اپنے ہر رکن کو مجبور کرتی ہے۔ اور اگر وہ انھیں ادا نہ کرے تو سوسائٹی کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اسے ان کے ادا کرنے پر مجبور کرے۔ فرائض کی دوسری قسم وہ ہے جس کو سوسائٹی کا ہر فرد ایک معزز اور اعلیٰ رکن بننے کے لئے ادا کرتا ہے یہ فرائض اس قسم کے ہیں۔ مثلاً خدا اور بندوں کے حقوق کو پہچاننا اور انھیں ادا کرنا۔ خود نیک بننا اور دوسروں کو نیک بنانا، اپنے خاندان، اپنی قوم، اپنے ابنائے نوع کی خدمت کرنا اور حق کی حمایت وحفاظت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ان دوسرے قسم کے فرائض کو ادا کرنے کے لئے انسانی شعور کی تکمیل ضروری ہے۔ اور کوئی شخص انھیں اس وقت تک ادا نہیں کرسکتا جب تک ان کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ نہ لے۔ ہم آسانی کی غرض سے پہلے قسم کے فرائض کو مذہبی اصطلاح میں نہی عن المنکر اور دوسری قسم کے فرائض کو امر بالمعروف کے تحت میں لا سکتے ہیں۔ نہی عن المنکر

کا کام اگر آدمی کو حیوانیت سے نکال کر انسانیت کے درجہ میں لانا اور اسے سوسائٹی کا ایک غیر مفید اور نقصان دہ رکن بننے سے روکنا ہے تو امر بالمعروف کا کام اس کو انسانیت کی سطح سے اٹھا کر انسانیت کاملہ کے درجہ میں لیجانا اور اسے سوسائٹی کا ایک مفید اور معزز رکن بنانا ہے۔

(۱) **تبلیغ کا منشاء**:۔ غرضکہ مصلحانہ جنگ کا پہلا اہم جزو تبلیغ ہے۔ اسلام ہر شخص کو معروف کی طرف دعوت دیتا ہے اور اس کی خوبیاں دکھا کر اسے اختیار کرنے پر آمادہ کرتا ہے لیکن منکر ایک پردہ ہے۔ جو اس کو معروف کا جمال دیکھنے سے باز رکھتا ہے۔ اس لئے منکر کے پردہ کو چاک کرنا اور اس کے زنگ کو ہر ممکن طریقہ سے کھرچ دینا سب سے پہلی اور ضروری تدبیر ہے۔ لیکن اگر زنگ چھوٹ جانے کے بعد اور یہ پردہ اٹھ جانے کے بعد بھی کوئی آنکھ معروف کا جمال نہ دیکھے اور کوئی قلب اس کا پرتو قبول نہ کرے تو اسلام اسے صرف منکر سے روکنے پر اکتفا کرتا ہے۔

نہی عن المنکر اور امر بالمعروف ایک دوسری طرح خود اسلام کی دو مختلف حیثیتوں سے متعلق ہیں اسلام ایک حیثیت میں تو دعوت ہے نیکی اور تقوٰی کی جانب اور دوسری حیثیت میں وہ اللہ کا قانون ہے تمام دنیا کے لئے جب کوئی شخص اسلام قبول کرلیتا ہے تو اس کے لئے یہ دونوں حیثیتیں یکجا جمع ہوجاتی ہیں اور دعوت کی دفعات بھی اس کے حق میں قانون کی دفعات بن جاتی ہیں مگر اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں دعوت الگ رہتی ہے اور قانون الگ۔ دعوت کا منشاء یہ ہے کہ انسان اس منصب خلافت کا اہل بن جائے جو اللہ نے اسے سپرد کیا ہے۔ اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرے جو خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں قانون کا منشاء یہ ہے کہ اگر

منصب خلافت کی خدمات کو انجام نہ دے تو کم از کم اللہ کی زمین پر فساد وخونریزی تو نہ کرے۔ اگر اشرف المخلوقات نہ بنے تو ارذل المخلوقات تو نہ بن جائے۔ اگر دنیا کو نیکی و تقویٰ سے روشن نہ کرے تو کم از کم بدی وشرارت سے اس کے امن وسکون کو غارت تو نہ کرے پہلی چیز باطن کی روشنی اور طبیعت کی صلاحیت پر منحصر ہے جو ظاہر ہے کہ مارنے کوٹنے سے پیدا نہیں ہوتی لیکن دوسری چیز حدود کی تعین اور نگہداشت سے تعلق رکھتی ہے جس کا پاس ولحاظ کرنے پر اس کی سرکش طبیعت کو صرف وعظ وتلقین ہی سے آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ بعض حالات میں اسے سرکشی سے باز رکھنے کے لئے قوت کا استعمال بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسلام نے غیر مسلم دنیا کو معروف سے متعارف کرانے کے لئے تو صرف دعوت وتبلیغ کا طریقہ بتایا ہے لیکن منکر سے روکنے کے لئے اس کی قید نہیں رکھی بلکہ اس کی مختلف انواع کے لئے مختلف طریقے تجویز کئے مثلاً قلب وذہن کی گندگی اور خیال ورائے کی ناپاکی کو وعظ وتلقین کے ذریعہ سے دور کرنے کی ہدایت کی لیکن فعل وعمل کی برائی کو قوت وطاقت کے زور سے روکنے کا حکم دیا۔ منکر کے روکنے میں اگر زبان ناکام رہے تو پھر اس کو بزور روک دینے کا حکم ہے۔ اسلام چونکہ عین فطرت انسانی کے مطابق ہے لہٰذا اس کی اشاعت اسی وقت زیادہ ہو سکتی ہے جبکہ ہر قسم کا امن و امان دنیا میں قائم ہو تاکہ اسلام کے سمجھنے اور اس سے واقف ہونے کا موقع لوگوں کو میسّر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سب سے زیادہ فتنہ و فساد اور بدامنی کا دشمن اور امن و امان کا خواہاں ہے۔ امن و امان قائم کرنے کی غرض سے اور لوگوں کو بدی وشرارت سے باز رکھنے کے لئے وہ تلوار سے کام لینے کو بھی جائز بلکہ ضروری سمجھتا ہے۔

دعوت وتبلیغ کی ضرورت و طریق کار کو سمجھنے کے لئے اتنی بات اور یاد

رکھنا چاہئے کہ جس طرح ایک آدمی کی زندگی کا نصب العین اگر تن پروری اور لذّتِ نفس کے سوا اور کچھ نہ ہو تو وہ ایک ذی عقل حیوان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اسی طرح ایک ایسی انسانی جماعت بھی متمدن جانوروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جس کی کوششوں کا دائرہ صرف اپنی فلاح وبہبود تک محدود ہو اور عام انسانی فلاح سے اس کو کچھ مطلب نہ ہو۔ جو اپنے گھر کی آگ بجھانے میں تو خوب مستعد ہو لیکن دوسروں کا گھر جلتا دیکھ کر ٹس سے مس نہ ہو اس کو ایک اچھا آدمی کہنا تو درکنار ہم اسے آدمی سمجھنے میں بھی تامل کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہم ایسی جماعت کو ایک شریف قوم کیونکر کہہ سکتے ہیں جو اپنی حفاظت کو تو سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے لیکن جب دوسری قوموں پر بدی کا غلبہ ہو اور وہ شیطانی قوتوں کی سرکشی سے تباہ ہو رہی ہوں تو ان کی نجات و آزادی کے لئے کوشش کرنے سے انکار کردے۔ اپنی آزادی کو محفوظ رکھنا اور اپنے آپ کو شرارت کے تسلّط سے بچانا بلاشبہ ایک قوم کا پہلا فریضہ ہے لیکن صرف یہی ایک فرض نہیں ہے جسے ادا کر کے مطمئن ہو جانا چاہئے بلکہ اس کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ اپنی حاصل کی ہوئی طاقت سے تمام بنی نوع انسان کی نجات کے لئے کوشش کرے اور انسانیت کی راہ سے ان تمام رکاوٹوں کو دور کرے جو اس کی اخلاقی، روحانی اور مادّی ترقی میں حائل ہوں۔

افسوس کہ دُنیا کے کم نظر گیانیوں نے اجتماعی شرافت کے اس بلند معیار اور اجتماعی زندگی کے اس اعلیٰ نصب العین کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جس کی اسلام تعلیم دیتا ہے۔ انھوں نے اجتماعی فرائض کو قومیت یا وطنیت کے ایک محدود دائرے میں سمیٹ کر اس قوم پرستی یا وطن پرستی کی بنیاد ڈالی جو تھوڑے سے تغیر کے بعد آسانی کے ساتھ قومی و وطنی عصبیت کی

صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور یہ تنگ نظری ہی دراصل انسانیت کی اس غیر طبعی تقسیم کی ذمہ دار ہے جس کی بدولت ایک نسل یا ایک زبان یا ایک قومیت رکھنے والے انسان دوسرے ابنائے نوع کو دائرۂ انسانیت سے خارج سمجھتے ہیں۔ اور ان کے حقوق کو سمجھنا اور ادا کرنا تو درکنار انھیں ان کے پامال کرنے میں بھی اخلاق و شرافت کا کچھ ٹوٹا نظر نہیں آتا۔ اسلام نے اس غیر طبعی تقسیم کو منسوخ کر کے اور اجتماعی شرافت کے اس بلند معیار کو پیش کر کے عالمگیر خدمتِ انسانی کے اس اعلیٰ نصب العین کی طرف اُمّتِ مسلمہ کی رہنمائی کی ہے۔ جو ہر قسم کے امتیازات سے بالاتر ہے جس میں رنگ، نسل، زبان قومیت اور وطنیت کو دخل نہیں اور جس میں کوئی چھوت چھات اور ورن آشرم کی قید نہیں رکھی گئی۔ غرض کہ مسلمان صرف اپنی ذات کی خدمت ہی کے لئے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان کی زندگی کا مقصد تمام عالم انسانی کی خدمت بھی ہے جس کا ایک ذریعہ دعوت و تبلیغ ہے۔

(ب) **جزیہ**:۔ مصلحانہ جنگ کا حکم فتنہ و فساد مٹانے اور مفسدوں سے فساد کی قوت چھین کر انھیں نیکی کا تابع بنانے کیلئے ہے اور مفسدوں سے یہاں تک لڑنے کا حکم ہے کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں۔ اور عاجزی و محکومی پر راضی ہوں۔ کلام پاک میں آیۂ شریفہ حتّٰی یعطوا الجزیۃ (۹- ۲۹) کے اندر قتال کی غایت کو صاف طور سے بیان کر دیا گیا ہے اگر حتی یسلموا کہا جاتا تو غایت قتال یہ ہو سکتی تھی کہ انھیں تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جائے لیکن حتّٰی یعطوا الجزیۃ نے بتلا دیا کہ ان کا جزیہ ادا کرنے پر راضی ہو جانا قتال کی آخری حد ہے۔ لیکن اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حکم قتال کا مقصد محض جزیہ حاصل کرنا ہے۔ چند درہم سالانہ کے عوض اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لینا کہ ذمیوں

کی حفاظت کے لئے ہر دشمن کے سامنے اپنے کو سینہ سپر کردیا جائے کسی طرح پر مبنی نہیں ہوسکتا۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ ایک ذمّی جزیہ دیکر اطمینان کے ساتھ اپنی تجارت اپنے کاروبار اپنے عیش وآرام اور اپنے اہل وعیال کی معیت سے مستفید ہو۔ اور مسلمان زکوٰۃ وصدقات کی بھاری رقوم اداکرنے کے بعد بھی ملک کی حفاظت کے لئے میدان جنگ کی مصیبتیں اُٹھائے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالے۔ دراں حالیکہ اس کو یہ قدرت حاصل ہو کہ اس ذمّی کو ادائے جزیہ کے باوجود جنگی خدمت پر مجبور کرے اور خود لطف ومسرّت کی زندگی بسر کرے۔ پس عطائے جزیہ پر قتال کی اباحت ختم کردینے اور قبول جزیہ کے بعد قیام عدل وامن کی ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لینے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کا مقصد ان لوگوں کو فتنہ وفساد سے روکنا اور امن وآئین کا پابند بنانا ہے۔ اس کے لئے ان پر جزیہ کے نام سے ٹیکس عاید کرنا صرف اس لئے ہے کہ وہ اس حفاظت وصیانت کے مصارف میں شرکت کریں جو انھیں بہم پہونچائی جاتی ہے۔ اور اطاعت پر قائم رہیں۔

جزیہ کے قیام کی غرض یہ بھی ہے کہ ذمیوں کو اپنے عہد کا پابند بنایا جائے کیونکہ اس کا ادا نہ کرنا نقض عہد کا مترادف ہے یہی وجہ ہے کہ جزیہ صرف اہل قتال پر عائد کیا گیا ہے اور عورتیں، نابالغ بچّے اور بہت بوڑھے لوگ نیز اندھے اور اپاہج اس سے مستثنیٰ ہیں اور پھر چونکہ قتال کا مقصد امن وامان قائم رکھنا ہے اس لئے جزیہ کی رقم نہایت قلیل رکھی گئی ہے تاکہ اسے نہایت آسانی کے ساتھ لوگ اداکرسکیں اور ساتھ ہی ساتھ اِس امر کی بھی سخت تاکید ہے کہ جزیہ کے وصول کرنے میں تشدد کو کام میں نہ لایا جائے بلکہ جہاں تک ہوسکے نرمی وملائمت برتی جائے۔ اِس کے متعلق بکثرت احکام

موجود ہیں جن پر سختی سے عمل کیا گیا ہے چنانچہ ایک مرتبہ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے پاس جزیہ کی رقم لائی گئی آپ نے اسے غیر معمولی دیکھ کر فرمایا "مجھے گمان ہے کہ تم نے لوگوں کو برباد کر دیا" محصلین نے جواب دیا "خدا کی قسم ہم نے بہت نرمی کے ساتھ وصول کیا ہے" آپ نے پھر پوچھا بلا سوط بلا نوط یعنی بغیر مارے باندھے[1] - انھوں نے عرض کیا کہ ہاں بغیر مارے باندھے تب آپ نے اس مال کو خزانہ میں داخل کرنے کی اجازت دی[2] - اسی طرح حضرت علیؓ نے ایک موقع پر ایک عامل کا تقرر کرتے وقت اس کو یہ ہدایت کی۔

"ان کے (یعنی ذمیوں کے) جاڑے گرمی کے کپڑے اور اُن کے کھانے کا سامان اور اُن کے جانور جن سے وہ کھیتی باڑی کرتے ہیں خراج وصول کرنے کی خاطر ہرگز نہ بیچنا۔ نہ کسیکو درہم وصول کرنے کے لئے کوڑے مارنا۔ نہ کسی کو کھڑا رکھنے کی سزا دینا۔ نہ خراج کے عوض کسی چیز کا نیلام کرنا کیونکہ ہم جو اُن کے حاکم بنائے گئے ہیں تو ہمارا کام نرمی سے وصول کرنا ہے - اگر تم نے میرے حکم کے خلاف کیا تو اللہ میرے بجائے تم کو پکڑے گا اور اگر مجھے تمہاری خلاف ورزی کی خبر پہونچی تو میں تمہیں معزول کر دوں گا"[3]

بہرصورت جزیہ کا عائد کیا جانا سزا دینے کے خیال سے نہیں ہے - بلکہ اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ ذمی امن و آئین کے پابند ہوں، خوشی کے ساتھ عدل و قانون کی اطاعت کریں اور اپنی استطاعت کے مطابق اس حکومت کے

عـ۱ :- فقہاء اسلام نے نادہندوں کے حق میں صرف اتنی اجازت دی ہے کہ انھیں تادیباً قید بے مشقت کی سزا دی جاسکتی ہے (ملاحظہ ہو کتاب الخراج صـ۲۰ ابوداؤد)

عـ۲ :- الجہاد فی الاسلام صـ۱۲۳ بحوالہ فتح البیان -

عـ۳ :- کتاب الخراج صـ۹، فتح البیان ج ۴ صـ۹۳

مصارف ادا کریں جو انھیں ہر طرح سے امن و آسائش کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع دیتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر جبکہ ان کا ہم نسل قبیلہ بنو تغلب جو مذہباً عیسائی تھا محروسۂ خلافت میں داخل ہوا تو قبیلہ کی منشاء کے مطابق جزیہ و خراج کی رقم عشر و زکوٰۃ کے نام سے وصول کی کیونکہ اہل قبیلہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ ان کے ہم نسل قبائل زکوٰۃ دیں اور وہ جزیہ ادا کریں اس لئے رفع شر کی غرض سے نیز بنو تغلب کو امن و آئین کا پابند بنانے کے لئے حضرت عمرؓ نے ان کی بات مان لی۔[1]

حریفانِ زیرک نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کیلئے جزیہ کو ایسی بھیانک صورت میں پیش کیا ہے گویا یہ سزا کے طور پر وصول کیا جاتا تھا جس سے بچنے کے لئے ہندؤں کے بڑے بڑے گھرانوں نے اپنا مذہب تک تبدیل کر دیا۔ آج بھی قسم قسم کے ٹیکس لگائے جاتے ہیں اور عام باشندگان ملک کا افلاس بھی اس زمانہ کے مقابلہ میں آج کہیں زائد ہے مگر ٹیکسوں سے بچنے کے لئے کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرتے نہیں سُنا۔ فی زمانہ ملک میں عیسائی مشنری بکثرت موجود ہیں جن پر کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ کیا جاتا ہے جدید عیسائیوں کو خاص خاص رعائتیں بھی ملتی ہیں مگر کوئی شریف ہندو یا مسلمان روپیہ پیسہ کی خاطر ادھر متوجہ نہیں ہوتا۔ شاہانِ اِسلام کی پوری تاریخ میں کبھی کوئی مشنری تو درکنار کسی تبلیغی ادارہ کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اور اگر بالفرض جزیہ سے بچنے کے لئے لاکھوں کروڑوں ہندو مسلمان ہو گئے تو انکی بزدلی، پست ہمتی واقعی اپنے قدیم مذہب کے لئے لعنت تھی ایسے بزدلوں پر اسلام بھی کوئی اعتماد نہیں کرتا بلکہ ان کے اسلام ہی کو درست نہیں سمجھتا جو صداقت کی بنا پر نہیں بلکہ لالچ اور خوف کی بنا پر اختیار کیا گیا ہو۔

اِسلامی قانون کی رُو سے ذمیوں کے تین درجے ہیں۔ (۱) ایک وہ جو کسی

---

[1] :۔ علماءِ ہند کا شاندار ماضی صفحہ ۱۰۲ ماخوذ

صلحنامہ یا معاہدے کے ذریعہ سے عہد ذمہ کے حقدار ہوں (۲) دوسرے وہ جو لڑنے کے بعد شکست کھا کر مغلوب ہوئے ہوں (۳) تیسرے وہ جو جنگ و صلح دونوں کے سوا کسی اور صورت سے اسلامی ریاست میں شامل ہوئے ہوں۔ یہ تینوں اگرچہ ذمیوں کے عام حقوق میں یکساں شریک ہیں لیکن پہلے دونوں گروہوں کے احکام میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ پہلے گروہ سے جو بھی شرائط طے ہو جائیں گے انھیں کے مطابق اُن سے معاملہ کرنا پڑے گا۔ اُن سے تجاوز کرنا اسلام کے نزدیک نہ صرف ناجائز بلکہ حرام اور گناہ عظیم ہے۔ اِس بارے میں آنحضرت صلعم کا قول فیصل ہے۔

"خبردار! جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اسکی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے گا اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث بنوں گا"

(ابو داؤد۔ کتاب الجہاد)

چنانچہ اسی وجہ سے فقہاء اسلام نے گروہ ۱ کے متعلق کسی قسم کے قوانین مدوّن نہیں کئے اور صرف یہ عام قاعدہ وضع کر کے چھوڑ دیا ہے کہ ان کے ساتھ معاملہ بالکل شرائط صلح کے مطابق ہوگا۔

مفتوحین یعنی گروہ ۲ کے متعلق یہ ہے کہ جب امام (حاکم وقت) ان سے جزیہ قبول کرلے تو ہمیشہ کیلئے عقد ذمہ قائم ہو جائیگا۔ عقد ذمہ قائم ہو جانے کے بعد وہ بدستور اپنی زمینوں، مکانوں اور مذہبی عمارتوں کے مالک رہیں گے اور ان کی ملکیت ان کے ورثاء کو منتقل ہوگی۔ اُن کے پرسنل لا (قانون ملت) کو اسلامی قانون کے تحت میں نہیں لایا جائیگا وہ اپنی بستیوں کے اندر اپنے مذہبی مراسم اور قومی شعائر (بشرطیکہ وہ کھلے ہوئے فواحش نہوں) کے اعلان و اظہار میں آزاد ہوں گے البتہ خالص اسلامی بستیوں کے اندر حکومت کو اختیار ہوگا کہ اُن کو

آزادی دے یا کچھ پابندیاں عائد کردے[1]۔ جزیہ کی مقدار ان کی مالی حیثیت کے لحاظ سے متعین کی جائیگی۔ حضرت عمرؓ نے مالداروں پر ایک روپیہ ماہانہ، متوسط لوگوں پر آٹھ آنہ مہینہ اور مزدور پیشہ لوگوں پر چار آنہ مہینہ جزیہ مقرر کیا تھا۔ یہ بھی صرف اہل قتال پر ہے۔ بچے، عورتیں، دیوانے، اپاہج، عبادت گاہوں کے خادم، بوڑھے اور بیمار جو سال کے اکثر حصہ میں مریض رہے ہوں اس سے نہ صرف مستثنیٰ ہیں بلکہ ان کو تنگیٔ معشیت کی بنا پر بیت المال سے گذارے کیلئے وظائف بھی دیئے جائیں گے۔

غرضکہ جان و مال کے تحفظ کے جملہ حقوق اُن کے وہی ہیں جو کہ فاتحین کے ہیں اور اسی لمحہ سے جبکہ وہ مسلمانوں کے زیر سایہ آجاتے ہیں اُن کا خون مسلمانوں پر حرام ہوجاتا ہے اور اُن کے جان و مال کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہوجاتی ہے[2]۔ اسلام کی پُرامن حکومت میں اُن کو پوری آزادی ہوتی ہے

ع۱:۔ بدائع جلد ہفتم صفحہ ۱۱۴-۱۱۳، شرح السیر الکبیر جلد سوم صفحہ ۲۵۱، ترجمان القرآن جلد ۳۱ عدد ۴ صفحہ ۲۳۵-۲۱۲

ع۲:۔ مسلمانوں کو ذمیوں کی جان و مال کی حفاظت کا ہمیشہ اور ہر زمانہ میں خیال رہا انھوں نے جو نئے شہر اور نئی بستیاں بسائیں انہیں ذمیوں کو شہر کے وسط میں جگہ دی تاکہ وہ وہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں چنانچہ ہمارے شہر شاہجہانپور کے بارے میں یہ روایت ابتک مشہور ہے کہ اسکو جب سترھویں صدی عیسوی میں شاہجہاں کے ایماء سے انکے ایک ہفت ہزاری سردار خاں بہادر خاں نے آباد کیا تو بادشاہ نے اُنسے رعایا کی حفاظت کے بارے میں سوال کیا کہ شہر کی چہار دیواری کو تمنے کسطرح مستحکم کیا ہے اسپر بہادر خاں نے جواب دیا کہ حضور میں نے قلعہ کی چار دیواری کو افغانوں کے گوشت و پوست سے مضبوط کیا ہے یعنی شہر کی چار دیواری کو چونے اور گارے سے ترتیب نہیں دیا ہے بلکہ شہر کے چاروں طرف افغان قبائل کو آباد کر دیا ہے تاکہ غنیم کے حملہ آور ہونیکی صورت میں وہ اپنے گوشت و پوست سے رعایا کی حفاظت کرسکیں۔ (ملخص)

کہ تمام جائز طریقوں سے اپنی دولت، اپنی صنعت وحرفت، علوم وآداب اوراپنی تہذیب وتمدن غرض اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کریں۔ اور انسانیت کے بلند سے بلند معیار تک پہونچنے کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہوتی ہے انھیں آزادی کے ساتھ استعمال کریں پس اسلامی قانون ذمیوں کی انفرادی واجتماعی آزادی کو سلب نہیں کرتا بلکہ ان کو وہ وسیع آزادی عطا کرتا ہے جس کی تلاش آج کل کی دُنیاوی حکومتوں میں سعی لاحاصل کے مترادف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام اور ان حکومتوں کے قوانین کے نقطۂ نظر میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اس بنیادی فرق کو سمجھ لینے پر اسلامی نظام حکومت کا ایک اجمالی خاکہ آسانی کے ساتھ ذہن میں آسکے گا۔

اسلامی نظام حکومت کے بنیادی اصول

دُنیاوی حکومتیں بالعموم جہانگیریت کے اصول پر قائم ہیں۔ قوانین جہانگیریت کے مطابق محکوم قوم حاکم جماعت کی ملکیت ہوتی ہے اور حاکم کے لئے محکوم کے وسائل حیات ایک جائداد کی حیثیت رکھتے ہیں جسے اپنے فائدہ کے لئے استعمال کرنا اور محکوم کو اس کے فائدے سے محروم رکھنا اس کا قدرتی حق متصور ہوتا ہے۔ حاکم جماعت کا مفاد محکوم جماعت کے حقیقی مفاد سے کبھی متحد نہیں ہوسکتا اور لازمی طور پر کمزور کا مفاد طاقتور کے مفاد پر قربان کردیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلامی قوانین حکومت کی بنیاد خدمت نوع انسانی کے اعلیٰ اور شریف مقصد پر رکھی گئی ہے اس میں "حاکم و محکوم" کا تعلق صحیح معنوں میں خادم ومخدوم کا سا تعلق ہوتا ہے حاکم کا مفاد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ محکوم کے حقیقی واصلی مفاد کے حصول کی کوشش کرے۔ یعنی وہ سوسائٹی کی اخلاقی وروحانی

وغیرہ مادی زندگی کو تباہ کرنے والی چیزوں کو نہ ابھرنے دے اور محکوم جماعت
کے ہر ہر فرد کو ایک بلند پایہ انسان بننے میں پوری پوری مدد دے۔

جہانگیریت کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک خاص قوم اور ملک کے
افراد کی حکومت کا نام ہے انگریزی جہانگیریت جزیرۂ انگلستان کے باشندوں
سے مخصوص ہے۔ جرمن جہانگیریت جرمن قوم کے سوا کسی دوسرے کا حصہ نہیں۔
چونکہ دنیا کی دوسری اقوام کا نسلاً انگریز یا جرمن ہونا محال ہے۔ اس لئے
ان قوموں کی جہانگیریت میں دوسروں کا حصہ دار ہونا بھی محال ہے۔ اس
نظام جہانگیریت میں جب کبھی کوئی قوم دوسری قوم کو مغلوب کرتی ہے تو اس
کو حکومت و سلطنت میں اس لئے شریک نہیں کرتی کہ محکوم فاتح قوم کی نسل سے
نہیں ہے۔ پھر اسی چیز سے دوسری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں محکوم قوم حقیقتاً
ذلیل ہو جاتی ہے اور اس میں شرافت و خودداری کا احساس باقی نہیں رہتا
بخلاف اس کے اسلام کسی نسل یا قوم یا وطن کا نام نہیں ہے بلکہ ایک قانون
اور نظام حیات کا نام ہے۔ اس کے دروازے سب کے لئے کشادہ ہیں۔
عربی، عجمی، حبشی، چینی، ہندی، فرنگی سب اس کو اختیار کر سکتے ہیں وہ ان میں
رنگ و نسل یا وطن کی وجہ سے امتیاز و فرق قائم نہیں کرتا وہ انسان کو بحیثیت
انسان ہونے کے خطاب کرتا ہے۔ اور اس کے سامنے زندگی بسر کرنے کا
ایک طریقہ اور نظام پیش کرتا ہے جو کوئی اس طریقہ کو اختیار کرے وہ اسلامی
حکومت میں برابر کا شریک ہے اور اس کی شخصی قابلیت اسے خلیفہ و امام کے
درجہ تک پہونچا سکتی ہے اسلام میں نہ تو "حکومت قوم بر قوم دیگر" کا سوال
ہے۔ اور نہ "حکومت قوم بر قوم خود" کا وہ "حکومت صالح بر غیر صالح" کا قائل
ہے اگر ایک حبشی غلام ہو تو کوئی چیز اسے شرفائے عرب پر حکومت کرنے سے

روک نہیں سکتی۔ اسلام نے ترکی خلفاء کی امامت کو بھی اسی طرح جائز سمجھا جس طرح عباسی خلفاء کی امامت کو۔ اور آج اگر انگریزی قوم مسلمان ہو جائے اور اپنی اصلیت کا ثبوت پیش کرے تو یقیناً اسلام کو فرمانروائے انگلستان کی امامت تسلیم کرنے میں کبھی تامل نہ ہوگا۔

یہ تو اسلامیت و جہانگیریت کا ظاہری فرق تھا معنوی فرق اس سے بھی زیادہ روشن ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جہانگیریت در اصل ایک قسم کی خواہش نفس ہے جس کا مقصد حصول مال و زر کا نام ہے۔ جب کوئی قوم اس حکومت پر قانع نہیں ہوتی جو اس کو خود اپنے ملک میں حاصل ہوتی ہے تو وہ دوسرے ملکوں پر حملہ کر کے ان کی دولت پر قبضہ کر لیتی ہے۔ اس کے باشندوں کو غلام و محکوم بنا لیتی ہے اور اپنی صنعت و حرفت کو ان کے نتیجے پر فروغ دیتی ہے۔ مغربی قوموں نے اس ملک گیری اور لوٹ مار کا نام "تہذیب و تمدن کی اشاعت" اور "نوع بشری کی خدمت" رکھا ہے۔ ان کے آئین تہذیب و تمدن کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ "قوت حق ہے" اور کمزور کو دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کمزور قوموں میں تہذیب کی اشاعت کا جو طریقہ انھوں نے ایجاد کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کو جہالت و افلاس، غلامانہ کمینگی اور بے دینی و ضمیر فروشی کے جواہر سے مالا مال کر دیتی ہے اور "نوع بشری" کی خدمت کے لئے ان کی بہترین کوششوں کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب ان کی بھیڑی قومیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر دنیا کے امن و امان کو غارت کر دیتی ہیں۔

مسلمانوں کا فلسفہ:۔ اسلام کی مقدس تعلیم اس جہانگیری کے عیب سے پاک ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے۔ کہ حکومت و بادشاہی صرف اللہ کے لئے ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ بندوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ کے غلاموں کو اپنا غلام بنائیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ اللہ کے نائب و خلیفہ کی حیثیت سے اس

کے بندوں کی خدمت و اصلاح کریں۔ اور حکومت و اقتدار کی ان لذتوں کے فریب میں نہ آئیں جن کے لالچ میں انسان اس کے حصول کی کوشش کرتا ہے مسلمانوں کا خلیفہ عام مسلمانوں کے مقابلہ میں کسی ما فوق البشر ہستی کا مالک نہیں اس کی حیثیت کا اندازہ آنحضرت صلعم کے مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کی اس تقریر سے لگائیے جو آپ نے قیصر روم کے دربار میں اپنے خلیفۂ وقت کی نسبت کی تھی۔ آپ نے فرمایا "ہمارا سردار ہم میں کا ایک فرد ہے۔ اگر ہماری مذہب کی کتاب اور ہمارے پیغمبر صلعم کے طریقہ کی پیروی کرے تو ہم اس کو اپنا سردار باقی رکھیں اور اگر ان کے سوا وہ کسی اور چیز پر عمل کرے تو ہم اس کو معزول کردیں اگر وہ چوری کرے تو ہاتھ کاٹیں، اور اگر زنا کرے تو سنگسار کریں اور اگر وہ کسی کو گالی دے تو اس کو مناسب سزا دیجائے، اگر وہ کسی کو زخمی کرے تو اس کا بدلہ دینا پڑے۔ اور وہ ہم سے چھپ کر پردہ میں نہیں بیٹھتا۔ وہ ہم سے غرور نہیں کرتا۔ مال غنیمت میں اپنے آپ کو ہم پر ترجیح نہیں دیتا وہ ہم میں ایک معمولی آدمی کا درجہ و رتبہ رکھتا ہے"

اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا بادشاہ یا حکمران جاپانیوں کے بادشاہ کی طرح نہ تو ان کا خدا ہے اور نہ ہندو بھائیوں کے راجہ مہاراجاؤں کی طرح ان کا ان داتا۔ وہ رعیت کے عام افراد سے نہ کوئی بالاتر ہستی ہے نہ وہ اپنے آگے کسی سے گردن جھکوا سکتا ہے نہ ناحق کسی کے خلاف ایک حبہ لے سکتا ہے اور نہ ایک چپہ بھر زمین پر قبضہ کر سکتا ہے۔ اس پر ہر وقت یہ خوف غالب رہتا ہے کہ اس کے اعمال کا سخت حساب لیا جائے گا۔ اور اگر حرام کا ایک حبہ۔ جبر سے لی ہوئی زمین کا ایک چپہ، ظلم و بے انصافی کا ایک ذرہ اور ہوائے نفسانی کی بندگی کا ایک شائبہ بھی اس کے حساب میں نکل آیا تو اسے اس کی

سزا بھگتنا پڑے گی۔ یہ اسلام کا صرف دعویٰ ہی نہیں بلکہ شارع اسلام اور آپ کے خلفاء راشدین نے اس کا عملی نمونہ [1] دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

طریق انتخاب و طریق کار: مسلمانوں کے خلیفہ یا بادشاہ کی پوزیشن و حیثیت سمجھ لینے کے بعد اس کے طریق انتخاب کے بارے میں اتنا جان لینا کافی ہے کہ اسلام میں سلطنت و حکومت کسی خاص خاندان اور کسی مخصوص قبیلہ کا حق نہیں ہے اگر واقعات کو جھٹلایا نہ جائے اور ذرا فراخدلی سے کام لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اسلام ہی وہ سب سے پہلا مذہب ہے جس نے وراثتی شخصی سلطنت کی لعنت کو دنیا سے مٹایا اور یہ بتایا کہ حکومت و سلطنت امانت ہے جو تمام لوگوں کی طرف سے ایک شخص کو سپرد کی جاتی ہے جب وہ شخص فوت ہو یا معزول کیا جائے تو اس کی جگہ پھر تمام سمجھدار لوگ کسی دوسرے شخص کو منتخب کر کے قائم کر دیں اس طرح نہ دنیا میں کوئی شاہی خاندان موجود ہو سکتا ہے نہ کوئی فرمانروا اپنے بیٹے کو ولیعہد بنانے کا خیال اپنے دل میں لا سکتا ہے ساتھ ہی اس بات کو بھی لازمی قرار دیا ہے کہ ہر خلیفہ تمام اہم امور سلطنت میں لوگوں سے مشورہ ضرور کرے اور ایک مجلس شوریٰ سلطنت کے کاموں میں ہمیشہ خلیفہ کو مدد دیتی رہے۔

اس لحاظ سے اسلامی جمہوریت ایک مکمل جمہوریت ہے اور اتنی ہی مکمل جتنی کوئی جمہوریت مکمل ہو سکتی ہے۔ البتہ جو چیز اسلامی جمہوریت کو مغربی جمہوریت سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کا نظریہ سیاسی "جمہوری حاکمیت" کا قائل ہے اور اسلام "جمہوری خلافت" کا۔ وہاں جمہور خود بادشاہ ہیں اور یہاں بادشاہی خدا کی ہے اور جمہور اس کے خلیفہ ہیں۔ وہاں اپنی شریعت جمہور آپ

---

[1]: ۔ تاریخ کے صفحات اسوۂ حسنہ سے بھرے ہیں۔ یہاں نمونہ کے طور پر صرف ایک دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں

بناتے ہیں یہاں ان کو اس شریعت کی پابندی کرنی ہوتی ہے جو خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ دی ہے۔ وہاں حکومت کا کام جمہور کا منشاء پورا کرنا ہوتا ہے یہاں حکومت

---

(۱) حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مغیرہ بن شعبہؓ والی بصرہ کی شکایت آتی ہے کہ ان سے ایک عورت کا ناجائز تعلق ہے۔ حضرت عمرؓ یہ خبر سنتے ہیں ابوموسیٰ اشعری کو حکم دیتے ہیں کہ بصرہ میں شیطان نے آشیانہ بنالیا ہے تم وہاں جاکر گورنری کا جائزہ لے لو اور مغیرہ کو گواہوں سمیت مدینہ بھیجو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مدینہ میں آکر مقدمہ پیش ہوا چونکہ الزام غلط ثابت ہوا اس لئے مغیرہ کو رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے وقت حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر واقعہ سچا ثابت ہو جاتا تو میں یقیناً آپ کو سنگسار کر دیتا" یہ مغیرہؓ آنحضرت صلعم کے جلیل القدر صحابی اور عرب کے چار مشہور ترین مدبروں میں سے ایک تھے اسلام کی بڑی بڑی جنگی و سیاسی خدمات انجام دی تھیں۔ مگر ان کی عظمت و عزت بیش قیمت خدمات۔ گورنری کی اعلیٰ پوزیشن۔ غرض کہ کوئی بھی چیز ان کے کام نہ آئی۔ اور ایک معمولی مجرم کی طرح عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ دنیاوی حکومتوں میں کسی افسر کا بدکاری کرنا اس کا شخصی معاملہ سمجھا جاتا ہے بلکہ آجکل کی مہذب حکومتوں کے قوانین میں طرفین کی رضامندی سے زنا بھی جائز ہے۔ لیکن جس حکومت الہیہ کا اصلی مقصد انسانیت کی اصلاح اور امر بالمعروف نہی عن المنکر تھا اس میں کسی ایسے شخص کی غلطی کوئی گنجائش نہ تھی جس کا ذاتی عمل درست نہ ہو۔ (الجہاد فی الاسلام صفحہ ۱۰۸ بحوالہ طبری، ابن اثیر و بلاذری)

(۲) خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کی زرہ جبکہ وہ جنگ صفین کے لئے جا رہے تھے راستہ میں کھو گئی۔ واپسی میں وہی زرہ کوفہ کے ایک یہودی کے پاس پائی جاتی ہے آپ مدعی کی حیثیت سے قاضی شریح کی عدالت میں پیش ہو کر استغاثہ دائر کرتے ہیں اور ثبوت کے لئے اپنے غلام قنبر اور اپنے بیٹے امام حسنؓ کو پیش فرماتے ہیں قاضی نے دونوں کی شہادت قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ انہیں سے ایک انکا غلام تھا اور دوسرا انکا بیٹا اس لئے دونوں کی شہادت قانون کی رو سے ناقابل قبول تھی۔ عدل کا یہ عالم دیکھ کر یہودی مسلمان ہو گیا۔

(الجہاد صفحہ ۱۱۱ بحوالہ سیوطی)

اور اس کے بنانے والے جمہوریت کا کام خدا کا منشاء[1] پورا کرنا ہوتا ہے مختصرًا یہ کہ مغربی جمہوریت ایک مطلق العنان خدائی ہے جو اپنے اختیارات کو آزادانہ استعمال کرتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی جمہوریت ایک پابند آئین بندگی ہے جو اپنے اختیارات کو خدا کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرتی ہے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ خلیفہ عام مسلمانوں سے کوئی بالاتر ہستی نہیں ہے لیکن حکومت کے فرائض کی ادائیگی و نیز گوناگوں ذمہ داریوں کے اعتبار سے وہ بڑی اہمیت کا مالک ہے۔ اسے بیت المال کا انتظام کرنا پڑتا ہے بیت المال میں جو روپیہ یا مال جمع ہوتا ہے وہ رعایا کا مشترکہ خزانہ ہے خلیفہ کو اپنی ذات یا اپنی ذاتی خواہشات کیلئے بیت المال سے کچھ بھی خرچ کرنے کا اختیار نہیں۔ اس کی حیثیت محض امین یا مہتمم کی ہوتی ہے وہ مخلوق خدا کی فلاح و بہبود کے لئے اس خزانہ کو خرچ کرتا ہے۔ بیت المال میں جس طرح مسلمانوں کو زکوٰۃ و عشر کا روپیہ جمع کرنا ضروری ہے اسی طرح غیر مسلموں کو بھی ایک معمولی ٹیکس جزیہ کے نام سے ادا کرنا پڑتا ہے۔ غیر مسلموں کو اس ٹیکس کے علاوہ اور کوئی ٹیکس ادا کرنا نہیں پڑتا لیکن

---

[1] خدا نے اپنے منشاء کو کلام پاک میں صاف طور سے بتا دیا ہے کہ وہ (انسان) ان بھلائیوں کو قائم کرے اور فروغ دے جن سے خداوند عالم زندگی کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے اور ان برائیوں کو روکے دبائے اور مٹائے جن کا وجود انسانی زندگی میں خداوند عالم کو پسند نہیں۔ اسلام میں ریاست کا مقصد کسی خاص قوم کی اجتماعی خواہشات کا پورا کرنا نہیں ہے بلکہ وہ اس کے سامنے ایک بلند نصب العین رکھ دیتا ہے جس کے حصول میں اسکو اپنے تمام وسائل و ذرائع اور اپنی تمام طاقتیں صرف کرنی چاہئیں اور وہ یہ ہے کہ خدا اپنی زمین پر اپنے بندوں کی زندگی میں جو پاکیزگی، جو حسن، جو خیر و صلاح، جو ترقی و فلاح دیکھنا چاہتا ہے وہ رونما ہو اور بگاڑ کی ان تمام صورتوں کا سدباب ہو جو خدا کے نزدیک اس کی زمین کو اجاڑنے والی اور اس کے بندوں کی زندگی کو خراب کرنے والی ہیں۔

مسلمانوں کو زکوٰۃ و عشر کے علاوہ صدقات اور ضرورت کے وقت بڑے بڑے چندے ادا کرنے پڑتے ہیں مسلمان فوجی خدمات کرنے پر مجبور ہیں اور زکوٰۃ وغیرہ سے کبھی معاف نہیں کئے جا سکتے۔ لیکن غیر مسلم اگر اپنی خوشی سے فوجی خدمات ادا کرنے پر آمادہ ہوں تو جزیہ معاف ہو جاتا ہے۔

۱۷۔ غیر مسلموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے جان و مال کو اس لئے زیادہ خرچ کیا جاتا ہے کہ یہ نوع انسان کی فلاح و بہبود کے زیادہ خواہاں اور امن و امان کی قدر و قیمت پہچاننے کے سبب اس کے قیام کے زیادہ ذمہ دار ہیں اعانت حق کیلئے جس طرح اللہ نے ان کی جانوں کو خرید لیا ہے اسی طرح ان کی دولت کو بھی اپنے لئے خرید کر محفوظ کر لیا ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان کو اپنے جان و مال پر قطعی اختیار نہیں وہ دونوں کا امین ہے وہ امانت میں خیانت نہیں کر سکتا اس کو یوں سمجھئے کہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے راستوں اور طریقوں کے علاوہ کسی دوسرے راستے یا طریقہ پر نہ اپنی جان قربان کر سکتا ہے نہ مال یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت میں نہ تو ناجائز طریقوں سے دولت کمائی جا سکتی ہے اور نہ ناجائز کاموں میں دولت کو صرف کیا جا سکتا ہے ناجائز نفع بازی جو آجکل کی سرمایہ دارانہ نظام کی جان ہے اسلام نے اسکو قانوناً روک دیا رشوت کو جو انسان کے لئے بلا استحقاق آمدنی ہے ناجائز قرار دیا۔ تجارت کی ترغیب دی لیکن سود خوری کو اس لئے ممنوع قرار دیا کہ اس میں بہت سی اخلاقی و اقتصادی مضرتیں مضمر ہیں سود خوری سے انسان کی باہمی محبت و مہربانی و ہمدردی کی صفت حسنہ معدوم ہو جاتی ہے۔ بے محنت دولت کمانے سے انسان آرام طلب، بزدل اور نکما ہو جاتا ہے سود خوری کے رواج سے ملک کی تمام دولت بتدریج سمٹ کر ایک محدود گروہ کے قبضہ میں آ جاتی ہے۔ اور باقی لوگوں کو ظالمانہ طور پر افلاس میں مبتلا ہونا پڑتا ہے غلہ یا دوسری ضروریات زندگی کی چیزوں کو گرانی کے انتظار میں فروخت نہ کرنے اور روکے رکھنے کو بھی اسلام نے منع کیا ہے کیونکہ اس سے صرف ایک شخص کو فائدہ پہونچتا ہے اور باقی تمام لوگوں کو اس سے اذیت ہوتی ہے اسی طرح قمار بازی اور شراب خوری کو بھی اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے کیونکہ ان چیزوں سے بہت سے فتنے اور فسادات پیدا ہوتے ہیں۔ (باقی صفحہ ۴۱ پر)

خلیفہ جس طرح مسلمانوں کو نماز روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ عبادات پر قائم رکھتا ہے اور ان چیزوں کو ادا کرنے کا اہتمام کرتا ہے اسی طرح غیر مسلموں کے اخلاق کی درستی اور اس کی نگہداشت بھی کرتا ہے لوگوں کو پُر امن زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور تمام بےحیائی کے کاموں کو روکتا ہے۔ ملک کو اندرونی و بیرونی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے فوج و پولیس کا انتظام کرتا ہے وہ عدل و انصاف قائم کرتے وقت مسلم و غیر مسلم میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں عدالت انتظامی حکومت کے ماتحت نہیں ہے بلکہ براہ راست خدا کی نمائندہ اور اسی کو جوابدہ ہے۔ حاکمانِ عدالت کو مقرر تو انتظامی حکومت ہی کرتی ہے مگر جب ایک شخص عدالت کی کرسی پر بیٹھ جائے گا تو وہ خدا کے قانون کے مطابق لوگوں کے درمیان بےلاگ انصاف کرے گا اور اس کے انصاف کی زد سے خود حکومت بھی نہ بچ سکے گی حتیٰ کہ خود حکومت کے رئیس اعلیٰ کو بھی مدعی یا مدعا علیہ کی حیثیت سے اس کے سامنے اسی طرح حاضر ہونا پڑے گا جیسے ایک عام شہری حاضر ہوتا ہے۔ ن

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۸۰: بہر حال اس قسم کے احکام و قوانین کا منشا یہ ہے کہ سوسائٹی کا معیار ہر لحاظ سے بلند رہے اور اندر یا باہر سے جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں یا پیدا ہونے کا امکان ہے انھیں سختی سے روکا جائے۔

باب اوّل

ہندوستان میں آمد کے وقت اسلامی سوسائٹی کا رنگ

پچھلے صفحات میں جن اصولوں کا جائزہ لیا گیا ہے ان سے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جس اسلامی سوسائٹی سے ہندوستان کو واسطہ پڑا آیا وہ ان تمام اصولوں کو صحیح مان کر ان پر عمل پیرا تھی یا اس کا طریق عمل کچھ اور تھا یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے اس کا حل ہم اس لئے اور بھی زیادہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کی روشنی میں ہندوستان کے مسلم سلاطین کے اعمال و کردار کا جائزہ لیکر ہندوستان کی تاریخ میں ان کا صحیح درجہ متعین کیا جا سکے نیز اس کو پڑھ کر ذہن ان اثرات کو قبول یا رد کرنے کے لئے تیار ہو سکے جو اس عہد کی اسلامی سوسائٹی سے ہندوستان کی تہذیب و معاشرت نیز سیاسی اور سماجی زندگی پر مترتب ہوئے۔ آسانی کی غرض سے اس کو چند عنوانات میں تقسیم کر لیا گیا ہے جن کو یکے بعد دیگرے بیان کیا جاتا ہے۔

فصل اوّل۔ اسلامی شریعت (فقہ و تصوف)

(۱۔) قانون شریعت:۔ یہ تو ظاہر ہے کہ نبی کریم صلعم کے وصال کے بعد آپ کی تربیت یافتہ جماعت (یعنی صحابۂ کرام) بدستور اسلامی اصولوں کو عملی جامہ پہناتی رہی ۔ اور ۳۰ سال کے اندر اندر آپ کی دعوت کو مشرق سے لیکر مغرب تک عام کر دیا۔ آپ کی بعثت کا مقصد ہی یہ تھا کہ عالم انسانی کو ایک ایسا حیات پرور اور ایمان افزا نظام عمل دیں جو سب نظاموں سے بہتر و اعلیٰ ہو آپکی بعثت کا

یہ مقصد اس صورت میں پورا ہوا کہ قیصر و کسریٰ کا نظام جو ایک مدت تک ساری دنیا پر حاوی تھا پاش پاش ہوگیا اور انسانیت کو قیصریت و کسرویت دونوں سے نجات مل گئی۔ کلیلہ و دمنہ کے مصنف ایرانی حکیم برزویہ نے اسوقت ایران کی جو حالت تھی اس کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے صداقت سے ہاتھ اٹھا لیا ہے جو چیز مفید ہے وہ موجود نہیں اور جو موجود ہے وہ مضر ہے جو چیز اچھی ہے وہ مرجھائی ہوئی ہے اور جو بری ہے وہ سرسبز ہے۔ دروغ کو فروغ ہے اور نیکی بے رونق ہے علم پستی کے درجہ میں ہے۔ اور بے عقلی کا درجہ بلند ہے۔ بدی کا بول بالا ہے اور شرافت نفسی پامال ہے۔ محبت متروک ہے اور نفرت مقبول ہے۔ فیض و کرم کا دروازہ نیکوں پر بند ہے اور شریروں پر کھلا ہوا۔ حکام کا فرض صرف عیاشی کرنا[1]۔ اور قانون کو توڑنا ہے مظلوم اپنی ذلت پر قانع ہے اور ظالم کو ظلم پر فخر ہے۔ حرص اپنا منہ کھولے ہوئے ہے۔ اور دور و نزدیک کی ہر چیز کو نگل رہی ہے تسلط لائقوں سے نالائقوں کی طرف منتقل ہوگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مسرت کے نشہ میں یہ کہہ رہی ہے کہ میں نے نیکی کو مقفل اور بدی کو رہا کر دیا ہے"[2]

کم و بیش یہی حالت روم کی تھی۔ اسلام کے عدل پرور اور اخوت و مساوات پر مبنی اصولوں نے اس قسم کے فرسودہ نظام حیات کے بجائے جو انسانیت کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا ایک نیا نظام نافذ کیا جس کی وجہ سے لوٹ کھسوٹ

---

[1]:۔ عجم و روم کے شاہنشاہ اس قدر تعیش میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اگر ان کا کوئی درباری لاکھ روپے سے کم قیمت کی ٹوپی یا کمربند پہنتا تو اسے ذلیل سمجھا جاتا تھا۔

(حجۃ اللہ البالغۃ ص۱۰۵)

[2]:۔ ماخوذ از مولانا عبید اللہ سندھی ص۲۲۲

فصل دوم۔ ہندوستان میں آنے سے پہلے مسلمانوں کی علمی ترقیاں

علمی ترقیات:۔ دنیا میں کوئی قوم اس امر کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ علم و ہنر کی شمع اسی کے دم سے روشن ہوئی۔ ہے نیز یہ کہ علم و ہنر اسی کے دامن دولت سے وابستہ رہے ہیں تعصب کی بات تو دوسری ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ہر آنیوالی جماعت نے اپنی پیشرو جماعت کے حاصل کردہ علوم و فنون کو اپنا کر انھیں آگے بڑھایا ہے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا ہے اور آئندہ بھی رہیگا۔ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ دنیا نے مصر و بابل، چین، ہندوستان یونان و روما کی روشن کی ہوئی علم و ہنر کی شمع سے روشنی پائی ان کا دور ختم ہونے کے بعد یہ سعادت عرب کے حصہ میں آئی کہ وہ دنیا کا امام بنے اور اس کی صحیح رہنمائی کرے۔

عربوں نے دنیا کی تمام متمدن اقوام کے علوم کو اپنایا۔ ان میں ہند و یونان کا تحصیل اور روم و عجم کا ملک و سلطنت یہ دونوں چیزیں فطرتاً موجود تھیں یہی وجہ تھی کہ وہ بہت جلد اہل قلم اور اہل سیف ہو گئے انھوں نے برسوں میں وہ ترقی کی جو دوسری اقوام نے صدیوں میں نہیں کر پائی۔

علوم کے لحاظ سے بعض وہ علوم ہیں جو خالص اسلامی ہیں مثلاً تفسیر و حدیث فقہ و قرأت، اصول علم الرجال وغیرہ اور بعض وہ ہیں جو دوسری زبانوں سے عربی میں منتقل کئے گئے مثلاً طب و ہندسہ، نجوم و ہیئت، فلسفہ و منطق طبعیات و کیمیا وغیرہ۔ مسلمانوں نے خلفاء بنو امیہ و بنو عباس کے زیر سایہ ان سب کو مدوّن کیا اور دوسروں تک پہونچایا۔ چنانچہ یعقوب ابن اسحاق کندی[2] کی وہ تصانیف جو منطق میں

---

[1] ۔ عربوں نے سندھ و ملتان میں [illegible] سے لیکر [illegible] تک حکومت کی اس عرصہ میں ان کے ہندوستان سے جو علمی سیاسی تعلقات رہے اس کا تفصیلی تذکرہ جلد اوّل کے آخری دو ابواب میں کیا جا چکا ہے اس لئے اس جگہ اس کا اعادہ بیکار ہے (مولف) (۲) یعقوب بن اسحاق کندی مسلمانوں کا سب سے پہلا مشہور فلاسفر ہے

(بقیہ صفحہ ۵۸ پر ملاحظہ ہو)

اور عبدالملک اندلسی[۱] کی طبی تصانیف بھی یورپ میں بہت مقبول ہوئیں
حکیم بو علی سینا کی "القانون" پندرھویں صدی کے ربع آخر میں یورپ
کے اندر سولہ مرتبہ شائع ہوئی پھر سولھویں صدی میں ۲۰ بار سے زائد۔ اٹھارھویں
صدی کے نصف اوّل تک تمام اطبا ء یورپ کا اسی پر عمل رہا۔ اسی طرح ۱۷۵۸ء
میں ابن بیطار کی مفردات شائع ہوئی۔ اس میں ۱۴۰۰ مفردات کا حال ۱۲۵ عربی
حکماء کے پچھلے تجربات کے ساتھ قلمبند ہے۔ ابوالہیثم اور علی بن عیسٰی کے بنائے
ہوئے آنکھ کی جراحی کے آلات و نشتر ۱۷۸۰ء تک انگلینڈ میں اور ۱۸۴۲ء تک
جرمنی میں مستعمل رہے۔

کشف الظنون، طبقات الاطباء اور تراجم الحکماء کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے
کہ مسلمان اطباء کا شمار لاکھوں سے متجاوز ہے۔ ان میں جراح بھی ہیں اور کحال
و دندان ساز بھی طبیبوں کے امتحان کا قاعدہ بھی مسلمانوں نے ہی مقرر کیا۔[۲] انھوں
نے بیشمار طبی ایجادیں کیں اور قدماء کے بہت سے علاجوں کو غلط ثابت کیا مثلاً
فالج، لقوہ، استرخاء کا علاج گرم دوائیوں سے کیا جاتا تھا انھوں نے ٹھنڈی
دوائیاں استعمال کرائیں اور حیرت انگیز نتائج برآمد کئے۔ شیخ ابومنصور بغدادی اس
طریق علاج کا بانی ہے۔ اسی طرح جراحت پر داغ دینے کا طریقہ، یرقان کا علاج،
جنون کے علاج میں افیون کا استعمال یہ سب انھیں کی ایجادیں ہیں۔ اس کے
علاوہ طب کی بعض چیزوں مثلاً جذام و خارش وغیرہ پر ایسی کتابیں لکھیں جو اس سے
پہلے کبھی نہیں لکھی گئی تھیں۔

۱۔ عبدالملک اندلسی نے چھٹی صدی ہجری میں ابن رشد فلسفی کے نام پر ایک کتاب لکھی جو انگریزوں
میں خاص طور سے نہایت مقبول ہوئی۔

۲۔ عیون الانباء ص ۲۲۲ جلد اول، علماء سلف ص ۵۹

کیمیا (Chemistry) اور نباتات (Botany) یہ دونوں
طب کی بہت بڑی شاخیں ہیں مسلمانوں کو ان دونوں سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اس
کی ابتدا یحییٰ برمکی کے زمانہ سے ہوئی مسلمان ہندو فارس تک سے مفرد دوائیں
تلاش کر کے لاتے اور ان سے مرکبات تیار کرتے تھے پہلی قرابادین سابور ابن
سہل المتوفی ۲۵۵ھ نے لکھی اس کے بعد دوسری سب سے مشہور قرابادین امین الدولہ
نے چھٹی ہجری میں لکھی[1]۔ ادویہ کی دوکانداری کا طریقہ بھی سب سے پہلے مسلمانوں
ہی کی ایجاد ہے۔ اسی طرح کیمیاء جدید کے بانی بھی مسلمان ہی ہیں۔ انھوں نے بہت
سی ایسی کیمیاوی دوائیں ایجاد کیں جو اس زمانہ میں بھی نہیں ہیں۔ ابن اثیر لکھتا ہے
کہ ایک ایسا روغن ایجاد کیا گیا تھا جس کے لگا دینے سے لکڑی آگ سے محفوظ
رہتی تھی[2]۔ بارود بھی انھیں کی ایجاد ہے ۱۳۴۲ء میں الجسر کی حفاظت کے لئے
انھوں نے الفانسو یازدہم کے مقابلہ میں پہلی مرتبہ بارود اور توپ کا استعمال کیا[3]
میر فتح اللہ شیرازی ان دونوں چیزوں کا موجد ہے۔ مسلمانوں کے ایجادات کی فہرست
نہایت طویل ہے۔ نمونتاً چند ایک کا ذکر فٹ نوٹ میں درج ہے[4]۔

۱۔ ۱۸۳۳ء میں عربی قرابادین کا خلاصہ یورپ میں شائع کیا گیا

۲۔ کامل ابن اثیر ص ۱۵۱ جلد ہفتم

۳۔ تمدن عرب ص ۴۳۵ از موسیو لیبان، اخبار الاندلس ص ۱۹۶ از مسٹر اسکاٹ

۴۔

نام موجد	نام ایجاد
یونس کاتب المتوفی ۶۵۰ھ	گھڑی: ابن الساعتی مشہور گھڑی ساز تھا
ابوالقاسم اندلسی	جہاز
ابوالحسن	دوربین
ابن الہیثم ۱۰۳۹ء	آلہ عکاسی یا فوٹوگرافی

(بقیہ صفحہ ۶۱ پر ملاحظہ ہو)

نجوم و ہیئت اور ہندسہ و حساب میں مسلمان ہند و یونان کے شاگرد ہیں۔ وہاں سے یہ علوم حاصل کر کے انھوں نے عام کر دئے۔ اسلام میں سب سے پہلا منجم ابو جعفر منصور ہے اُس کے لئے ۱۵۴ھ میں برہم گپت کی "برہم سپت سدھانت"

(بقیہ صفحہ ۶۰ ملاحظہ ہو)

محمد بن موسیٰ	کرہ
احمد محمود اصفہانی ۹۸۴ء	اصطرلاب کا موجد، ۱۰۰۰ء کے بنے ہوئے
	اصطرلاب میڈرڈ میں اب بھی موجود ہیں
ابو الصلت اُمیہ ۱۱۳۴ء	جر ثقیل، غرق شدہ جہاز کو نکالنے کا ایک آلہ بنایا تھا۔
یوسف بن عمر دمشقی	دمشقی کاغذ کا موجد
رشید الدین ابن رفیقہ	ایک پیالہ کا موجد جس کے بیچ میں ایک تیہ تھا اسپر ایک چڑیا بنی ہوئی تھی۔ پیالہ میں جب پانی ڈالا جاتا تھا تو چڑیا پھڑپھڑاتی اور بولتی تھی۔

اسی طرح آلہ عباد نما، مقیاس الحرارت، تھرماس، قطب نما، صابن، میز کرسی، آلات کیمیا و ہیئت و ریاضی وغیرہ سب کے سب مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ دسویں صدی عیسوی میں ایک نوجوان پادری گربرٹ نامی نے اندلس کے بعض شہروں کا چکر لگایا تو وہ وہاں کی حالت دیکھکر متحیر رہ گیا۔ اُس نے لاتعداد مدرسہ اور کتب خانے دیکھے جنمیں بیشمار سائنس کے آلات، جغرافیہ کے رنگین نقشے، گھومنے والے کرے، دھوپ گھڑیاں، پانی کی گھڑیاں، آب پیما، آلات رصدیہ، اصطرلاب وغیرہ موجود تھے۔ بالآخر وہ مسلمان علماء سے استفادہ کے لئے قرطبہ یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ (مسٹر جوزف میکیب ۹۹۹ تا ۱۰۰۳ء)۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب وہ اٹلی پہونچا تو اُسنے ایک مدرسہ کی طرح ڈالی لیکن یہ مدرسہ اور اسکے آلات سائنس پادریوں ... اور اسے متعصبوں کی جہالت کی نذر ہو گئے اور غالباً گربرٹ کو بھی زہر دیکر مار ڈالا گیا۔

کا "السند ہند" کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا گیا اسی طرح وراہ مہر اور آریہ بھٹ کی
کتابیں بھی عربی میں منتقل کرلی گئیں۔ حسن بن صباح، حسن بن خصیب، فضل بن حاتم تبریزی،
احمد بن عبداللہ اور ابو ریحان بیرونی وغیرہ نے اس کو فروغ دیا۔ نجوم و ہیئت کو اسپین میں
پانچویں صدی ہجری میں ابو القاسم اصبغ اور ابراہیم زرقانی کے ذریعہ فروغ حاصل ہوا۔
انھوں نے متعدد رصدگاہیں قائم کیں جن کے ذریعہ ستاروں کی حرکات و مقامات
کی جانچ کیجاتی تھی۔ پہلی رصدگاہ یونانیوں نے اسکندریہ میں قائم کی تھی مگر جب
مسلمانوں نے ترقی کی اور بغداد، دمشق، قاہرہ، اندلس، مراغہ اور سمرقند وغیرہ میں
متعدد رصدگاہیں بن گئیں تو اسکندریہ کو لوگ بھول گئے۔ دولت اسلامیہ میں اوّل
جس نے رصد خانہ کی بنیاد ڈالی اور بیش بہا آلات رصدیہ مہیا کئے وہ دولت عباسیہ
کا نامور خلیفہ مامون الرشید ہے اس کے زمانہ تک جس زیچ پر اعتماد کیا جاتا تھا وہ
محمد بن ابراہیم فزاری کی تالیف تھی لیکن نئی تحقیقات کے بعد مامون کے ایک بہت
بڑے منجم ابو جعفر محمد بن موسیٰ خوارزمی نے جو زیچ ترتیب دی اس کی شہرت نے
اوروں کا نام مٹا دیا۔ یہ زیچ تمام مستند زیچوں سے ماخوذ تھی۔ اوساط
ہندوستان کی زیچ کے مطابق رکھے، تعدیلیں فارس کی تحقیقات کے موافق تھیں
اور میل شمس میں بطلیموس کی رائے لی تھی اس کے ساتھ ترتیب و تقریب کے متعلق
خود پسند ایجادیں کی تھیں[1]۔ اس سے مسلمانوں کی ترقی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
ابتدائے اسلام میں مسلمان حساب و کتاب کو ذمیوں کا کام سمجھتے تھے وہ اپنی
اولاد کو فنون سپہ گری اور شاعری وغیرہ کی تعلیم دیتے تھے لیکن جب مختلف ضرورتوں
نے مجبور کیا تو ان کی طبیعتیں ادھر متوجہ ہوئیں اور پھر ابن قائم کا یہ مقولہ بہت مشہور
ہوا کہ "اپنے بیٹے کو کتاب سے پہلے حساب پڑھاؤ"۔ دوسری صدی ہجری میں ہندی قوم

---

[1] - المامون ص ۱۲۷ از علامہ شبلی نعمانی۔

وحساب کو انھوں نے عربی میں منتقل کیا پھر ان سے مغرب والوں نے سیکھا۔ جبر و مقابلہ میں وہ یونان کے شاگرد ہیں لیکن اس میں بھی وہ اُستادوں سے بڑھ گئے انھوں نے جبر و مقابلہ کے اُن اصولوں کو جو یونانی کتب میں تھے ناقابل اعتماد سمجھا اور خود اس فن میں اصول مرتب کئے چنانچہ ابو جعفر خوارزمی، ابو کامل، ابن اسلم، ابو حنیفہ دینوری اور ابو العباس سرخسی وغیرہ نے اس فن میں بیش بہا کتابیں لکھیں۔ اہل یورپ نے اپنی آخری اور موجودہ ترقی کے دور میں جبر و مقابلہ بالکل عربی سے لیا ہے۔ الجبرا میں خوارزمی سنہ ۸۲۴ء ایک نمایاں خصوصیت کا مالک ہے اس کی تصنیف کا ترجمہ ۱۸۳۱ء میں مسٹر الیف روزی نے کر کے یورپ کو روشناس کرایا۔ مسلمانوں ہی نے علم ہندسہ کی تحلیلی بنیاد ڈالی اور علم مثلث مستوی (Plane Trignometry) اور کروی (Spherical Trignometry) کو ایجاد کیا۔

دوسرے علوم و فنون کی طرح مسلمانوں نے موسیقی میں بھی کمال پیدا کیا۔ اس فن میں وہ ہند و یونان کے شاگرد ہیں لیکن آخر میں وہ سب سے گوئے سبقت لے گئے۔ انھوں نے ایسے الحان اور نغمے ایجاد کئے جو پہلے نہ تھے مثلاً بعض راگ ایسے تھے جن کو آدمی کھانا کھا کر نہیں گا سکتا تھا اور نہ سقہ مشک لیکر۔ اسی طرح بعض راگوں کو کوئی تکیہ لگا کر نہیں گا سکتا تھا یہاں تک کہ بیٹھ نہ جائے اور بعض راگوں کو کوئی بیٹھ کر نہیں گا سکتا تھا یہاں تک کہ کھڑا نہ ہو جائے۔ اسی طرح مختلف اقوام کے آلات نغم کو دیکھ کر انھوں نے بہت سے نئے آلات ایجاد کئے مثلاً فارابی فلسفی نے ساز قانون نکالا ایک دوسرا آلہ لکڑیوں کا بنایا تھا جو توڑ مروڑ کر جیب میں رکھ لیا جاتا تھا اور جس سے مختلف نغمے اور لحن پیدا ہوتے تھے[2]

---

[1] - آغانی صفحہ ۲ جلد اوّل

[2] - ابن خلکان صفحہ ۔۔ جلد دوم۔

طبقات ومغازی اور تاریخ وجغرافیہ ایک لحاظ سے مسلمانوں کے خود اپنے
مضامین ہیں جس وقت مسلمان قرآن، حدیث، تفسیر اور فقہ کی طرف متوجہ ہوئے
تو اُنھیں ضرورت محسوس ہوئی کہ اُن حالات اور مقامات کی بھی تحقیق کریں کہ جن میں
وہ آیتیں اُتریں یا احادیث بیان کی گئیں اس کے لئے انھوں نے سب سے پہلے
سیرت نبوی کو ترتیب دیا اس میں ان کو ایک لاکھ پچیس ہزار سوانح عمریاں لکھنا پڑیں[1]
اس طرح فن رجال کا ایک نیا شعبہ نکل آیا۔ جس کے ترتیب دینے میں وہ آپ اپنی
مثال ہیں۔ چنانچہ محمد بن سعد المتوفی ۲۳۰ھ کی طبقات الصحابہ جو دس جلدوں میں
ہے اسی فن کی ایک کتاب ہے۔ اس کے بعد ابن قتیبہ کی طبقات الشعراء ہے۔ اس
کے ساتھ ہی لوگوں نے وزراء، قضاۃ، اُمراء، عمال، حکام، اذکیاء، بخلاء، عشاق
وغیرہ کے حالات پر ضخیم کتابیں لکھ ڈالیں غرضکہ تیسری صدی ہجری کے وسط تک
اسی قسم کی تصانیف کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد تواریخ عامہ کی طرف میلان
ہوا۔ اس فن کی سب سے پہلی کتاب ابن واضح ہے جو یعقوبی کے نام سے بھی
مشہور ہے یہ دو جلدوں میں ہے[2] پہلی میں اقوام عالم کا حال اور دوسری میں
ابتداء اسلام سے لیکر معتمد باللہ عباسی کی تخت نشینی (۲۵۶ھ) تک کے حالات
درج ہیں۔ اس کے بعد اور تاریخیں لکھی گئیں جن میں سب سے زیادہ مشہور
طبری، مروج الذھب، اخبار الزمان اور سنی ملوک الارض وغیرہ ہیں۔ خلافت

یہ سن غلط معلوم ہوتا ہے

---

[1] ۔ کشف الظنون صفحہ ۲۷۰ جلد دوم

[2] ۔ یہ بیان علامہ جرجی زیدان کا ہے۔ راقم الحروف کی نظر سے تاریخ یعقوبی کی تین جلدیں گذری ہیں یہ مطبعہ الغری نجف سے ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوئیں اور علامہ حبیب الرحمن خاں شروانی کے کتب خانہ حبیب گنج میں محفوظ ہیں۔ دوسری اور تیسری جلدیں زائد کار آمد ہیں دوسری جلد ۲۲۷ اور تیسری ۲۳۲ صفحات (علاوہ فہرست) (باقی صفحہ ۶۵ پر)

(باقی صفحہ ۶۵ پر)

عباسیہ کا شیرازہ منتشر ہونے کے بعد جب کردوں، ترکوں اور بربریوں کی سلطنتیں قائم ہوئیں تو ان کے حالات پر الگ کتابیں لکھی گئیں۔ یہ تاریخ کا دوسرا دور ہے اسی میں صدہا کتابیں تاریخ پر عربی و فارسی میں لکھی گئیں جن کا شمار حد سے باہر ہے۔ صاحب کشف الظنون نے ۱۳۰۰ تصنیفیں شمار کی ہیں جنہیں خلاصے اور شرح شامل نہیں اور جو کتابیں ضبط تحریر میں نہیں آئیں وہ اس تعداد سے کہیں زائد ہیں۔ کیونکہ تاریخ و جغرافیہ کی کتابوں کے مقدمات میں ایسی کتابوں کا حوالہ ملتا ہے جنکو صاحب کشف الظنون نے تحریر نہیں کیا مثلاً مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذھب میں بیسیوں ایسی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں جو اس کے زمانے میں تھیں مگر اس فہرست میں ان میں سے صرف ایک آدھ کتاب نظر آتی ہے۔ ○

مسلمانوں کو جغرافیہ میں یونان و روما سے گنتی میں لے دے کر صرف دو چار کتابیں ہاتھ لگی تھیں۔ بطالسہ یعنی خاندان بطلیموس نے جو مصر کے حکمران تھے بحر احمر اور حبشہ کے حالات قلمبند کرائے۔ یونانیوں میں اراٹستین نے (المتوفی ۱۹۶ ق م) اور بلینوس نے ۵۰ء میں جغرافیہ لکھا۔ موخر الذکر نے ۳۵۰ شہروں کا ذکر کیا۔ متمدن دنیا میں اسلام سے پہلے جغرافیہ کی بس اتنی سی کائنات تھی۔ اہل اسلام نے ان کتابوں کے دیکھنے سے پہلے ہی جغرافیہ کی تدوین شروع کر دی تھی۔ کیونکہ فاتح اور تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں حج کے لئے سالانہ سفر

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۶۶ ملاحظہ ہو)

۳ع - ابن جریر المتوفی ۳۱۰ھ نے بترتیب ۳۰۲ھ تک کے حالات لکھے ہیں کئی جلدیں ہیں۔

۴ع - مروج الذھب اور اخبار الزمان مسعودی کی جو ۳۴۶ھ میں بقید حیات تھا تصانیف ہیں۔
مروج الذھب کی ترتیب دول اور اقوام پر رکھی گئی ہے۔ اخبار الزمان ضائع ہو گئی یہ مروج الذھب سے زیادہ ضخیم تھی۔

۵ع - حمزہ اصفہانی نے ۳۵۰ھ میں ترتیب دی۔

کرنا پڑتا تھا اسلئے راستہ کے حالات جاننا ازبس ضروری تھے۔ چنانچہ شہروں اور راستوں کے حالات میں اصمعی اور سکونی نے کتابیں لکھیں۔ بعد کو ہمدانی اور ابوالاشعث نے حجاز و عرب کے حالات پر کتابیں لکھیں۔ غرضکہ چوتھی ہجری کے اختتام تک وہ جغرافیہ کے فن کو مکمل کر چکے تھے اسی زمانہ میں ابوزید بلخی نے صور الاقالیم ۲۰ جلدوں میں لکھی افسوس ہے کہ وہ آج دستیاب نہیں۔ اس کے ہمعصر ابواسحاق کرخی نے مسالک الممالک لکھی جو طبع ہو گئی ہے۔ جغرافیہ کی دیگر کتابیں ابن حوقل، مسعودی، مقدسی، ابن فقیہہ ہمدانی وغیرہ نے لکھیں لیکن اِس فن میں سب سے مشہور کتابیں یاقوت حموی کی معجم البلدان اور ابوالفداء کی تقویم البلدان ہیں۔ یہ جغرافیہ کی قاموس خیال کیجاتی ہیں۔

اہل علم کی ہمّت افزائی۔ مسلمانوں کے اتنی عجلت کے ساتھ علمی میدان میں ترقی کرنے کا سب سے بڑا سبب خلفاء اسلام کی وہ قدرشناسی و ہمّت افزائی ہے جو بلالحاظ قومیت و مذہب اور وطن و نسل اپنے اور پرائے تمام اقوام کے علماء کے ساتھ عام تھی۔ ان میں مسلمان یہودی، مجوسی، سامری، نصرانی، صابی اور ہندو سبھی شامل ہیں۔ منصور عبّاسی کے دربار میں یہودی، نصرانی اور ہندو طبیب بھی تھے[1]۔ ہارون الرشید نے اپنے نصرانی طبیب جبریل بن بختیشوع کے لئے عرفات میں دُعا مانگی[2]۔ ہارونی و مامونی فیاضیوں نے مال و دولت کے لحاظ سے اس کو ایک مستقل والیِ ملک بنا دیا تھا علّامہ ابن ابی اصیبعہ نے اپنی تاریخ میں اس کی آمدنی و مصارف کا ایک مفصل نقشہ نقل کیا ہے اس کی

ع[1] ۔ علوم عرب جلد سوم صفحہ ۱۲۱ از علامہ جرجی زیدان

ع[2] ۔ طبقات الاطباء صفحہ ۱۳۳ جلد اوّل

مستقل آمدنی علاوہ انعام و اکرام کے جس کا کچھ شمار نہیں ۵۰ لاکھ درہم سالانہ تھی[1]۔ اس کا بیٹا بختیشوع جاہ و منزلت کے اِس پایہ تک پہونچا کہ لباس و آرائش میں خلیفہ متوکل باللہ کا ہمسر گنا جاتا تھا[2]۔ ہارون و مامون علماء کی جیسی عزت کرتے تھے وہ ظاہر ہے اُن کے دربار میں ہندو علماء و حکماء بھی تھے جن کا تذکرہ جلد اوّل میں کیا جا چکا ہے۔ متوکل اور مہدی بھی اطباء کی بڑی عزت کرتے تھے جب وہ دربار میں آتے تو خلیفہ کی مسند پر جگہ پاتے تھے[3]۔ خلیفہ معتضد باللہ کے دربار میں جہاں تمام وزراء و اُمراء دست بستہ کھڑے رہتے تھے صرف وزیر اعظم اور ثابت بن قرہ کو بیٹھنے کی اجازت تھی۔ ثابت بن قرہ ایک صابی المذہب عالم تھا ایک دن معتضد اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہل رہا تھا کہ دفعتاً اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ثابت ڈر گیا۔ معتضد نے کہا "ڈرو نہیں۔ میرا ہاتھ اوپر تھا اور میں اس کو سوء ادب سمجھتا ہوں کہ میرا ہاتھ اہل علم کے ہاتھ کے اوپر ہو[4]۔ علماء و حکماء کے ساتھ یہی کیفیت دولت فاطمیین اور خلفاء اندلس کی تھی اور انھیں روایات کو ہندوستان میں غزنوی، غوری اور ان کے جانشینوں نے جاری رکھا۔

شوق طلب اور توجہ کامل ۔ سطور بالا کے مطالعہ سے کہیں یہ باور نہ کر لیا جائے کہ مسلمانوں کی علمی ترقی تمام تر خلفاء و اُمراء کی داد و دہش اور حوصلہ افزائی پر مبنی تھی۔ اس زمانہ کے بزرگوں کی جاں کاہیوں کو نظر انداز کر کے اُن کے علمی کمالات کو محض اس زمانہ کے آثار کا ثمرہ سمجھ لینا حقیقت کے صرف ایک رُخ کا مطالعہ ہے اگر سچ پوچھو تو اس زمانہ میں لوگوں کے اندر عزم و ثبات

---

[1] ۔ المامون حصہ دوم ص۱۰۳؛ [2] ۔ المامون ص۱۰۱ جلد دوم

[3] ۔ ابوالفرح ص۲۴۹

[4] ۔ المامون ص۱۰۱ جلد دوم

میل کا پیادہ پا سفر کیا۔ امام ابوحاتم رازی نے اپنی سرگذشت خود بیان کی ہے کہتے ہیں کہ میں نے تین ہزار فرسخ (یعنی نو ہزار میل) سے زائد کی مسافت پیادہ پا طے کی ہے[1]، امام دارمی نے طلب حدیث میں حرمین، خراسان، عراق، شام اور مصر کا سفر کیا تھا[2]۔ امام بخاری نے ۱۴ برس کے سن میں سیاحت شروع کردی تھی[3]۔ بینا تو بینا مادرزاد نابینا حافظ الحدیث ابوالعباس رازی اپنے نبی پاک کے اقوال وافعال کی شیفتگی میں بلخ، بخارا، نیشاپور اور بغداد کا سفر کرتے پھرتے تھے[4]۔ بلخ سے بغداد براہ بخارا ۱۳۶۵ میل ہے۔ حافظ ابن طاہر مقدسی نے طلب حدیث میں بہت سے پیادہ پا سفر کئے ان کے علمی شوق کو ملاحظہ فرمائیے کہ سفر میں خون کا پیشاب تک ہونے لگتا تھا لیکن اس پر بھی ہمت نہ ہارتے تھے[5]۔ حافظ ابوالخطاب اندلسی نے تحصیل علم کی غرض سے اسپین، مراکش، حبش، مصر، شام، عراق عجم اور خراسان کا سفر کیا اس طرح تین براعظم ان کے جہاں پیما قدموں کے نیچے سے نکل گئے[6]۔

مسلمانوں نے جس طرح علوم دین کے حصول کے لئے اپنے شوق بے پایاں کا اظہار کیا ٹھیک اسی طرح فن ادب اور دیگر علوم کی تحصیل کے لئے بھی علمی جمیت

بقیہ صفحہ ۶۸ ۔ اور آنکی روشنی میں کتاب کا مطالعہ کیا کرتا۔ اسی تنگ حالی میں وہ علمی ترقی کی کرسارے جہاں میں اپنا نام روشن کر گیا (عیون الانباء صـ ۱۳۴ جلد ۲)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا سلطان المشائخ ہونے سے بہت پہلے اپنی بچپن میں تین تین دن کے مسلسل روزے رکھ چکے تھے۔ آپکے والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا آپکی کفالت ماں کی ذمہ تھی جو سوت کات کر اپنے ہونہار بچہ کو پڑھاتی تھیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ یا تو سوت فروخت نہو سکا یا گذر اوقات کے لائق کاتا نہ جا سکا اس صورت میں بھوکا رہنا پڑا لیکن تعلیم کا سلسلہ برابر جاری رہا (ملاحظہ ہو نظامی بنسری)

[1] تذکرۃ الحفاظ صـ ۱۲۷ جلد ۲ ۔ [2] تذکرۃ الحفاظ صـ ۱۱۴ جلد ۲ ۔ [3] تذکرۃ الحفاظ صـ ۱۳۴ جلد ۲

[4] تذکرۃ الحفاظ صـ ۲۳۳ جلد ۳ ۔ [5] تذکرۃ الحفاظ صـ ۱۴ جلد ۴ ۔ [6] ابن خلکان صـ ۳۸۱ جلد ۱

کا یہ رنگ دیکھ کر ابن بشار نے خادم کو آواز دی اور کہا کہ اس شہر آشوب (جاریہ) کو واپس لیجاؤ میرے دل میں اس کی اتنی قدر نہیں ہے کہ میرے خیال کو علم سے پھیر لے چنانچہ خادم گیا اور جاریہ کو واپس کر آیا۔[1]

یہ علمی ذوق وشوق اور وارفتگی کچھ خواص ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ اُس زمانہ کی عام کیفیت ہی کچھ ایسی تھی جس میں عورت، مرد، بچّے، بوڑھے اور آزاد و غلام سبھی شریک تھے۔ موجودہ دور شائستگی میں جس طرح اعداد وشمار جمع کر کے تعلیم یافتہ افراد کا اوسط فیصدی نکالا جاتا ہے اس طرح اُس زمانے کے خواندہ مسلمانوں کا ٹھیک شمار پیش نہیں کیا جاسکتا پھر بھی تاریخی واقعات کی بنا پر قیاس سے کام لیکر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ میں تعلیم یافتہ لوگوں کی کتنی کثرت ہوگی۔ علی بن عاصم کے حلقۂ درس حدیث میں تیس تیس ہزار اور یزید بن ہارون کے حلقۂ درس میں ۷۰، ۷۰ ہزار آدمی جمع ہوتے تھے۔ خلیفہ معتصم باللہ نے ایک بار اپنا معتمد امام عاصم بن علی کی مجلس کے شرکاء کا اندازہ کرنے کے لئے بھیجا اُس نے واپس آکر حاضرین کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی۔[2] غور کیجئے کہ جس قوم کے افراد ایک ایک علمی مجلس میں سوا سو لاکھ جمع ہوجائیں اس کے سینہ میں کتنا شوق علم بھڑک رہا ہوگا اور جو شہر سوا لاکھ باشندے ایک علمی جلسہ میں بھیجدے وہ کتنا آباد ہوگا۔

احمد بن جعفر راوی ہیں کہ جب ابومسلم بغداد میں آئے تو انھوں نے حدیث کا املا کیا۔ سات مستملی کھڑے ہوئے جو ایک دوسرے کو شیخ کی روایت پہونچاتا تھا۔ املاء حدیث کے بعد لوگوں کا اندازہ لگانے کے لئے

---

[1] ۔ نزہۃ الالباء صد ۳۳۶

[2] ۔ علماء سلف صد ۵۳ از مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی

میدان کی پیمائش کی گئی اور دواتیں گنی گئیں جو شمار میں چالیس ہزار سے اوپر تھیں
جو لوگ صرف سماعاً شریک تھے اور لکھتے نہ تھے وہ اس تعداد سے خارج ہیں
عامۃ المسلمین میں علم کی کثرت دریافت کرنے کا دوسرا طریقہ اُن باکمالوں کی
تعداد ہے جو ایک ایک شہر میں ایک ہی وقت میں موجود تھے۔ یہ ملحوظ خاطر رہے
کہ کتنے پڑھنے لکھنے والوں میں ایک صاحب فن اور باکمال پیدا ہوتا ہے۔
مسلم ابن ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے آٹھ سو شیوخ سے فن حدیث حاصل کیا ہے
اور یہ سب ایک ہی شہر (بغداد) میں تھے ٣١٩ھ میں ایک شخص کی جان کسی طبیب
کے جہل مرکب کی نذر ہو گئی اس پر خلیفہ عباسی مقتدر باللہ نے رئیس الاطباء ابن
ثابت کو حکم دیا کہ "شہر بغداد کے تمام اطباء کا امتحان لیا جائے جو امتحان میں کامیاب ہوں
انھیں سند دیدی جائے اور جو ناکامیاب ہوں انھیں علاج سے روک دیا جائے۔
سند میں اس امر کی تشریح بھی ہو کہ سند یافتہ کو فلاں فلاں قسم کے امراض کو معالجے
کی اجازت ہے" حکم کی تعمیل کی گئی تو کچھ کم نو سو کو سند علاج عطا ہوئی اس فہرست
میں وہ اطباء داخل نہیں ہیں جو بوجہ شہرت فضل و کمال امتحان سے مستثنیٰ رہے یا جنکو
سرکار خلافت سے تعلق حاصل تھا۔ خدا کو علم ہے کہ ایسے طبیب کتنے تھے اور اُن کی
تعداد نو سو کے عدد کو یہاں تک بڑھا دیتی۔ بہر حال قیاس کی آنکھوں سے مشاہدہ
کیا جا سکتا ہے کہ جس شہر میں نو سو سند یافتہ طبیب ہوں گے تو
اس میں دیگر فنون کے اہل کمال کی تعداد کس قدر ہوگی آگے چل کر تاریخ ہی کی
ایک شہادت ملتی ہے کہ امام ادب نضر بن شمیل جب بصرہ سے خراسان کو جانے
لگے تو تین ہزار [illegible] آن کی مشایعت کو اپنے نکلے جو یا تو نحوی تھے یا لغوی و عروضی
اور اس کے بعد محدث یا اخباری تھے

ع ؎: عیون الانباء صفحہ ٢٢٢ جلد اول ؎ خلد :- ابن خلکان صفحہ ١٤٠ جلد دوم

مسلمان انھیں اسلاف کے خلف ہیں۔ لیکن اب حالت دوسری ہو۔ آج ان کی پست ہمتی ان واقعات کو بھی رستم واسفندیار کے افسانوں کے پہلو بہ پہلو بٹھانے پر آمادہ ہے لیکن کیا کیا جائے یہ ہیں سب تاریخی حقیقتیں۔ ان سے بھی زائد حیرت انگیز وہ کارنامے ہیں جو یہ بزرگ علمی دنیا میں بصورت تصنیف وتالیف چھوڑ گئے اور جنکی وجہ سے وہ آجتک زندۂ جاوید ہیں۔ ان میں سے بعضوں کی تصنیفات سیکڑوں سے متجاوز ہیں۔ ابو عبید نے مختلف علوم وفنون میں ۲۰۰ کتابیں لکھیں۔ ابن سریج نے چارسو، ابن حزم نے دوسو، یعقوب ابن اسحاق کندی نے ۲۳۱[1]، قاضی فاضل نے سو، اندلس کے مشہور عالم عبدالملک نے ایک ہزار، جمال الدین حافظ نے بھی اسی قدر[2]۔ ان کتب کی ضخامت کا خیال کیا جائے تو اور بھی حیرت ہوتی ہے[3]۔ خصوصاً تاریخ کی کتابیں بہت ضخیم ہیں مثلاً سبط ابن جوزی کی مرآۃ الزمان، ۴۰ جلد کی، ابن

ع۱ - کندی کی تصنیفات اور اس کے وسعت علم کا اندازہ فہرست مندرجۂ ذیل سے کیجئے اور اسی پر اوروں کے متعلق قیاس فرمائیے۔

فلسفہ	۲۲	جدل	۱۷	موسیقی	۷
حساب	۱۱	سیاست	۱۲	احکام	۱۰
نجوم	۱۹	احداث	۱۴	نفسیات	۵
ہندسہ	۲۳	طبیعات	۲۳	ابعاد	۸
فلکیات	۱۶	کرہ	۸	تقدمۃ المعرفۃ	۵
طب	۲۲	منطق	۹	کل میزان	۲۳۱

دور عباسی کی مترجمہ کتب، مصنفین اور انکی تصنیفات کیلئے ملاحظہ ہو علوم عرب جلد سوم صفحہ ۱۸ تا صـ ۱۹۲ نیز ابن ندیم کی الفہرست۔ ع۲ :- ابن خلکان صـ ۲۹ جلد اول"

ع۳ - اس زمانہ میں تصنیف وتالیف کے لئے جو دشواریاں پیش آئی تھیں (باقی صفحہ ۷۵ پر)

کتب خانے اور مدرسے:- کثرت تعلیم اور شوق علم کا اندازہ اُن مدارس اور
کتب خانوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو اس زمانہ میں پائے جاتے تھے۔ ویسے
تو ہر مسجد ایک کتب بھی اس قسم کے مکاتب میں سب سے مشہور اور قدیم جامع ازہر
ہے جو ۳۱۳ھ سے لیکر آج تک (یعنی ایک ہزار سال سے زائد سے) خدمت خلق کے
لئے وقف ہے۔[1] مساجد کے مدارس کے علاوہ پہلا مدرسہ مامون الرشید نے
خراسان میں قایم کیا۔ اس کے بعد تو درسگاہوں کے قیام کا ایک سلسلہ چل پڑا چنانچہ
ابن فورک المتوفی ۴۰۶ھ نے نیشاپور میں، نصر (برادر سلطان محمود) نے مدرسہ
سعیدیہ اور پروفیسر ابو اسحاق اور اسمٰعیل صوفی نے بھی متعدد مدرسے قائم کئے۔[2]
یہ سب مدرسے بغداد کے مدرسہ نظامیہ سے پیشتر تھے۔ مدرسہ نظامیہ ملک
شاہ سلجوقی کے وزیر اعظم نظام الملک نے قائم کیا تھا اس کا سالانہ خرچ چھ لاکھ
دینار تھا۔[3] جسٹس سید امیر علی نے اندلس کی تاریخ میں متعدد مدارس کے نام گنائے
ہیں جو قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ وغیرہ میں قائم کئے صرف شہر غرناطہ میں ۱۷ بڑے
اور ۱۲۰ چھوٹے مدرسے تھے۔ اسی طرح بلخ، بخارا، خیوا، سمرقند، مرو، ہرات،
غزنی وغیرہ تعلیم و تعلم کے لئے مشہور رہے تھے۔ مدارس کے علاوہ بہت سے اساتذہ
کے مکانات بجائے خود ایک مدرسہ کا کام دیتے تھے ان کے حلقہ درس میں
جس قدر زائد شاگرد ہوتے تھے اسی قدر ان کی شہرت ہوتی تھی چنانچہ مشہور ہے
کہ ابوبکر رازی کے حلقہ درس میں [illegible] اتنے طلباء بیٹھتے تھے کہ ان
کی آواز سب نہیں سن سکتے تھے۔ بہت سے [illegible] بھی اپنے استاد کے

۱- اس زمانہ میں بھی جامع ازہر میں تعلیم پانے والوں کی تعداد ۱۰ ہزار سے زائد ہے (روف)

۲- السیوطی صفحہ ۱۸۵ جلد دوم

۳- مدارس کی مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو رسائل مولانا شبلی نعمانی صفحہ [illegible]

ساتھ رہا کرتے تھے محمد غوری کے پیش امام حضرت فخر الدین رازی کے ہمرکاب ۱۰۰ فقیہہ ہوتے تھے۔

مدارس کے قیام کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے کتب خانوں کی ترتیب میں بھی کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔ موجودہ زمانہ میں کتب خانے نہایت آسانی کے ساتھ ہر جگہ قائم کئے جا سکتے ہیں کیونکہ چھاپہ خانے نیز رسل و رسائل کی فراوانی وکثرت نے کتابوں کا وجود اتنا آسان کر دیا ہے کہ آج عمدہ سے عمدہ کتابیں بلا وقت و دشواری روپیہ خرچ کرنے سے مل سکتی ہیں لیکن اس زمانہ میں کتب خانوں کا قیام جوئے شیر لانے کا مصداق تھا۔ ایک ایک کتاب کی فراہمی کے لئے زرکثیر کے صرف کے علاوہ خاص اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ پھر بھی بعض اوقات ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔

دور عباسیہ میں جب علمی ترقی کا آغاز ہوا تو بغداد میں "بیت الحکمۃ" نامی کتب خانہ قائم کیا گیا۔ اس کا بانی غالباً ہارون الرشید ہے۔ کتب خانے کے ایک حصہ میں ترجمہ نگار بیٹھتے تھے اور ایک حصہ میں نساخ اور ناقلین۔ مامون الرشید نے اس میں ترجمہ کرا کر بہت سی کتابوں کا اضافہ کیا۔ آخر میں کل کتابوں کا شمار دس لاکھ سے زائد تھا۔ اسی کتب خانے کے اصول پر دوسرے امراء[1] نے بھی کتب خانے جمع کرنے شروع کئے چنانچہ بہاء الدولہ دیلمی کے وزیر شاپور بن اردشیر نے ۳۸۱ھ ہجری میں بغداد کے ایک محلہ کرخ میں جو کتب خانہ قائم کیا تھا اس میں کتابوں کی تعداد دس ہزار تھی۔ افسوس ہے کہ طغرل بیگ نے جب بغداد

---

[1] - علماء و امراء نے جو کتب خانے قائم کئے ان میں افرائیم طبیب نے ۲۰ ہزار کتابیں، امین الدولہ نے بھی اسی قدر اور موفق الدین نے دس ہزار کتابیں جمع کیں۔ دیگر امراء و علماء کا بھی یہی حال تھا (ملاحظہ ہو علوم عربیہ (از جرجی زیدان) و رسائل شبلی نعمانی صفحہ ۔۔۔ تا صفحہ ۔۔۔)

دولت فاطمی کے زمانہ میں ایک نہایت عظیم الشان کتب خانہ طرابلس (واقع شام) میں قائم کیا گیا تھا اس میں تیس لاکھ کتابیں تھیں۔ جب عیسائیوں نے اس کو فتح کیا تو تمام کتابوں کو جلا ڈالا[1]۔ یہی حال غالباً اندلس کے کتب خانوں کا ہوا صرف شہر غرناطہ میں ۸۰ کتب خانے تھے جو عوام کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ شہر قرطبہ کے اندر حکم بن ناصر (المتوفی ۳۶۶ھ) نے ایک کتب خانہ "الحکمہ" کے نام سے قائم کیا تھا اس میں ۴ لاکھ کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ کتب خانہ کی فہرست ۱۲۰۰ صفحات پر مشتمل تھی[2]۔ اسی کتب خانہ کی تقلید میں اندلس کے اور شہروں میں بھی امراء و علماء نے بھی کتب خانے قائم کئے تھے۔

بہر حال جہاں تک مسلمانوں کی علمی ترقیات اور علم سے شغف و وابستگی کا تعلق ہے اُن کی کیفیت اقصائے شرق و غرب میں یکساں تھی جس وقت وہ ہندوستان میں بحیثیت فاتح کے داخل ہوئے ہیں۔ اُس وقت وہ اپنے پیشرو فاتح اقوام شک ستھین، ہن وغیرہ کی طرح جاہل و غیر متمدن ہرگز نہ تھے۔ وہ علم و ہنر کے شیدائی اور اس کے پرستار تھے، چونکہ خود صاحب فضل و کمال تھے اسلئے اہل علم کی قدر کرنا بھی جانتے تھے۔ محمود غزنوی کالنجر کے راجہ گانڈہ کے قصیدہ کا صلہ دیکر، ابوریحان بیرونی کتاب الہند لکھ کر اور مسعود سعد سلمان ہندی دیوان مرتب کرکے اس کا ثبوت دے چکے تھے۔ اور اگر اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے تو اس زمانہ میں جبکہ یورپ اور دنیا کے دیگر حصوں میں جہالت کی تاریک گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں علم کی شمع صرف انھیں کے دم سے روشن تھی۔ تصور کی آنکھ سے دیکھئے تو آپ کو ایک کیف محسوس ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ اسے آپ منشاء ایزدی پر محمول کریں

۱۔ Gibbon's Roman Empire Vol. VI P 505

۲۔ ملاحظہ ہو ابن خلدون۔

کہ ہندوستان کی خدمت حفاظت اور اپنی روایات کو محفوظ رکھنے کے لئے مسلمان
یہاں اُس وقت آئے جبکہ تاتاری طوفان اُٹھنے ہی والا تھا۔ ہندوستان نے اس
موقع یہاں کے بہترین دل و دماغ اور بہترین روایات کو اپنے دامنِ عاطفت
میں پناہ دی۔ مسلمان بھی ناشکرے نہیں تھے انھوں نے حتی المقدور تاتاریوں
کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو کر نہ صرف اپنے کو مٹنے سے بچایا بلکہ یہاں کے لوگوں
کی جان و مال کی بھی حفاظت کی اور اُن کے تمدن و معاشرت کی بھی جس کا ذکر مناسب
موقع پر کیا جائیگا۔

فصل سوم (الف) سیاسی کشمکش

نبی کریم کی وفات کے بعد خلفاء راشدین کی خلافت ایک ایسی عادلانہ حکومت
تھی جس میں ذمی و غیر ذمی سب کے حقوق محفوظ تھے۔ انفرادی و اجتماعی زندگی میں
ایک ربط تھا جس کی وجہ سے حریت و مساوات کا دور دورہ تھا۔ یہ ایک نمونہ کی حکومت
تھی اور ایسی حکومت جس کی طرف دنیا کو پھر لوٹ کر آنا ہے اگر اسے واقعی یہ منظور
ہے کہ دنیا میں فتنہ و فساد کی بیخ کنی کرکے امن و امان قائم کیا جائے۔ اسی کی تمنا
گاندھی جی کرتے تھے جس کو وہ "رام راجیہ" کہتے تھے اور اسی کو ہمارے عیسائی
بھائی آسمانی بادشاہت کہتے ہیں۔ اس "رام راجیہ" میں بنیادی حقوق کی حفاظت
آج کل کی دنیوی لادینی حکومتوں کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہوتی تھی۔ کیونکہ اُس کی بنیاد
خدا پرستی پر تھی اور اس کے چلانے والے شریعت و طریقت کی چلتی پھرتی زندہ تصو[illegible]
تھے یعنی دونوں کا مبارک اجتماع ایک ہی ذات میں تھا اور وہ خلیفۂ راشد کی
ذات تھی۔
آگے چل کر عہد امویہ و عباسیہ میں یہ صورت حال تا دیر قائم نہ رہ سکی

ہو کر رہ گئی اور جب تک بنو امیہ کا دور دورہ رہا اس میں قومی و عربی رنگ بھی تیز رہا لیکن عہد عباسیہ میں حالات بدل گئے جس کے چند وجوہ ہیں اور جن کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں۔

ان اسباب میں پہلا سبب یہ ہے کہ گو اموی دور خلافت میں حکمراں طبقوں پر تو عربی رنگ ضرور غالب رہا لیکن وہ اسلام کے بین الاقوامی ذہن و فکر کو اپنے تابع نہیں کر سکے۔ اور اہل علم اسلام کی تعلیمات کو مفتوحہ ممالک میں عام کرنے میں برابر مصروف رہے جس کی وجہ سے رنگ و نسل کے اثرات نیز خاندانوں کے غلط امتیازات دن بدن مٹتے رہے اسلئے جس طرح یہ صحیح ہے کہ اموی حکومت کے ایوانوں میں غیر عرب کو مشکل سے بار ملتا تھا اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حکومت کے علاوہ جماعتی و تمدنی زندگی کے جتنے ادارے تھے ان سب میں غیر عربی مسلمان پیش پیش رہنے لگے جمہور ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے یہاں تک کہ حاکمان وقت کو بھی ان پر رشک ہوتا تھا[1]

---

[1]۔ ایک مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید مع جاہ و حشم شہر رقہ میں خیمہ زن تھا اتفاقاً اسی موقع پر حضرت عبداللہ ابن مبارک امام حدیث کا اس شہر میں گذر ہوا۔ ان کے استقبال کے لئے لوگوں کا یہ ہجوم ہوا کہ سارے افق پر غبار چھا گیا اور کشمکش میں آدمیوں کی جوتیاں پارہ پارہ ہو گئیں۔ اس کیفیت کو حرم سرائے خلافت کی ایک کنیز نے جو دیکھا تو پکار اٹھی "واللہ حکومت اس کو کہتے ہیں ہارون کی کیا حکومت ہے جس کے لئے لوگ اہلکاروں کے زور اور دباؤ سے جمع ہوتے ہیں"

اسی طرح حضرت امام بخاریؒ جب دربار علم سے کمال کا خلعت پہنکر اپنے وطن بخارا کو واپس آئے تو نہ صرف شہر بخارا کے باشندگان نے بلکہ راستے میں جو شہر بھی پڑے وہاں کے رہنے والوں نے ان کا تین تین منزل تک بڑھ کر استقبال کیا حضرت امام مسلمؒ فرماتے ہیں کہ وہ جس شان سے شہر نیشاپور میں داخل ہوئے وہ شان میں نے کسی حاکم کی آمد میں نہیں دیکھی۔

حضرت امام فیروزی جب ایک دینی کام کے لئے شہر بغداد سے چلے تو ایک جم غفیر نے ان کی مشایعت

(باقی صفحہ ۸۳ پر ملاحظہ ہو)

دوسرے یہ کہ عربی فتوحات کا سیلاب تو ایک وقتی سیلاب تھا وہ آیا اور گذر گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلامی عقائد جس جس زمین میں پہونچے وہاں کے لوگوں کی ذہنی وجماعتی زندگیوں کو یکسر بدلتے چلے گئے۔ اور یہ مفتوحہ قومیں ایک صدی کے اندر اندر اس قابل ہوگئیں کہ عرب ان کو اپنے ساتھ حکومت میں برابر کا شریک کرنے پر مجبور ہوگئے۔

حاشیہ صفحہ ۸۲ ۔ کا قصد کیا انھوں نے ہر چند منع کیا لیکن جوش عقیدت میں کسی نے ممانعت کا لحاظ نہیں کیا۔ سامرہ پہنچکر جوہمراہیوں کا شمار کیا گیا تو پچاس ہزار آدمی تخمینے میں آئے۔

علماء کے ساتھ عامۂ خلائق کا یہ جوش عقیدت صرف ان کی زندگی تک محدود نہ تھا بلکہ ان کے وفات فرما جانے کے بعد بھی قائم رہتا تھا۔ امام جعفر طبری کی قبر پر کئی مہینے تک شب وروز نماز جنازہ پڑھی گئی۔ امام ابی داؤد کی نماز جنازہ اسّی دفعہ ادا ہوئی کل نمازیوں کا تخمینہ کیا گیا تو تین لاکھ ہوا اس سے ان بزرگوں کے عوام وخواص پر اثر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی وہ اثر تھا جس سے حکومت عادلہ بھی خائف رہتی تھی چنانچہ یہ مثال خالی از دلچسپی نہیں کہ امیر تیمور نے ایک مرتبہ اپنے ایک قاصد کو کسی ضروری کام پر روانہ کیا اس کو عام اجازت تھی کہ ضرورت کے وقت جس کا گھوڑا اس کو مل سکے اپنے استعمال میں لے آئے۔ راستہ میں اس کو اپنا گھوڑا بدلنے کی ضرورت ہوئی تو اسنے بلا جھجک علامہ تفتازانی (مصنّف مطول) کی پیش گاہ سے ایک گھوڑا کھول لیا۔ علامہ موصوف اس وقت اپنے خیمہ کے اندر تھے انھیں جب اس کی اطلاع ہوئی تو نہایت برہم ہوئے اور قاصد سلطانی کو پٹواکر نکلوا دیا وہ جب لوٹ کر دربار میں پہونچا تو اس نے تیمور سے علامہ موصوف کی شکایت کی۔ تیمور ہیجان غضب کے سبب سے تھوڑی دیر ساکت رہا اس کے بعد کہا کہ اگر شاہرخ (ولیعہد سلطنت) یہ حرکت کرتا تو بے شک سزا پاتا مگر میں ایسے شخص کا کچھ نہیں کرسکتا جس کا قلم ہر شہر ودیار کو میری تلوار سے پیشتر فتح کرچکا ہے۔

(ماخوذ از علما رسلف صفحہ ۱۲۲، ۱۲۳ مؤلفہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی)

(ب) **ملوکیت و قیصریت**:۔ سیاسی کشمکش و انتشار کے سلسلہ میں شخصی و وراثتی حکومت کے بارے میں ذکر آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ملوکیت و بادشاہت کا نظام بھی اپنے اندر کچھ خصوصیتیں رکھتا ہے جس کا ظہور اس نظام کے ساتھ لازمی ہے مثلاً

۱۔ ملوکیت میں حکومت قوم کی نہیں بلکہ حکمراں کی ذاتی اور خاندانی ملک ہو جاتی ہے۔

۲۔ سلطنت کے تمام ذرائع بادشاہ کی عظمت و سطوت کو بڑھانے کے لئے وقف ہو جاتے ہیں۔

۳۔ بادشاہ قوم کا خادم نہیں بلکہ رفتہ رفتہ مالک بن جاتا ہے اور تمام انسان اس کے نمک پروردہ غلام ہو جاتے ہیں جن سے حرّیت رائے اور آزادیٔ خیال بالکل سلب ہو جاتی ہے۔

۴۔ شان و شوکت اور دبدبۂ شاہی کے لحاظ سے بادشاہ اس زمین پر چھوٹا خدا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

۵۔ اُس کی ذاتی آسائش و تفریحات پر سلطنت کی بیش قرار آمدنی صرف کی جانے لگتی ہے۔ جس سے آگے چل کر قومی افلاس بڑھتا ہے اور اس طرح فتنہ و فساد کے دروازے کھل جاتے ہیں جو آئندہ خود حکومت کے زوال کا سبب بن جاتے ہیں۔

ملوکیت سے پیدا ہونے والے یہ وہ تمام حقائق ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا حکمراں کی مطلق العنانی اور بے راہ روی سے یہی سب کچھ ہونا بھی چاہئے لیکن یہاں پر دوسری اقوام کے مطلق العنان حکمرانوں کے مقابلہ میں اسلام کے خود سر بادشاہ کا درجہ متعین کرتے وقت بعض بنیادی اصولوں کا فرق ذہن نشین رکھنا چاہئے تاکہ مسلمان حکمرانوں کے بارے میں جب کبھی لفظ "ملوکیت و قیصریت" استعمال کیا جائے تو اُس کے حدود سمجھ میں آسکیں ان کے نہ سمجھنے سے مسلم حکمراں خواہ وہ

خلفائے عباسیہ ہوں یا کوئی دوسرے آمریت پسند بادشاہ ہماری غلط فہمیوں کا
شکار ہو سکتے ہیں۔

ضمیمہ ۱ جس میں اسلام و جاہلیت کے نظریۂ حیات سے بحث کی گئی ہے
اس بات کو صاف کر دیا گیا ہے کہ ایک مسلمان خواہ وہ کتنا ہی آزاد کیوں نہ ہو دنیا
کے دیگر غیر مسلم افراد کے مقابلہ میں پھر بھی آزاد نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کی آزادی
محدود اور کچھ ضوابط و قوانین کی پابند ہے اسلئے وہ بگڑ کر بھی سنبھل سکتا ہے جبکہ جاہلیت
کے تابع افراد کے بگڑ کر مزید بگڑنے کے امکانات سنبھلنے کے مقابلہ میں کہیں زائد
ہیں۔ اس کی مزید توضیح یوں کی جا سکتی ہے کہ ایک بگڑا ہوا مسلمان اس سونے کے
ٹکڑے کے مانند ہے جس کے اوپر میل کچیل کی تہہ جم گئی ہو ظاہر ہے کہ میل کچیل چھوٹ
جانے کے بعد سونا پھر سونا ہے اسی طرح وہ مسلمان بادشاہ یا خلیفہ جن کو یورپی
مورخین اور پھر جن کی اتباع میں دیگر غیر مسلم اقوام کے تاریخ دانوں نے مطلق العنان
سمجھا ہے وہ یورپی نیز جاہلی نظریۂ ملوکیت کی حد تک کبھی آزاد نہیں تھے کیونکہ ان
کی آزادی کو بعض عوامل نے مل کر محدود کر دیا تھا اور پھر انھیں عوامل نے ملوکیت
کے زنگ کو دور کر کے کندن کو کندن بنائے رکھنے کی کوشش کی۔

I ان عوامل میں یقیناً سب سے بڑا دخل قرآن پاک کے ان ضوابط و
قوانین کو ہے جن کا علم ہر اس مسلمان کو ہے جو ان کی تلاوت کرتا ہے یا دوسروں
سے سنتا ہے اور پھر ان پر حتی الامکان عمل بھی کرتا ہے اس کی بین شہادتیں
ہیں کہ دیگر اقوام میں ان کی مذہبی کتب کی پہونچ ایک مخصوص طبقہ تک محدود
رہی اور عوام ان کے صحیح اصولوں سے قطعی ناواقف رہے یا رکھے گئے جس
کی وجہ سے ان کے بعض حکمرانوں کو اس کا نہایت آسانی کے ساتھ موقع مل گیا کہ
انھوں نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا اور ان کی رعایا نے آنکھیں بند

III تیسری چیز جس نے بادشاہوں کی آمریت و ملوکیت میں اکثر رکاوٹیں ڈالی ہیں وہ جمہور اسلام کا طرزِ عمل تھا۔ جن بادشاہوں نے اپنی غلط اور من مانی کارروائیاں کرکے یا اپنی غفلت

حاشیہ صفحہ ۸۸ ؎ کے مقابلہ میں مخلوق کا حکم ماننا کسی طرح روا نہیں" (بحوالہ علماء سلف صفحہ ۱)

(ب) دورِ عباسیہ میں جب منصور حکمراں تھا تو ملوکیت کو تقریباً سوا سو برس اسلام میں گذر چکے تھے اُس وقت بھی امام مالکؒ اور ابن ابی ذئبؒ کی حق افروز آوازیں جور و استبداد کی ظلمت میں بجلی بن کر چمکا کرتیں اور درباریوں اور مصاحبین کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھیں۔ منصور نے ایک مرتبہ ابن ابی ذئب سے دریافت کیا کہ تم مجھکو کیسا سمجھتے ہو تو آپ نے فوراً جواب دیا "تم بدترین مخلوق ہو مسلمانوں کی تمام دولت اپنی شان و شوکت میں صرف کرتے ہو۔ غریبوں کو پریشان اور امیروں کو ہلاک کر ڈالا۔ بتاؤ کل تم خدا کے سامنے کیا جواب دوگے" منصور نے کہا "تم دیکھتے ہو کہ تمہارے سامنے یہ کیا چیز ہے" ابن ابی ذئبؒ نے کہا "ہاں ننگی تلوار دیکھتا ہوں لیکن آج کی موت کل کی موت سے بہتر ہے (بحوالہ افکار و سیاسیات اسلامی صفحہ ۵۳)۔

(ج) امام یزید ابن حبیب تابعی ایک دفعہ علیل تھے۔ ابن سہیل والیٔ مصر اُن کی عیادت کو آیا۔ اثنائے کلام میں اُسنے پوچھا کہ جس کپڑے پر مچھر کا خون لگا ہو اُس سے نماز جائز ہے یا نہیں۔ امام نے یہ سنکر غصہ سے منہ پھیر لیا اور کچھ نہیں کہا۔ جب امیر نے چلنے کا قصد کیا تو اُس کو نظر بھر کر دیکھا اور کہا کہ تو روزانہ خدا کے بندوں کا تو خون بہاتا ہے اور مچھر کے خون کا فتویٰ پوچھنے چلا ہے (بحوالہ علماء سلف صفحہ ۱)۔

(د) ابوالحسن نوریؒ نے ایک مرتبہ کشتی میں شراب کے مٹکے دیکھے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ خلیفہ معتضد باللہ نے منگوائی ہے آپ نے تمام مٹکے توڑ ڈالے۔ جب معتضد نے پوچھا کہ "تجھے محتسب کس نے مقرر کیا ہے" تو فوراً جواب دیا کہ جس نے تجھے خلیفہ مقرر کیا (افکار و سیاسیات صفحہ ۵۳۲)

(ہ) علاء الدین خلجی کی جبّاریت و قہّاریت سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے یہ وہی علاء الدین ہے جس کی مطلق العنانی پر ہمارے یورپی مورخین خوشیاں مناتے ہیں لیکن کیا پھر اس حقیقت سے بھی کوئی انکار کر سکتا ہے کہ قاضی علاء الملک نے اُسے "ایجاد مذہب" کے فتنہ میں پڑنے سے روک دیا اور قاضی مغیث الدین نے اُس کی بعض غلط کارروائیوں پر کڑی نکتہ چینی کرکے اسلاف کے اعلاء کلمۃ الحق کی سنّت کو تازہ کیا (بحوالہ فیروز شاہی)

(بقیہ صفحہ ۹۰ پر)

وعیاشی سے رعایا پر مظالم ڈھائے انھیں یا تو تخت حکومت سے معزول ہونا پڑا اور یا پھر انھیں جلد ہی قتل کر دیا گیا اس طرح تخت حکومت اُن لوگوں کے لئے جلد جلد خالی کیا جاتا رہا جو واقعی حکومت کے اہل تھے۔

حاشیہ صفحہ ۸۹ مُصنّفہ ضیاء برنی

(ف) دورِ اکبری کی مذہبی فتنہ سازیاں سب پر روشن ہیں اُس کی گدّی اُس کے سپوت بیٹے جہانگیر کے قبضہ میں آئی یہ وہی جہانگیر ہے جس نے دورِ اکبری کے ایک حق پرست وحق گو عالم مُلّا عبدالقادر بدایونی کی مشہور کتاب "منتخب التواریخ" کو دُنیا سے محض اسلئے نابید کرنے کی کوشش کی تھی کہ اُس نے اپنی کتاب میں عہد اکبری کے سُنے سُنائے نہیں بلکہ چشم دید سچے سچے حالات بے کم وکاست تحریر کر دئے تھے۔ اسی عہد جہانگیری میں حضرت شیخ سرہندی مجدّد الف ثانیؒ دورِ اکبری کے فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدی کی ترویج کے لئے اُٹھے اور شاہی قوت کے مقابلہ میں یکّہ وتنہا احیاءِ دین کی جدوجہد کی۔ اور بالآخر وہ اکبری فتنہ کے مُنہ پھیر دینے میں کامیاب ہو گئے۔ جہانگیر جس نے سجدۂ تحیتہ نہ کرنے پر شیخ کو گوالیار کے قیدخانہ میں قیدوبند کے مصائب و شدائد میں مبتلا کیا تھا آخر میں شیخ کا معتقد ہو گیا اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی غلط روش بدل گئی اور "اکبرشاہی دین الٰہی" اُن تمام بدعتوں کے ساتھ ختم ہو گیا جو درباری شریعت سازوں نے گڑھی تھیں اور غالباً وہ شیخ ہی کے پھیلائے ہوئے اصلاحی اثرات تھے جن کی بدولت تیموری خاندان کے اُس شہزادے (اورنگ زیبؒ) کو وہ علمی و اخلاقی تربیت مل سکی کہ اکبر جیسے ہادمِ شریعت کا پرپوتا خادمِ شریعت ہوا" (ماخوذ از الفرقان بریلی شاہ ولی اللہ نمبر صفحہ ۹۲)۔

(خ) سکندر لودھی نے ایک مرتبہ یہ چاہا کہ تھانیسر کے میلہ کو روک دیا جائے اور جاتریوں کو قتل کر دیا جائے۔ درباریوں میں سے ایک درباری نے بادشاہ سے اِس امر پر علماء وقت سے مشورہ لینے کی استدعا کی چنانچہ اس مبارک اجتماع میں پاک پٹن (اجودھن) کے میاں عبداللہ بھی شریک ہوئے۔ آپ نے نہایت جرأت و بیباکی کے ساتھ بادشاہ کے اِس بیہودہ ارادے کی شدید مخالفت کی اور اُسے خلافِ شریعت بتایا۔ اس پر بادشاہ کو اتنا غصہ آیا کہ اُس نے ہاتھ میں خنجر اُٹھا لیا اور کہا کہ پہلے اِس سے تمہارا کام تمام کروں گا اس کے

(باقی صفحہ ۹۱ پر)

VI آخری لیکن نہایت اہم چیز جس نے ملوکیت کے مضر اثرات کو کم سے کم کرنے میں بہت بڑا کام کیا ہے وہ مسئلۂ جانشینی ہے۔ غیر مسلم اقوام میں قانوناً یا رواجاً وارثِ تخت و تاج بادشاہ کا سب سے بڑا بیٹا سمجھا جاتا ہے لیکن اسلامی قوانین کی رُو سے امیر المومنین ہونے کا حق مسلم جماعت میں سے قابل سے قابل ترین فرد کے لئے مخصوص ہے عام اس سے کہ وہ بادشاہ کا بڑا یا چھوٹا بیٹا ہو یا مسلم جماعت کا ایک ادنیٰ فرد۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو آج ہندوستان کی تاریخ التمش بلبن علاء الدین خلجی فیروز تغلق شاہجہاں اول اورنگ زیب جیسے قابل ترین شہنشاہوں کے تدبر و سیاست کے ذکر سے خالی نظر آتی۔

حاشیہ بقیہ صفحہ ۹۰: بعد جاتریوں کا۔ اس پر میاں صاحب موصوف نے نہایت متانت و وقار کے ساتھ جواب دیا کہ موت و زیست تو اللہ کے ہاتھ میں ہے موت وقت سے پہلے تو آ نہیں سکتی لیکن ایک ظالم کے سامنے اُس سے نا اُمید بھی نہیں ہونا چاہئیے"۔ بادشاہ کو بالآخر اپنا غلط ارادہ ترک کر دینا پڑا (بحوالہ فاروقی صہ ۱۱۲)

(ح) سلاطین عثمانیہ میں سلطان سلیم خاں اوّل بڑے جاہ و جلال اور سطوت و شوکت کا بادشاہ ہوا ہے ایک روز اُس کو ملازمان خزانہ پر غصہ آ گیا اور اُنمیں سے ۱۵۰ آدمیوں کے قتل کا حکم دیدیا۔ مولانا علاء الدین جمالی ان دنوں قسطنطنیہ میں مفتی اعظم تھے اُنھوں نے جو یہ سخت حکم سُنا تو سیدھے باب عالی کو تشریف لے گئے وہاں پہونچکر سلطان کے سامنے جو تقریر کی وہ سننے کے قابل ہے۔ فرمایا "جو علماء فتویٰ دینے کے مجاز ہیں اُن کا فرض ہے کہ سلطانِ وقت کی آخرت درست رکھنے کی فکر رکھیں۔ میں نے سُنا ہے کہ سلطان نے ڈیڑھ سو آدمیوں کے قتل کا حکم دیا ہے حالانکہ شرعاً یہ تجویز ناجائز ہے لہذا میں عفو سلطانی کی استدعا کرتا ہوں"۔ بالآخر سلطان کو اپنا غلط حکم واپس لینا پڑا اور اس طرح بے گناہ ملازم قتل سے بچ گئے

(ماخوذ از علماء سلف صہ ۱۲۰، ۱۲۱)

باب دوم

ہندوستان عہد یمینی سے پہلے

نیا مذہب و نئی حکومتیں جلد اوّل میں ہم نے سندھ کے سیاسی حالات کا مطالعہ کرتے وقت کم از کم اتنا تو جان لیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کا دائرہ سندھ سے نکل کر ایک طرف قنوج اور دوسری طرف شمالی پنجاب یا زیریں کشمیر تک پہونچ چکا تھا لیکن پھر بھی یہ ایک محدود دائرۂ اثر تھا۔ عہد یمینی میں محمودی فتوحات نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا اور اگر ایک طرف بنارس و کالنجر تو دوسری طرف گجرات و بہار انھیں تک اس کو وسعت دی اسلئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عہد حاضر کے سیاسی واقعات کو چھیڑنے سے پیشتر شمالی ہند کے بالخصوص اور جنوبی ہند کے بالعموم سیاسی و سماجی نظام پر ایک نظر ڈالی جائے تاکہ دونوں ہمسایہ اقوام یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو اور اُن بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے جو بعض مورخین کی غلط ترجمانی کی وجہ سے پیدا ہو چکی ہیں۔ اور پھر چونکہ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ہندوستان کے اندر ایک سیاسی و ذہنی ہیجان بپا تھا، زمانہ کی رفتار اور اس کے حالات و واقعات پرانے آریت کو موجودہ ہندومت کی صورت میں ترتیب دے کر ایک نئے ہندومت کی بنیاد ڈال رہے تھے، نئے نئے قبیلے اور جماعتیں ہندو سوسائٹی میں اُبھر اُبھر کر نئی نئی حکومتوں کی داغ بیل ڈالنے میں مصروف تھیں اسلئے ہندوؤں کے سیاسی و سماجی انقلاب سے واقف ہونے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے تاکہ آئندہ آنے والے واقعات کو سمجھنے کی استعداد پیدا ہو سکے۔

فصل اوّل

نئے مت کی تشکیل I (۱) ذہنی ارتقاء

ویدک عہد ہندوستان میں اب سے ہزار ہا سال پیشتر مظاہر پرستی کا رواج تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جبکہ کائنات عالم کے بنانے اور سنوارنے والے (ایشور) کے متعلق انسان کا تخیل نہایت مبہم اور دھندلا سا تھا۔ چنانچہ وید منتر اور برہمن جو زمانۂ قدیم میں ترتیب دئے گئے ایسے ۳۳ دیوتاؤں کے ذکر پر مشتمل ہیں جو زمین، آسمان اور فضاء آسمانی سے متعلق ہیں۔ ان کے متعلق اس عہد کے انسان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان (دیوتاؤں) کو خوش کرنے کے لئے جو قربانیاں پیش کیجاتی ہیں ان کی وجہ سے دیوتا مجبور ہیں کہ وہ قربانی کرنے والے کے جملہ مقاصد کو پورا کریں۔ گویا قربانیاں ایک قسم کا قرضہ تھیں جن کا ادا کرنا (دیوتاؤں کو مطمئن کرنے کے لئے) ضروری تھا[1] آگے چل کر قربانیوں کی کثرت یا اُن کے رسمی رہجانے کی وجہ سے حکماء و علماء کے اندر ذہنی تغیر رونما ہوا اور اس نے مختلف شکلیں اختیار کیں مثلاً:۔

(۱) حکماء کی ایک جماعت کو ایک ایسے خدا کی تلاش و جستجو ہوئی جو تمام دیوتاؤں سے افضل و اعلیٰ ہو چنانچہ اسی ذہنی انتشار کا یہ نتیجہ ہے کہ اس عہد کے منتروں میں کہیں "ورن" دیوتا کو سب سے بڑا مانا گیا ہے اور کہیں "اندر" دیوتا کو اور کہیں کسی اور کو۔ بالآخر ہوتے ہوتے اس خدا کو جو ۳۳ ویدک دیوتاؤں کا بھی رب ہے وشو کرما (خالق کائنات) اور پرجاپتی (رب العالمین) کے نام سے یاد کیا گیا[1]۔ اور بقیہ تمام ۳۳ دیوتاؤں کو اس بڑے دیوتا تک پہنچنے کا ذریعہ تسلیم کیا گیا[2]

(۲) اسی عہد میں حکماء و مفکرین کی ایک ایسی جماعت بھی تھی جو خالص توحید کی متلاشی تھی۔

---

1. Taittiriya — Samhita VI, iii. 10. 5 عہ۱

2. Indian Philosophy by prof: Hiriyanna p.37

عہ۱۔ رگوید ۱۶۴:۴۶ عہ۲ رگوید ۱۰:۱۲۹

(۳) مذکورہ بالا مختلف الخیال جماعتوں کے علاوہ ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو نہ تو دیوی دیوتاؤں کو مانتا تھا اور نہ خدا کے وجود کا قائل تھا۔ اس طبقہ میں اُن جینیوں کو شمار کیا جاسکتا ہے جو مہاویر سوامی سے پہلے موجود تھے۔[1]

اُپ نشدوں کا زمانہ

اس ذہنی انتشار میں کچھ عرصہ کے بعد پختگی پیدا ہوگئی اور طرز فکر کے اعتبار سے مختلف اسکول بن گئے۔ چنانچہ اُپ نشد دراصل قربانیوں کے خلاف ایک مستقل آواز ہیں۔ "مونڈک" اُپ نشد قربانیوں کے خلاف لکھا گیا۔ "برہد آرنیک" اُپ نشد میں بتایا گیا ہے کہ اشومیدھ یگیہ کرنے سے یہ کہیں زیادہ بہتر ہے کہ ایشور کے گیان دھیان میں دُنیا کی ہر چیز کو ہیچ سمجھا جائے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اُپ نشدوں میں حکمراں طبقے کی فوقیت کو برہمنوں کے مقابلہ میں واضح کیا گیا ہے۔ اس وقت اُپ نشدوں کی تعداد دو سو سے زائد ہے لیکن زمانۂ بدھ سے پہلے جو اُپ نشد تھے ان کی تعداد غالباً ایک درجن سے زیادہ نہیں۔[2]

ویسے تو ان میں بے شمار خیالات کی بھرمار ہے جن میں بڑی حد تک تضاد ہے لیکن خاص طور سے دو طرح کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے (ا) یہ کہ دُنیا کا وجود وہمی و خیالی ہے (ب) یہ کہ کائناتِ عالم کی اشیاءِ مختلفہ میں ایک قسم کی وحدت ہے ان خیالات کے اعتبار سے خالق و مخلوق کے تعلقات کے متعلق دو نظریے قائم ہوگئے ایک "برہما پرنام واد"[3] اور دوسرا "برہما وِورت واد"[4] کے نام سے معروف ہیں فعل و عمل

---

[1] انڈین فلاسفی ص۱۴۴ از پروفیسر ہریّنّا — [2] انڈین فلاسفی ص۵۱

[3]:۔ اس کو ایک حد تک "نظریہ ہمہ اوست" قرار دیا جاسکتا ہے۔ چندوگیہ اُپ نشد میں اُدّالک اور اُس کے بیٹے شویت کیتو کا مکالمہ ملاحظہ ہو۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نظریہ میں تبدیلی ہوگئی کیونکہ خدا کے ساتھ پُرش اور پراکرتی کو بھی شامل کردیا گیا (مؤلف)۔ [4]:۔ برہما وِورت واد کو "نظریہ ہمہ از اوست" کہہ سکتے ہیں۔ برہما اُپ نشد میں مسماۃ گارگی اور یاگیہ ولکیہ کا مکالمہ دیکھئے۔

سماج کے اندر رہ کر ہو سکتا ہے اس کو چھوڑنے سے نہیں[۱]"

اُپ نشدوں کے بعد

غرضکہ اس زمانہ میں جبکہ جین و بودھ دھرم کی بنیاد پڑنے والی ہے ہندو دھرم میں چار قسم کے مستقل گروہ پیدا ہو چکے تھے (۱) وہ جو کہ ویدک رسم و رواج اور مظاہر پرستی پر ایمان رکھتے تھے چنانچہ میتری اُپ نشد میں ویدوں کے مطابق قربانیاں کرنا ہی نجات کا سبب قرار دیا گیا ہے لیکن ویدک عہد کے رجحان کے بخلاف اس عہد میں یگیہ اور قربانیوں کا مقصد ذاتی مفاد یا دیوتاؤں کو خوش کرنا نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود اپنے گناہوں کی تلافی ہے۔

(۲) دوسرا طبقہ "نظریہ جبر" پر اعتقاد رکھنے والوں کا ہے۔ ان کے نزدیک انسان اپنے فعل کا فاعل مختار نہیں وہ بے بس و لاچار ہے۔ پرجاپتی یا برہما دُنیا کی تخلیق کا باعث ہے جس کو وہ اپنے منشاء کے مطابق بناتا اور بگاڑتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ دن رات کی طرح مسلسل جاری رہتا ہے۔ یہ غالباً سنیاسیوں کا گروہ تھا۔

(۳) تیسرے گروہ کو اوتار پرست کہہ سکتے ہیں۔ ویدک عہد کے دیوتاؤں کی جگہ برہما، شو اور وشنو نے لے لی شو کو ویدک عہد کے رُدر دیوتا کا قائم مقام مانا گیا اور وشنو کو اندر دیوتا کا۔ یونانیوں کے حملہ کے وقت یہ دونوں دیوتا وجود میں آچکے تھے اور نہایت معزز و محترم سمجھے جاتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد کرشن جی کو بھی وشنو نارائن کا اوتار مان کر پوجا جانے لگا۔ غالباً یونانیوں کے اثر سے دیوی و دیوتاؤں کے لئے مورتیاں و مندر بھی بننے لگے[۲]۔

---

[۱] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سری مد بھگوت گیتا ادھیائے نو، اشلوک ۲۴، ۳۲، ۲۷، ۴۸ نیز ادھیائے ۳، اشلوک ۴، ۵، ۷، انڈین فلاسفی صفحہ ۱۱۶ تا ۱۳۲ – [۲] انڈین فلاسفی صفحہ ۱، قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۱۴ [۳]: مندروں کا آغاز غالباً ... ۲ قبل مسیح ہوا۔ نگری (جو کہ چتوڑ سے ۷ میل شمال میں ہے) کے کتبہ میں شو، اسیلو اور سری کرشن کی پوجا کیلئے مندر بنانے کا ذکر ہے۔ مندر بنانے کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے (قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۱۴)

سے "ثنویت" ([illegible]) کو ثابت کرتا ہے لیکن تدراین (...) سانکھیہ اور پورب میمانسا دونوں شاستروں کے نظریے کا مخالف ہے۔ ادھر شنکر اچاریہ اگر شیو کو دنیا کا سب سے بڑا دیوتا (خدا) تصور کرتے ہیں تو رامانج اور مادھو اچاریہ وشنو کو۔[1] ○

شنکر آچاریہ جو "ادویت واد" کے بانی ہیں کیرالا (دکن) کے کالپی نام کے ایک گانوں میں ۷۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک جید عالم اور فلاسفر تھے۔ انہوں نے کمارل بھٹ کی ناکامیابی کے اسباب کو سمجھ لیا تھا اسی لئے عوام کے ذہنی رجحانات کا خیال رکھتے ہوئے ویدک تعلیم کو پھیلانے کی کوشش کی۔ انھوں نے بودھوں کا استیصال ضرور کیا[2] لیکن چونکہ عوام کے دماغ پر بودھ کی تعلیمات "ویراگ واہنسا" کا قبضہ تھا اسلئے انھوں نے راہبانہ طریق زندگی کو فائق بتایا۔ اسی طرح خدا کی ہستی کا اقرار کرتے ہوئے بھی دیوی دیوتاؤں کی پوجا کو جائز رکھا۔[3] اس طرح ان کے فلسفہ "مایا واد" اور "ادویت واد"[4] کو جو اصولاً بودھ فلسفہ کا نقش ثانی تھا بودھوں نے بھی پسند کیا اور ہندوؤں نے بھی بودھوں نے انھیں "کامل بودھ" کا لقب دیا اور ہندوؤں نے انھیں "جگت گرو" کا لقب دیکر عزت افزائی کی۔[5]

ویدانت کا دوسرا اسکول "وششٹادویت" کے نام سے مشہور ہے۔ اس اسکول کی تعلیمات کا سراغ وید، گیتا، مہابھارت (نرائن کھنڈ) اور وشنو پران وغیرہ میں ملتا ہے۔ شنکر اچاریہ نے جیو اور برہمن (ایشور) کے بارے میں جو نظریہ قائم کیا ہے اس کی تردید سنہ ۱۰ء ہی سے دکن میں شروع ہو چکی تھی لیکن رامانج نے (سنہ پیدائش ۱۰۱۷ء) شنکر جی کے نظریات کی مکمل طور سے تردید کرکے ویدانت کا نیا اسکول چلایا۔ چونکہ انھوں نے

---

1 - انڈین فلاسفی ص ۳۳۶ تا ۳۳۹

2 - شنکر دگ وجے میں ایک اشلوک ہے "ویدوں سے منحرف بودھوں کا خاتمہ کرنے کیلئے آپ نے اوتار لیا ہے"
(بحوالہ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۔)

3 - قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ۴۴ - ۴۳ ۔ ... ملاحظہ ہو انڈین فلاسفی ص ۳۳۹ تا ۳۸۲

5 - قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۴۳-۴۴

کہ جس طرح ایران میں مزدکیوں کی جماعت تھی اسی طرح ہندوستان میں اس جماعت کو سمجھنا چاہیے
مسلمان مورخین نے ان کو اباحتی کے نام سے یاد کیا ہے[۱]۔

ہندو دھرم پر ایک سرسری نظر زمانہ قدیم میں جبکہ ویدک دھرم کا رواج تھا یگیہ ہون اور قربانیوں کو ضروری سمجھا جاتا تھا ایشور کی مختلف ناموں سے پرستش ہوتی تھی۔ پرستش کے لئے نہ مندر بنے تھے اور نہ انکی ضرورت سمجھی جاتی تھی لیکن جیوں جیوں زمانہ گذرتا گیا برہمن دھرم ویدک یا آریہ دھرم سے دور ہٹتا چلا گیا۔ بت پرستی عام ہوگئی۔ البیرونی کے زمانہ میں وید کو مذہبی کتاب ضرور مانا جاتا تھا لیکن "بہت کم برہمن ایسے تھے جو وید کا مطلب سمجھتے ہوں[۲]۔ وہ منتروں کو رٹ لیتے تھے۔ ویشوں اور شودروں کو وید نہیں پڑھائے جاتے تھے"۔ ویشوں نے عام طور سے جین یا بودھ دھرم قبول کرلیا تھا اس لئے ان کو یوں بھی ویدوں سے کوئی لگاؤ نہ رہا۔ ویدوں کی جگہ پرانوں کا رواج ہوا۔ یگیوں کی رسمیں جاتی رہیں۔ ان کی جگہ شرادھ اور تیرتھ کی رسمیں چل پڑیں۔ مندروں کے ساتھ ساتھ مٹھوں کی داغ بیل ڈالی گئی جو سراسر بودھوں کی تقلید تھی اسی طرح رتھ جاترا کی تقلید بھی بودھوں کے اثر کی وجہ سے ہوئی۔ پرانوں میں بودھوں اور جینیوں کی بہت سی باتیں بڑھادی گئیں۔ برت (روزہ) کا رواج بھی بودھوں اور جینیوں کی وجہ سے ہوا۔ معمولی معاشرتی اصولوں کو مذہبی رنگ دیکر پرائشچت (کفارہ) کے طریقے ایجاد کئے۔ چنانچہ "اچھوتوں کے ساتھ کھانے، گندا پانی پینے، ممنوع اشیاء کے کھانے، حائضہ اور اچھوت کو چھونے، شودر عورت۔ گائے۔ برہمن اور چھتری کو قتل کرنے، شرادھ میں گوشت دیا جائے تو اسے نہ کھانے، بحری سفر کرنے، زبردستی کسی کو غلام بنانے، زنا۔ شراب خوری۔ گئو مانس کھانے، چوٹی کٹوانے[۳]" وغیرہ وغیرہ میں

---

[۱]:۔ اباحتی یا وام مارگی یا وام مارگی کی تفصیلات کے لئے منسلکہ ضمیمہ ملاحظہ ہو۔

[۲]:۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۳۹۔ [۳]:۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۴۰، صفحہ ۴۱

کفارہ کی ادائیگی کا حکم ہے۔

فصل دوم

(ب) قرون وسطیٰ کے مخصوص مذہبی فرقے

شیو فرقہ شیو فرقہ مہا دیو یا شیو کا پوجاری ہے۔ یہ عام طور سے "پاشوپت" فرقہ کہلاتا ہے۔ بعد کو اس میں "لکوٹیش" فرقہ کا اضافہ ہوا جس کا آغاز "بھرگو منی" (۱، ۶۹) کی طرف منسوب ہے۔ ریاست بڑودہ میں "کاروان" ان کا مشہور تیرتھ گاہ ہے۔ لکوٹیش کے چار شاگردوں کوشک، گرگ، متر اور کورش کے نام پر چار فرقے اور بنے لیکن آج یہ فرقے مفقود ہیں۔

شیو فرقہ پرستش کے لئے چھ اصولوں پر عمل کرتا ہے، ہنسنا۔ گانا۔ ناچنا۔ بیل کی طرح باں باں کرنا، زمین دوز ہو کر نمسکار کرنا اور جپ کرنا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ شخص اپنے اعمال کا پھل بھوگتا ہے۔ شیو قدیم ہے۔ جپ اور یوگ کے ذریعہ نجات حاصل ہوتی ہے نجات پانے کے بعد آدمی چھوٹا شیو بن جاتا ہے۔

شیومت کے دو فرقے "کاپالک" اور "کالا مکھ" بھی ہیں۔ یہ لوگ شیو کے بھیرو اور رُدّر روپ کی پوجا کرتے ہیں ان کے چھ نشان ہیں مالا، زیور، کنڈل، رتن، راکھ اور جنیو۔ آدمی کی کھوپڑی میں کھاتے ہیں ایک ڈنڈا اور شراب کا پیالہ ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ اس فرقہ کے سادھوؤں کی زندگی نہایت خوفناک اور قابل نفرت ہوتی تھی شنکر دگ وجے، ہرش چرت اور مالتی مادھو میں ان کا ذکر ہے۔ ہندو دھرم میں شیومت کا پرچار زیادہ ہو رہا تھا۔ آخری دور میں جبکہ مسلمان درۂ خیبر سے ہندوستان میں داخل ہوئے اکثر راجہ شیو دیوتا کے پرستار تھے۔ کشمیر میں شیو فرقہ کا زیادہ زور تھا۔

۱: تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ستیار تھ پرکاش باب ۱۱ ۲: قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۴۵

جس زمانہ میں آندھرا اور تامل دیس (جنوبی دکن) میں وشنو فرقہ شیویوں کی مخالفت میں پھیل رہا تھا ایک نئے شیوی فرقہ کا آغاز ہوا۔ اس کا نام "لنگایت" ہے۔ اس فرقہ کو بسو نامی پنڈت نے جینیوں کو مٹانے کے لئے جاری کیا۔ یہ شیویوں کا اصلاح یافتہ فرقہ ہے اس کے خاص اصول یہ ہیں اہنسا پر عمل کرنا، چھوت چھات کی مخالفت کرنا، سنیاس او تپ کو فضیلت نہ دینا، ہر شخص کو خواہ وہ سادھو ہی کیوں نہ ہو محنت کرکے روزی پیدا کرنے کی تلقین کرنا، بھکتی پر ایمان رکھنا، جنیو کی جگہ گلے میں شولنگ لٹکانا، گائیتری منتر کی جگہ "اوم نمہ شیوایہ" کا ورد رکھنا۔ دکن میں شیو فرقہ کا پرچار غالباً چھٹی صدی عیسوی سے جاری ہوا۔

وشنوی فرقہ[ع۱] غالباً متھرا کے جادو نبشی راجاؤں نے بھگوت گیتا کے وراٹ روپ کے تذکرہ کو مدنظر رکھ کر واسدیو کی بھکتی کے لئے مورتی پوجا کا رواج ڈالا میگاستھنیز نے لکھا ہے کہ متھرا کے راجہ ہیرکلیس (سری کرشن یا واسدیو) کی پوجا کرتے تھے۔ سری کرشن کو وشنو نارائن کا اوتار مانا جاتا تھا۔ اس فرقہ نے پہلے تو ویدک دھرم کی قربانیوں کو جاری رکھا لیکن بعد کو بودھوں کے اثر سے اہنسا پر عمل کرنے لگے "پنچ راتر سمہتا" کے مطابق جو اس فرقہ کی مخصوص مذہبی کتاب ہے یہ لوگ پنجگانہ مراسم کو مانتے تھے۔ مندروں میں جانا، پوجا کے لوازمات کو جمع کرنا، منتروں کا پڑھنا پوجا کرنا، اور یوگ کے ذریعہ دیدار الٰہی کو یقینی سمجھنا۔

بودھوں اور جینیوں کے چوبیس اوتاروں کی تقلید میں انھوں نے بھی وشنو دیوتا کے ۲۴ اوتاروں کو تسلیم کیا جن میں متسیہ، کورم، وراہ، نرسنگھ، وامن، پرشورام، رام، کرشن، بدھ اور کلنکی اوتار سب سے فائق تسلیم کئے گئے۔ دکن میں بھاگوت فرقہ (یعنی کرشن کے پجاریوں) کا آغاز نویں صدی عیسوی کے شروع میں ہوا لیکن رام کی پرستش کے لئے دسویں صدی عیسوی تک نہ مندر بنے تھے اور نہ ان کی پوجا شروع ہوئی تھی۔

ع۱: ۔ قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۱۶ تا ص۲۲؛ ستیارتھ پرکاش باب یازدہم؛ انڈین فلاسفی ص۲۸۳ تا ص۲۱۳

بھیروی چکّر کے پیروؤں کو "شاکت" کہتے ہیں۔ ان کے دو فرقے ہیں کولک اور سمئن۔ کولک فرقہ دو گروہوں میں منقسم ہے۔ پُرانے کولک عورت کے عضو باطن کی تصویر کی اور نئے کولک اصلی عضو کی پرستش کرتے ہیں سمئن ان خرافات سے مجتنب ہیں۔ نویں صدی کے اواخر میں راج شیکھر نامی شاعر نے کرپور منجری میں کولک مت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"ہم منتر تنتر وغیرہ کچھ نہیں جانتے، نہ گرو کرپا سے ہمیں کوئی گیان حاصل ہے ہم لوگ شراب خوری اور زنا کرتے ہیں اور اسی پرستش کے وسیلہ سے نجات حاصل کرتے ہیں۔ فاحشہ عورتوں کی تلقین کر کے ہم ان سے شادی کر لیتے ہیں۔ ہم لوگ شراب پیتے اور گوشت کھاتے ہیں، بھکشا (بھیک) سے ملا ہوا اناج ہماری معاش ہے اور مرگ چھالا ہی ہمارا پلنگ ہے۔ ایسا کول دھرم کسے پسند نہ آئیگا" [1]

سورج کے پوجاری	ویدوں اور برہمنوں وغیرہ میں سورج کی پوجا کا ذکر ہے لیکن یقینی طور سے یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ یہ پوجا شروع کب سے ہوئی۔

وراہ مہر نے اس کی پرستش کو ایرانی قوم "مگ" کی طرف منسوب کیا ہے۔ سورج کی مورتی دو ہاتھوں والی ہوتی ہے۔ دونوں ہاتھوں میں کمل، سر پر تاج، سینہ پر زرہ اور پیروں میں "فل بوٹ" ہوتے ہیں۔ بھوشیہ پران میں سورج کی پرستش کا آغاز راجہ سانب (جو کرشن اور جاموتی کا فرزند تھا) کے زمانہ سے ہوا۔ چونکہ ہندی پنڈتوں نے سورج دیوتا کا پروہت بننے سے انکار کر دیا تھا اسلئے راجہ نے ایران سے پروہتوں کو بلا کر انھیں سورج دیوتا کا پروہت بنایا۔ یہ لوگ مگ قوم سے تھے البیرونی کے زمانہ تک سورج دیوتا کے مندروں کے یہی لوگ پروہت تھے۔ راجپوتانہ میں ان کو سیوک اور بھوجک کہتے ہیں۔ سورج کے اب بھی سیکڑوں مندر ہیں مندسور کا مندر، ۴۳۷ء کا تعمیر شدہ اب بھی موجود ہے۔ ریاست سروہی میں "برمان" نامی موضع کا مندر رنگ محل کا ہے اس کے ستونوں میں نویں اور دسویں صدی عیسوی کی

[1] قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۳۱ تا ۳۲

جین دھرم کے اصول وعقائد مجملاً یہ ہیں (۱) کائنات عالم دو حصّوں میں منقسم ہے۔ ذی روح اور غیر ذی روح۔ ہر ذی روح (انسان) کے اندر دو قوتیں ہیں روحانی و مادّی۔ زندگی کا مقصد یہ ہے کہ مادیت کو دبا کر روحانیت کو ترقی دیجائے یہاں تک کہ انسان الوہیت کا درجہ حاصل کرلے۔ اس عہد کے حکماء ہند کا یہ نظریہ تھا کہ انسانی فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی لیکن مہاویر سوامی کا کہنا یہ ہے کہ فطرت گھٹ بڑھ سکتی ہے کیونکہ جتنی روحانیت ترقی کرے گی اُتنی ہی فطرت میں تبدیل ہونے کی صلاحیت پیدا ہوگی (۲) روح کے ساتھ جب تک فعل کا تعلق رہیگا اسے بار بار عالم شہود میں آنا پڑے گا لیکن جب وہ الوہیت کا درجہ حاصل کرے گا تو آواگون کا یہ سلسلہ ختم ہوجائیگا۔ اِس کے لئے انسان کو پانچ منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے اَسرَو، بندھ، سَاتور، نِرجرا اور موکش (۳) نجات کا واحد ذریعہ رُوح کی حقیقت سے باخبر ہوتا ہے یعنی صحیح علم حاصل کرنا (۴) عالم قدیم اور غیر محدود ہے۔ زمانہ، عادت، تعین، فعل اور حرکت ان پانچ علتوں سے مادّہ اُس میں ملتا ہے اور دُنیا وجود میں آتی ہے۔ خدا اِس کا خالق نہیں۔ (۵) سیلاب آتا ہے اور دنیا فنا ہوجاتی ہے لیکن دوبارہ جنم لینے کے لئے۔ پہاڑ پر ہر جنس کا ایک جوڑا باقی رہجاتا ہے اِسی سے دُنیا پھر آباد ہوتی ہے[۲]۔ (۶) صحیح علم، صحیح عقیدہ اور صحیح چلن یہ تینوں باتیں زندگی کا جوہر ہیں۔ سادھو کے لئے ان کے علاوہ پانچ مزید باتوں پر عمل پیرا ہونا چاہئیے: اہنسا، حق گوئی، چوری سے اجتناب، برہم چریہ، اور ترک دُنیا۔ عام گرہست لوگوں کو برہم چریہ اور ترک دُنیا ضروری نہیں اس کی جگہ انھیں پاکباز رہنے اور خواہشات کو محدود کرنے کا عہد کرنا پڑتا ہے۔ (۷) ویدک رسوم ورواج اور ذات پات کے قیود چونکہ خود ساختہ ہیں اِس لئے انھیں نہیں ماننا چاہئیے۔

عہ۱۔ انڈین فلاسفی ص ۱۵۸

عہ۲۔ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کی روایات مدِ نظر رہیں (مؤلف)

مہاویر سوامی کے انتقال کے بعد ان کی تعلیمات ایک عرصہ تک سینہ بہ سینہ چلی آئیں۔ جن میں یقیناً تغیر ہوا ہوگا۔ چنانچہ جینیوں کے "دگمبر" طبقہ کے سادھو برہنہ رہتے ہیں، عورتوں کی نجات کے قائل نہیں۔ تیرتھنکروں کی معمولی طور سے پوجا کرتے ہیں لیکن "سوتیامبر" طبقے کے سادھو سفید یا زرد کپڑے پہنتے ہیں اور تیرتھنکروں کی پھول، دھوپ اور زیورات سے پوجا کرتے ہیں۔ بت پرستی میں یہ کسی سے کم نہیں۔ سوامی دیانند سرسوتی نے تو جینیوں ہی کو بت پرستی کا موجد قرار دیا ہے[1]۔ جینیوں نے بودھ بھکشوؤں کی طرح اپنے مذہب کی تبلیغ میں سرگرمی کا اظہار نہیں کیا پھر بھی دکن، راجپوتانہ اور گجرات وغیرہ میں ان کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ پانڈیہ اور چول راجاؤں نے جین گروؤں کی جی کھول کر مدد کی۔ اُن کے لئے دان دئے اور مندر اور مٹھ بنوائے لیکن بعد کو شیومت قبول کرنے پر چول راجاؤں نے جینیوں کو زک دینے کے لئے (سنہ۱۰۰۰ء تا سنہ۱۲۰۰ء) پُر زور کوششیں کیں۔ ہوئسل خاندان کے راجاؤں نے وشنومت اختیار کرکے جین دھرم کو نقصان پہنچایا۔ اسی طرح اڑیسہ کے راجاؤں نے شیومت کا اثر قبول کرکے جینیوں پر مظالم کئے جس زمانہ میں دکن کے اندر جین مت کس مپرسی کے عالم میں تھا اسی عہد میں راجپوتانہ، مالوہ اور گجرات کے اندر اس کی ترقی ہوئی حالانکہ راجہ یہاں بھی شیومت کے ماننے والے تھے جن پر جین آچاریہ "ہیم چندر" کا کافی اثر تھا۔

فصل سوم

(ج) عہد میتی کی شروع تک بودھ و برہمن الگ الگ پہچانے جاتے تھے

جلد اوّل میں سندھ کے حالات تحریر کرتے وقت اِس امر کی وضاحت کی جا چکی ہے

[1]: ستیارتھ پرکاش صفحہ ۴۲۳ مولفہ سوامی دیانند سرسوتی۔ [2]: دوسری صدی عیسوی میں کلنگ کے
(باقی صفحہ ۱۱۴ پر)

کہ اس وقت جبکہ مسلمانوں نے سندھ میں پہلی مرتبہ قدم رکھا ہے تو رعایا مہاتما بودھ کی پرستار تھی جبکہ حکومت برہمن مت کی پیرو اور طرفدار تھی یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ برہمنوں اور بودھوں میں مذہبی و سیاسی تفوق حاصل کرنے کی خاطر مناظرہ و مکالمہ نیز جنگ آزمائی کی شکل قائم تھی لیکن مسلمانوں کی آمد نے دونوں جماعتوں کی جنگ آزمائی کو ختم کر کے ان سے مذہبی مناظروں میں خود بھی شرکت کی اور اپنے سیاسی تفوق نیز مذہبی دلائل کی صداقت کی وجہ سے فریق غالب ثابت ہوا۔ پھر بھی بودھوں اور برہمنوں کی ذاتی کشمکش ایک عرصہ تک جاری رہی اور اس کشمکش اور زد و خورد کا سلسلہ شہاب الدین محمد غوری کے حملوں تک (یعنی ۰۰ء تا ۱۲۰۰ء گویا ۵۰۰ سال تک) ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں جاری رہا۔ چنانچہ عرب سیاحوں کے بیانات کے بموجب عہد یمینی کے شروع زمانہ تک یہ دونوں گروہ ایک دوسرے سے الگ الگ پہچانے جاتے تھے۔

ابن ندیم (۳۷۹ھ / ۹۹۰ء) نے اپنی کتاب الفہرست میں ہندوستان کے بہت سے فرقوں کا حال لکھتے لکھتے ایک فرقہ بکر نتفیہ یا بکر جین یا بھکشو کا حال بھی تحریر کیا ہے جس کے بودھ ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اسی طرح ابن ندیم کے ہمعصر یا قریبی عہد کے ایک عرب متکلم مطہر بیت المقدسی نے ۳۷۵ھ / ۹۸۵ء میں اپنی کتاب البدء والتاریخ میں لکھا ہے کہ "ہندوستان میں ۹۰۰ نو سو فرقے ہیں لیکن ان میں سے صرف ۹۹ کا حال معلوم ہے اور یہ سب ۴۵ مذاہب کے اندر ہیں اور یہ بھی چار اصولوں کے اندر محدود ہیں۔ اور ان کی اصل موٹی تقسیم دو ہے سمنی (بودھ) اور برہمنی سمنی یا تو خدا کے بالکل قائل نہیں یا ہیں تو ویسے خدا کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۳:۔ راجہ کھارویل نے جین دھرم کے پرچار کی کوشش کی لیکن اس کے بعد کسی اور راجہ نے اسکی طرح دلچسپی نہیں لی بلکہ اڑیسہ میں جینیوں کو مصائب برداشت کرنا پڑے۔ (قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب ص۱۵)۔ ۱۱ یہ چار اصول وہی ہیں جن کا راقم الحروف نے ذہنی ارتقاء کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے لیکن ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی نے اسکی مراد ذاتیں لی ہیں (ملاحظہ ہو ہند و عرب کے تعلقات ص۲۰۲ تا ص۲۱۰)

جو بے اختیار ہے۔ برہمنی مذہب والوں میں تین فرقے ہیں۔ ایک توحید اور سزا و جزا کا قائل ہے مگر رسالت کا نہیں۔ دوسرا تناسخ کے اصول پر جزا و سزا کو مانتا ہے لیکن نہ توحید کا قائل ہے اور نہ رسالت کا۔" اس کے بعد کہتا ہے کہ "گائے ان کے نزدیک ماں کی طرح معزز و محترم ہے اس کے جان لینے کی سزا ان کے یہاں قتل ہے"۱؎ پھر ہنود کے بت پرستی کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ مطہر کے بیان کی تصدیق مذاہب عالم کے مشہور محقق عبدالکریم شہرستانی (۴۶۹ھ تا ۵۴۸ھ / ۱۰۷۶ء تا ۱۱۵۳ء) اور ابوریحان بیرونی (۳۶۲ھ تا ۴۴۰ھ / ۹۷۳ء تا ۱۰۴۸ء) نے بھی کی ہے۔ مذکورۂ بالا بیانات کو اگر سلیمان تاجر۲؎ (۲۳۷ھ / ۸۵۱ء) اور ابوزید سیرافی (۲۶۴ھ / ۸۷۸ء) کے بیانات سے ملا کر پڑھئے تو ہندوستان کے ان دو مشہور برہمنیہ اور سمنیہ گروہوں کے مظاہر پرست عوام کی توہم پرستی کا پتہ چلتا ہے۔ سلیمان تاجر اپنے سفرنامہ میں ہندوستان کے بہت سے قوانین کا ذکر کرتے ہوئے ملزم کی برأت کے سلسلہ میں گرم لوہے کے تھامنے اور کھولتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈالنے کا حال تحریر کرتا ہے۔ اس کے بعد لکھتا ہے "یہاں (دکن میں) یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب راجہ مرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی سب رانیاں جل کر ستی ہو جاتی ہیں لیکن یہ صرف خواہش پر موقوف ہے کوئی جبر نہیں .... لوگ بودھوں کے مجسمے پوجتے ہیں۔"۲؎

ابوزید سیرافی۳؎ نے واقعات کو نہایت تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ یہ بھی ایک عرب تاجر تھا اور چین سے تجارت کرنے کے سلسلہ میں اکثر ہندوستان آتا جاتا رہا ہے۔ لکھتا ہے "ا۔ ہندوستان اور چین دونوں جگہ تناسخ کا اعتقاد اتنا پختہ ہے کہ لوگ جان

۱؎ : کتاب الہند باب یازدہم ص۱۴۴ ترجمہ سید اصغر علی۔

۲؎ و ۳؎ سلیمان تاجر اور ابوزید سیرافی پر مفصل نوٹ جلد اول میں تحریر کئے جا چکے ہیں اعادہ کی ضرورت نہیں یہاں پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ سلیمان تاجر عرب کا سب سے پہلا سیاح ہے جو سلسلۂ تجارت عراق سے چین تک بارہا سواحل ہند سے گزرا ہے۔ اس کا سفرنامہ سلسلۃ التواریخ کے نام سے ۱۸۴۵ء میں پیرس سے شائع ہو چکا ہے۔ (مولف)

شواہد کی کمی ہے افسوس ہے کہ ہمارے ہندو بھائیوں نے اپنی تاریخ مُدوّن کرنے کی طرف
کوئی توجہ نہ کی اس لئے مورخ کو ان کے حالات جاننے کے لئے بہت مشکل کا سامنا
ہوتا ہے۔ البتہ اُن کی مذہبی کتب نیز بعد کی تصنیفات رامائن و مہابھارت اور پُران
وغیرہ سے جستہ جستہ حالات کا پتہ لگتا ہے۔ اس لئے مورخ کو انھیں کتابوں کی
طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اور بے جوڑ۔ غیر مسلسل نیز ناقابلِ قبول واقعات سے اصلیت
کا اندازہ لگانا پڑتا ہے۔

ظن غالب یہ ہے کہ یہ دونوں معاند فرقے اپنے اعمال وعقائد کی یکرنگی کی وجہ
سے ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اور صرف ناموں کا فرق
باقی رہ گیا تھا۔ بعد کو درۂ خیبر سے آنے والے مسلمان ترکوں کی پیہم یورشوں کی وجہ
سے وہ آپس میں سیاسی و مذہبی صلح کرنے پر مجبور ہوگئے اور یہ فرق بھی جاتا رہا۔
آنریبل ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر جنھوں نے ہندوستان کا گزٹیئر مرتب کیا ہے۔ اپنی
کتاب "تاریخ اہل ہند" میں وشنو پُران کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:- "وشنو پُران
کی تاریخ تصنیف سنہ ۱۰۴۵ء سے شمار کرنی چاہیئے۔ اس پوران میں جیسا کہ اس کے نام
سے ظاہر ہے۔ قدیم روائتیں قلمبند ہیں جو شیو اور بودھ متوں کے ساتھ ساتھ چلی
آتی تھیں۔ اس پُران کے مسائل براہِ راست وید سے نہیں لئے گئے بلکہ دو مشہور
رزمیہ نظموں کی وساطت سے حاصل ہوئے ہیں۔ یہ اٹھارہ پورانوں یعنی علم الٰہی کی
سنسکرت کی کتابوں میں سے ایک ہے جس میں برہمنوں نے وشنو اور شیو کے
مخالف مذہبوں کو ایک جا جمع کیا ہے[1]" ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ بالا بیان کو سامنے
رکھ کر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وشنو مت کی سب سے پہلی کتاب یعنی وشنو پُران
غزنویوں کے ہندوؤں سے سیاسی تعلقات شروع ہونے کے ۵۰ برس بعد جبکہ

۱۔ ماخوذ از آئینۂ حقیقت نما ج ۱ ص ۱۶۴

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تھیں جو راستوں، دریاؤں اور درختوں ہی کو پوجکر مذہبی فریضہ ادا کر لیتی تھیں اور سمجھتی تھیں کہ انھوں نے زندگی کا مقصد حاصل کر لیا۔ اس سے ہندو سوسائٹی کو بہت نقصان پہونچا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

فصل چہارم۔ نئے مت کی تشکیل II

(ل) ذات پات کی تقسیم اور اُس کے ارتقائی منازل

(ا) ذاتیں اور ویدولودھ آریوں کے رسم و رواج۔ عقائد اور طور و طریق کی وہ سادگی جو شروع زمانہ رگ وید (۲۵۰۰ ق۔م) میں تھی آخر زمانہ رگ وید (۱۴۰۰ ق۔م) میں چند در چند وجوہ کی بنا پر مٹ چکی تھی اور مٹتی جا رہی تھی۔ ان کے مذہبی عقائد، یگیہ ہون اور رسم و رواج میں جتنی نئی باتیں بڑھ گئی تھیں اُسی لحاظ سے ان میں پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں مثال کے طور پر صرف یگیہ (قربانی) کی ہزار قسمیں بن چکی تھیں جن میں بعض یگیہ ایسے تھے جن کے ادا کرنے کے لئے ۱۲ برس درکار ہوتے تھے[۱] غرضکہ رسومات کی زیادتی و کثرت اور ان میں انہماک کی وجہ سے پنڈتوں اور پروہتوں کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ وہ رگوید کو ازبر یاد کرتے رہتے اسلئے انھوں نے اپنی آسانی کی غرض سے رگوید میں سے منتخب کر کے تین اور وید بنا لئے اور جب اس سے بھی کام نہ چلا تو سوتر بنا ڈالے رسومات کی ادائیگی میں برہمنوں کا جب یہ عالم تھا جن کو سوائے تعلیم و تعلم کے اور کوئی دوسرا کام نہ تھا تو بیچارے عوام الناس کے پاس اتنا وقت کہاں سے آتا کہ وہ ویدوں کو پڑھتے اور ان کے مطابق مذہبی رسوم کو ادا کرتے ان کو تو بخلاف برہمنوں

۱؎ : تاریخ ہند صفحہ ۱۳۵ تا ۱۳۷ از اودھ بہاری پانڈے

۲؎ : تاریخ ہندوستان صفحہ ۲۶ از رام کرشن ماتھر

تا ۱۸۴ ق۔م) کے بعد ہی مگدھ میں جب دوبارہ برہمنوں کی حکومتیں (ٹنگ ۱۸۴ تا ۷۲ ق۔م۔ کنویا کانو ۷۲ تا ۲۷ ق۔م) قائم ہوئیں تو برہمنوں کے مذہبی اور سماجی طریقے از سرِ نو جاری ہونے لگے۔ ہندوؤں کا دھرم شاستر جو منو سمرتی کہلاتا ہے اسی عہد (۱۸۴ تا ۲۷ ق۔م) میں مرتب ہوا[1]۔ سماج میں برہمنوں کا درجہ سب سے اونچا سمجھا جانے لگا اور تفوق کا معیار بجائے قابلیت کے حسب و نسب قرار دیا گیا۔ شادی بیاہ، کھانے پینے اور چھوت چھات کے قاعدے مہاتما بدھ کے زمانے کے مقابلہ میں اور زیادہ سخت ہو گئے۔ ہر ذات کے لوگوں کے لئے قانون بھی الگ الگ بنا دئے گئے۔ ایک ہی جرم کی سزا اونچی ذات والوں کے لئے ہلکی اور نیچی ذات والوں کے لئے سخت تھی۔ نیچی ذات والوں کے لئے ویدوں کا پڑھنا پڑھانا ممنوع قرار دیا گیا۔ علم تحصیل کرنے کی ممانعت اور اعلیٰ طبقہ کی نفرت نے شودروں کا درجہ چوپایوں کے برابر کر دیا۔ چینی سیاحوں کے بیانات کے مطابق سب سے نیچے طبقے کی جماعتوں کو شہروں کے اندر رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کے محلّے شہروں سے باہر ہوتے تھے۔ عورتوں کا مرتبہ سوسائٹی میں گر گیا ان کو پہلے کی طرح خود مختارانہ زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ بیواؤں کی شادی کو روک دیا گیا اور ستی کے رواج کو قائم کیا گیا۔

(iii) راجپوتوں کا زمانہ

ان تمام باتوں کے باوجود اونچی اور نیچی ذات والوں میں ابھی ایک تعلق باقی تھا اور وہ یہ کہ اونچی ذات والے مردوں کا بیاہ نیچی ذات والی عورتوں کے ساتھ ہو سکتا تھا لیکن یہ رواج بھی رفتہ رفتہ راجپوتوں کے عہد (۶۵۰ء تا ۱۲۰۰ء) میں کم ہو گیا۔ اِس عہد میں "ذات پات کی ترتیب" میں ایک اہم تبدیلی واقع ہوئی اور وہ یہ کہ ہر ایک ذات بہت سی چھوٹی چھوٹی ذاتوں میں تقسیم ہو گئی۔ برہمنوں میں تفریق صرف گوتر ہی کی بنا پر نہیں ہوئی بلکہ وطنیت کے

---

[1] منو شاستر کی تدوین و ترتیب میں مورخین کا اختلاف ہے بعض نے عہد گپت کو منو شاستر کا زمانہ تصنیف قرار دیا ہے (مولف)

ان کو ہمیشہ نیچا سمجھا جس سے معاشرتی پیچیدگیاں روز بروز بڑھتی ہی گئیں اور ملک نہایت تیزی کے ساتھ تنزل کے گڑھے میں گرتا چلا گیا۔

فصل پنجم

(ب) معیشت و معاشرت

برہمن | برہمنوں کا سماج میں سب سے زیادہ احترام کیا جاتا تھا اور تینوں ورن (ذات) والے ان کی فضیلت کو تسلیم کرتے تھے۔ ان کا خاص کام پڑھنا اور پڑھانا، یگیہ کرنا اور کرانا، دان لینا اور دینا تھا۔ لیکن بودھ اور جین مذہبوں کی تعلیمات کی وجہ سے ان کی برتری کا طلسم ٹوٹ گیا اور یہ کام ان کے ہاتھ سے نکل گئے مجبور ہو کر یہ دوسرے برنوں (ذاتوں) کے پیشے کرنے لگے۔ اور ان پیشوں کو اپنے لئے جائز قرار دے لیا جن سے یہ اب تک محترز تھے مثلاً زراعت کا پیشہ معیوب سمجھا جاتا تھا اور ویشوں نے بودھ مت قبول کر کے زراعت کے مذہباً ممنوع پیشہ کو ترک کر دیا تھا یہ موقع دیکھ کر بہت سے برہمن کھیتی باڑی کر کے اپنی گذر بسر کرنے لگے چنانچہ پاراشر اسمرتی میں کھیتی باڑی کے جواز کی صورت نکال لی اس اسمرتی کی رو سے سب ذاتیں کھیتی باڑی کرنے کی مجاز ٹھہریں[۱]۔ زراعت کے علاوہ اس زمانہ میں برہمن صنعت و حرفت، دستکاری، تجارت اور دوکانداری بھی کرتے تھے لیکن پھر بھی اپنے وقار کا از حد خیال رکھتے تھے اور نمک، تل، دودھ، شہد، شراب اور گوشت وغیرہ نہیں بیچتے تھے۔ اسی طرح سود کو حرام سمجھ کر اس کے لین دین سے بھی پرہیز کرتے تھے۔

چھتری:۔ برہمنوں کی طرح چھتریوں کا بھی سماج میں بہت اونچا درجہ تھا۔ ان کے

ع ۱:۔ قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۴۸

خاص فرائض رعایا پروری، یگیہ کرنا، دان دینا اور مطالعہ تھا۔ یہ فرمانروا، سپہ سالار اور فوجی منصب دار ہوتے تھے۔ پڑھنے لکھنے کے مواقع چونکہ ان کو حاصل تھے اس لئے ان میں بعض راجہ بہت اچھے عالم ہو گزرے ہیں چنانچہ راجہ ہرش وردھن، چالوکیہ راجا وِنیادتیہ، چوہان راجہ وگرہ راج چہارم اور مالوہ کے راجہ بھوج کا نام ادبی خدمات کے لئے محتاج بیان نہیں۔ برنوں کا نظام درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے برہمنوں کی طرح چھتری بھی دوسرے پیشے کرنے لگے۔

چھتریوں میں تین درجوں کے لوگ شامل ہیں (۱) ویدک عہد کے آریہ چھتریوں کی اولاد (۲) گونڈ، بھار، ابھیر وغیرہ قدیم ہندی ذاتوں کے وہ لوگ جو ہندو سوسائٹی میں شامل ہو گئے اور جن کا کام حکومت کرنا یا جنگ کرنا تھا (۳) شک، یوچی، منگول، ہن، گرجر وغیرہ غیر ملکی قوموں کے جنگجو لوگ جو ہندو ہو گئے اور چھتریوں کا سا کام کرتے رہے۔ راجپوت معاملے کے بڑے صاف، بڑے حوصلہ مند، بہادر، نڈر، راست باز اور بات کے پکے ہوتے تھے۔ ان کی عورتیں بھی بڑی بلند ہمت، فنون لطیفہ اور ہتھیار چلانے میں ماہر ہوتی تھیں۔ وہ اپنی ناموس کی حفاظت کے لئے جان دے دینا بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتی تھیں۔ راجپوتوں میں ان خوبیوں کے علاوہ کچھ برائیاں بھی تھیں جو آخری عہد میں پیدا ہو گئی تھیں۔ جن کے سبب سے آگے چل کر انھیں مسلمانوں سے مغلوب ہونا پڑا وہ افیون، شراب اور دوسری نشیلی چیزیں استعمال کرنے لگے اور خود ساختہ عزت و آبرو کے اصولوں کی حفاظت کی خاطر ذرا ذرا سی بات پر آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ جس کی وجہ سے قومی شیرازہ بالکل منتشر ہو گیا اور ملک میں طوائف الملوکی عام ہو کر رہ گئی۔

ویش | ویشوں کے خاص فرائض جانوروں کا پالنا، دان دینا، یگیہ کرنا، بیوپار کرنا لین دین اور زراعت تھے لیکن بودھ ہو کر انھوں نے زراعت کا پیشہ ترک

کردیا کیونکہ ان کو مذہب اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس کے علاوہ ویدوں کا پڑھنا چھوڑ دیا اور اس کے رسم و رواج کو بھی بھلا بیٹھے۔ ان کا پیشہ صرف تجارت اور لین دین رہ گیا اسی کے ذریعہ یہ اپنی معاش حاصل کرتے تھے۔ ویشوں کے شاہی مناصب پر مامور ہونے، سپہ سالار بننے اور لڑائیوں میں شریک ہونے کی بھی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ یہ زیادہ تر جین یا بودھ دھرم کے پیرو تھے اور اپنے مذاق کے مطابق مندر، مٹھ، کنواں، تالاب، دھرم شالہ اور شفاخانہ وغیرہ بنوانے میں کافی روپیہ خرچ کرتے تھے۔

شودر ہندو سماج میں اوّل الذکر تین برنوں کے بعد ان کا درجہ تھا۔ یہ تینوں کے خدمت گذار اور فرمانبردار تھے۔ شروع شروع میں ان کو اچھوت نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ اونچی ذات والوں کی طرح یہ بھی یگیہ کرنے کے مجاز تھے[ع۱]۔ لیکن جب سے زراعت و دستکاری کو معیوب سمجھا جانے لگا اور یہ پیشے شودروں سے متعلق ہوکر رہ گئے اسی وقت سے ان کا درجہ گر گیا اور ان کو ذلیل سمجھا جانے لگا۔ شودر ہی کسان، دھوبی، جولاہے، لوہار، معمار، رنگریز، کمہار وغیرہ ہونے لگے اور زمانۂ زیر بحث میں پیشوں کے اعتبار سے بے شمار ذاتیں بن گئیں۔

ہواں سانگ کے زمانہ ہی سے شودروں سے زیادہ ذلیل انتجوں کو سمجھا جاتا تھا[ع۲]۔ البیرونی کے زمانہ میں یہ آٹھ طبقوں میں منقسم تھے دھوبی، چمار، مداری، ٹوکری اور ڈھال بنانے والے (کنجر)، ملاح، دھیور (مچھیرے)، چڑیمار اور جولاہے۔ شہروں اور گاؤں میں یہ لوگ چاروں برنوں سے الگ رہتے تھے۔ سماج نے ان کے بہتر بنانے کا کوئی انتظام نہیں کیا[ع۳]۔ اس طرح قومی جسم کے ایک عضو کو کاٹ کر جسم کو ہمیشہ کے لئے داغدار بنا دیا۔

ع۱ :۔ وشنو اسمرتی انک ۵، قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۵۵ ع۲ :۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۵۵ ع۳ :۔ ہندوستان کی تاریخ ص۱۲۹ از اودھ بہاری پانڈے۔

گوبند چندر کی رانی مذھباً بودھ تھی۔

غلامی کا رواج

تہذیبی نقطۂ نظر سے نبی کریم جس زمانہ میں مبعوث ہوئے ہیں اس زمانہ میں پوری دنیا پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی مصر و بابل جو کسی زمانہ میں تہذیب کے علم بردار تھے اب اُن کی حالت دگرگوں تھی روم جس کی تہذیب پر مغربیوں کو ناز ہے معاشرت کے لحاظ سے دم توڑ رہا تھا۔ وہاں انسانی جان کا احترام اٹھ چکا تھا ہزار ہا انسان رومی امراء کے شوقِ تماشا کی نذر ہو رہے تھے۔ انسان کو درندوں سے پھڑوانا یا جانوروں کی طرح ذبح کرا دینا یا ان کے جلنے کا تماشا دیکھنا ایک معمولی سی بات ہو کر رہ گئی تھی۔ غلامی کا رواج پوری دنیا میں تھا اور ہندوستان جیسے متمدن ملک میں بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا۔ مہامہوپادھیائے سری گوری شنکر ہیرا چند اوجھا کے بقول "یہ رواج (یہاں) ایک عرصۂ دراز سے تھا چنانچہ منو اور یاگیہ ولکیہ کی سمرتیوں میں اس کا تذکرہ ہے۔ وگیانیشور نے بارھویں صدی میں پندرہ قسم کے غلاموں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً خانہ زاد (گھر کی لونڈی سے پیدا)، کریت (خریدا ہوا)، لبدھ (دان میں ملا ہوا)، دایادوپاگت (خاندانی)، اناکال بھرت (قحط میں مرنے سے بچایا ہوا)، آہت (روپیہ دیکر اپنے پاس رکھا ہوا)، رن داس (قرض کی علت میں رکھا ہوا)، یدھ پراپت (لڑائی میں پکڑا ہوا)، پنجیت (جوئے وغیرہ میں جیتا ہوا)، پربرجیا وست (سادھو ہونے کے بعد بگڑ کر بنا ہوا)، بڑوا ھریت (گھر کی لونڈی کے فراق میں آیا ہوا)، اور آتم وکریتا (اپنے آپ کو بیچنے والا)، وغیرہ وغیرہ[1]۔ لیکن روم کی طرح یہاں انسانی جانوں کے ساتھ کھیل نہیں کھیلا جاتا تھا جو غلام تندہی سے کام کرتے تھے اُن کے مالک اُن کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرتے تھے اور مختلف طریقوں سے انھیں آزاد بھی کرتے رہتے تھے چنانچہ یاگیہ ولکیہ اسمرتی، نارد اسمرتی، اور متا کشرا وغیرہ میں غلاموں کے آزاد ہونے

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" ص۶۹ تا ص۷۱

اور آزاد کرنے کے طریقے مندرج ہیں۔

ستی کا رواج ہندوستان کی تاریخ میں یہی وہ زمانہ ہے جبکہ پہلی مرتبہ ستی کے رواج کا پتہ چلتا ہے۔ یہ رسم کیوں ایجاد ہوئی اس کا جواب تاریخی شواہد کی کمی کی بنا پر یقینی طور پر نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق اس حد تک مٹائے جا چکے تھے کہ وہ موت کو زندگی پر ترجیح دینے لگیں۔ شوہر کے مرجانے کے بعد نہ اُن کی وقعت سسرال میں ہوتی تھی اور نہ میکے میں، وہ منحوس خیال کیجاتی تھیں۔ اور سوسائٹی میں باوقعت زندگی بسر کرنے کی راہیں اُن پر مسدود تھیں اس کے علاوہ عقد ثانی کے مواقع بھی اُن کو میسر نہ تھے جس سے وہ کسی کو اپنا شریک حیات بنا کر اپنی بقیہ زندگی آرام سے گذار سکیں ایسی حالت میں اگر وہ موت کو خوش آمدید کہتیں تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ رسم و رواج نے غالباً اسے مذہبی رنگ دیکر جواز کی صورت نکال لی۔ بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو ستی ہونے کی تاریخ میں سب سے پہلی مثال چھٹی صدی عیسوی میں ملتی ہے جبکہ راجہ بھانو گپت کے سپہ سالار گوپ راج کی بیوی ستی ہوئی اس کے بعد یہ رسم چل پڑی لیکن ستی ہونا یا نہ ہونا پھر بھی عورت کی مرضی پر موقوف تھا اس کے علاوہ بعض اوقات عورت کے اعزا کو بھی یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ عورت کو ستی نہ ہونے دیں چنانچہ راجہ ہرش نے اپنی بہن راج شری کو ستی ہونے سے روک دیا گو اس کی ماں ستی ہوگئی۔ ہرش کی تصنیف "پریہ درشکا" میں ونذھیہ کیتو کی عورت کے ستی ہونے کا ذکر آیا ہے البیرونی اپنے عہد کے ہندوستان کی کیفیت تحریر کرتے ہوئے بیواؤں کے متعلق لکھتا ہے کہ "بیوائیں یا تو تپسونی (راہبہ) کی زندگی بسر کرتی ہیں یا ستی ہوجاتی ہیں۔ راجاؤں کی عورتیں اگر بوڑھی نہ ہوں تو ستی ہوجاتی ہیں[1]"۔

غذا ۔ اس عہد میں ہندوستان کی غذا بالعموم گیہوں، چاول، جوار، باجرہ، دودھ، گھی

---

[1] ۔ کتاب الہند جلد اول ص۱۵۵، قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۸۱

گوڑ اور شکر بھی۔ الادریسی (مشہور عربی جغرافیہ نویس) انہلواڑہ (واقع گجرات) کے بیان میں لکھتا ہے کہ "یہاں کے لوگ چاول، مٹر پھلیاں، آرد، مسور اور مچھلی اور اُن جانوروں کو جو خود مرگئے ہوں استعمال کرتے ہیں"۔[1] مہاتما بودھ سے قبل ہندوستان میں گوشت کھانے کا کثرت سے رواج تھا۔ چنانچہ قدیم مذہبی کتب اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں[2]۔ مہاتما بودھ کے بعد بھی جب تک کہ یوگ وسنیاس کے خیالات نے سماج پر پورا پورا قابو نہیں پالیا گوشت خوری بدستور جاری رہی لیکن جب ویدک دھرم پر زوال

۱۔ ہسٹری آف میڈیول انڈیا جلد دوم ص ۱۹ مولفہ جی، وی، وید۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۶۷۔

۲۔ مثالیں صدہا اور بکثرت ہیں سب کو یکجا طور پر پیش کرنے کی ان صفحات میں گنجائش نہیں محققین نیز اہل علم حضرات قدیم مذہبی کتب کی طرف رجوع فرمائیں۔ یہاں پر صرف دو چار مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

(ا) ویدر مہاراج (مہاراجہ پانڈو کے چھوٹے بھائی) فرماتے ہیں "اُمراء و شرفاء کی خوراک گوشت ہے، متوسط درجے کے لوگوں کی دودھ وغیرہ اور غرباء تیل پر گذارہ کرتے ہیں (مہابھارت ادیوگ پروہ، اشلوک ۴۹، ادھیائے ۳۴)

(ب) جنگلی جانوروں کا شکار جائز تھا اسلئے تمام آریہ بزرگ شکار سے اپنا دل بہلاتے تھے۔ اگست رشی شکار کے بڑے شایق اور مداح تھے (مہابھارت انو پروہ۔ اشلوک ۱۶ ادھیائے ۱۱۶)
سری کرشن جی سندھی گھوڑے پر سوار ہو کر پاکیزہ جانوروں کا شکار کرتے تھے (اشلوک ۵، بھاگوت پران، نصف آخر ادھیائے ۷۹، برہما پران ادھیائے ۱۱۱)۔

(ج) مہاراجہ رامچندر جی کی دھرم پتنی سیتا جی نے دریائے گنگا اور کالندی ندی کو عبور کرتے وقت منت مانی تھی کہ "اے دیوی تیری برکت سے جب ہم صحیح وسلامت لوٹیں گے تو میں شراب کے ایک ہزار گھڑے اور گوشت پڑے چاول تیرے نذر کرونگی" (رامائن (والمیکی) ایودھیا کانڈم سرگ ۵۵)

(د) جب بھرت مہاراج راجہ رامچندر جی کو منانے کیلئے چترکوٹ جارہے تھے تو راستہ میں بھردواج منی نے اُنکی بڑی شاندار دعوت کی جسمیں گوشت بھی تھا (رامائن ایودھیا کانڈم سرگ ۹۱ اشلوک ۵۲)

(بقیہ صفحہ ۱۳۱ پر)

آگیا اور اس کی جگہ جین و بودھ تعلیمات کی بنا پر اہنسا ہی پرم دھرم تسلیم کرلیا گیا تو گوشت کھانے کا رواج بھی رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔ مسعودی لکھتا ہے کہ "برہمن کسی جانور کا گوشت نہیں کھاتے"[۱] حالانکہ ویاس اسمرتی کی رو سے شرادھ میں گوشت نہ کھانے والا برہمن گنہگار ہو جاتا[۲] ہے۔[۳] چھتری اور ویش اس زمانہ میں بھی بھیڑ بکری کا گوشت اور مچھلی کھاتے تھے۔ لہسن پیاز کا استعمال البتہ ممنوع تھا اور کھانے والوں کو کفارہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ چنڈال ہر قسم کا گوشت کھاتے تھے۔

شراب کا استعمال معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مشہور عربی سیاح المسعودی نے لکھا ہے کہ اگر کوئی راجہ شراب پیتا تھا تو وہ فرمانروائی کے ناقابل سمجھا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ چھتریوں میں شراب کا استعمال بڑھتا گیا۔ چنانچہ وتسیائن کے کام سوتر سے پتہ چلتا ہے کہ صاحب ثروت لوگ باغیچوں میں جاتے اور شراب کی محفلیں آراستہ کرتے تھے۔[۴]

بقیہ صفحہ ۱۳۰ (ک) برہسپتی فرماتے ہیں کہ کچھوا، خرگوش، گوہ، مچھلی حلال ہیں۔ گاؤں کے پلے ہوئے مرغ اور سور ممنوع ہیں۔ شرادھ کے موقع پر اور بیماری میں اور برہمن کی (مہمانداری کی) خاطر حلال کئے ہوئے جانوروں کا گوشت کھانے میں کوئی گناہ نہیں (برہما پران ادھیائے ۱۱۳ اشلوک ۱۱۱، ۱۱۲)

(د) حلال جانوروں کا روزمرہ گوشت کھانے سے بھی آدمی گنہگار نہیں ہوتا۔ خود خالق نے خوراک اور کھانے والے ساتھ ساتھ پیدا کئے ہیں (منو ادھیائے ۵ شلوک ۳۰) جنگل میں رہنے والے برہمنوں کا فرض ہو کہ یگیہ (قربانی) کیلئے اور متعلقین کی پرورش کیلئے پاکیزہ جانور اور پرندے ذبح کیا کریں جیسے اگست رشی کیا کرتے تھے۔ (اشلوک ۲۲ منو ادھیائے ۵)

(ذ) آریہ بزرگ یگیہ اور ہون (یعنی دیوتاؤں کو نذرانہ پیش کرنے) کے موقع پر بالعموم قربانی کیا کرتے تھے۔ منو مہاراج کے نزدیک جنگلی اناج، دودھ، سوم، تازہ گوشت اور معدنی نمک سب قدرتی ہوی (اشیاء نذرانہ) ہیں (منو ادھیائے ۳ صفحہ ۱۲۵)۔

۱ تا ۴۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" صفحہ ۶۷، صفحہ ۶۸۔

[illegible]

میں حصول مقصد کے لئے قربان کرنے لے گیا تھا۔ اسی طرح "گوڈوہو" میں بھی دیوی کو خوش کرنے کے لئے آدمیوں اور جانوروں کے قربان کئے جانے کا ذکر موجود ہے[1]۔ عرب سیاح جو وقتاً فوقتاً ہندوستان میں آتے جاتے رہے انھوں نے بعض توہمات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ابوزید حسن سیرافی (۲۶۴ھ / ۸۷۸ء) نے دکن کے بارے میں لکھا "لوگ بُت پرست ہیں اور توہم پرستی حد سے زیادہ ہے"۔ ابن ندیم نے اپنی کتاب "الفہرست" میں جو ۳۷۰ھ / ۹۸۰ء میں ترتیب دی گئی ہے یعقوب بن اسحاق کندی (۲۴۹ھ / ۸۶۴ء) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک کتاب کا حوالہ دیا ہے اس میں دکن کا حال تحریر کرنے کے بعد ملتان کی نسبت لکھا ہے "ملتان بلخ کے شہروں سے قریب ہے۔ یہاں پہاڑوں کی چوٹیوں اور سطح پر بیشمار پجاریوں کے مکان ہیں اور اسی جگہ ان کی قربانیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہاں دو بت ہیں۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۳۲ = یہ معززترین مہمان کے لئے تیار کیا جاتا تھا اس کے ساتھ سالم زندہ گائے یا اس کا گوشت مہمان کی خدمت میں پیش کیا جاتا تھا (ملاحظہ ہو اُتر رام چرتیم انک ہ مُصنفہ بھا بھوتی، رامائن دوالمیکی) اُتر کانڈم سرگ ۴۳ ص ۱۳۳، مہا بھارت سبھا پروہ ادھیایہ ۲۱، ادیوگ پروہ ادھیایہ ۳۵، شانتی موپروہ ادھیایہ ۳۲۶، ادیوگ پروہ ادھیایہ ۸، ہری ونش پُران وشنو پروہ شلوک ۴۷ ادھیایہ ۱۲۱ وغیرہ وغیرہ "شرادھ" بزرگوں کی ارواح کو بغرض ایصال ثواب جو کھانا کھلایا جائے یا جو نذرانہ دیا جائے اسکو شرادھ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں (ملاحظہ ہو اشلوک ۴، ادھیایہ ۲۱۸ سکند پُران ناگر کھنڈ ۲)

(ف) آبادی کے جانوروں میں سے سات اور جنگلی جانوروں میں سے سات بلحاظ شرافت ذات قربانی کیلئے منتخب کئے گئے ہیں (اشلوک ۲۱ مہا بھارت شانتی موپروہ ادھیایہ ۱۶۸)۔ انکی تفصیل شانتی پروہ ادھیایہ ۲۶۹ کے حاشیہ پر یوں درج ہے۔ گائے، بکرا، انسان، بھیڑ، خچر، گدھا یہ آبادی کے جانور ہیں۔ شیر، چیتا، سور، بھینس، ہاتھی، ریچھ اور بندر یہ سات جنگلی جانور ہیں۔

ان سب کے ذبیحہ کے جو طریقے اور موقعے ہیں انکو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

[1]۔ قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۲، ص ۲۳

ایک کا نام "جنبکست" اور دوسرے کا "زنبکست" ہے۔ یہ اسّی ہاتھ بلند ہیں۔۔۔ ہندوستانی اس کا حج کرتے ہیں۔ اور قربانی و بخور وغیرہ چڑھاتے ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ جو لوگ زیارت کے لئے آتے ہیں وہ اس جگہ سے پاپیادہ ہو جاتے ہیں جہاں سے وہ (بت) نظر آنے لگتا ہے اور اگر غلطی سے اس کے خلاف ہو جائے تو پھر اسی جگہ واپس جانا پڑتا ہے کہ جہاں سے وہ نظر نہ آئے اور واپسی میں پھر جہاں سے نظر آنے لگے تو پیدل ہو جاتے ہیں اور یہ محض اس کی عظمت و بزرگی کے لئے ہے۔ یہاں کبھی کبھی پچاس ہزار تک جانیں قربان ہو جاتی ہیں"۔ مؤلف نے اس کی تشریح نہیں کی کہ یہ جانیں جانوروں کی ہوتی تھیں یا آدمیوں کی لیکن ابن رستہ (۲۹۰ھ / ۹۰۳ء) کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ آدمی بھی اپنی جانیں قربان کرتے تھے۔ وہ ملتان کے بتوں[1] کے بارے میں لکھتا ہے کہ "بعض ہندو اس (بت) کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی آنکھیں نکال کر اپنے ہاتھ پر رکھ لیتے ہیں اور اُس سے اپنی عمر کے طویل ہونے اور روزی میں اضافہ کئے جانے کی بابتہ عرض کرتے ہیں۔ بعض ہندو اس خیال کے دیکھے کہ وہ اِس بت سے اس پر فدا ہونگی اجازت لیتے ہیں اور جب اس کو اجازت مل جاتی ہے (جس کا کوئی طریقہ برہمنوں نے نکالا ہوگا) تو وہ ایک لمبی لکڑی لیکر اس کا سِرا نوکیلا بناتے ہیں اور اس کو زمین میں گاڑ دیتے ہیں پھر او پر جا کر وہ (جس کو اجازت مل چکی ہے) اس پر اپنا پیٹ رکھ کر اس طرح دباتا ہے کہ وہ نوکیلی لکڑی اس کے دوسرے جانب سے نکل جاتی ہے اور وہ مر جاتا ہے"۔ اسی طرح کے اور بھی توہمات ہیں جن کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے "اس بُت کیلئے ایک باورچی خانہ بھی ہے جہاں عمدہ چاول[2] پکائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ

ع۱:- ابن رستہ نے جس بُت کا ذکر کیا ہے وہ غالباً خالص ہندوؤں کا ہے اس کو شو کی مورتی اور جو کبھی بھی کہتے ہیں بعد کے سیاحوں نے جس بُت کا ذکر کیا ہے وہ غالباً گوتم بدھ کی مورتی ہے۔ ملاحظہ ہو جلد اول ص۶۶، ۶۵ تاریخ ہذا قلمی۔ ع۲:- برہما اور مدراس کے مندروں میں اب بھی مورتیوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے لیکن کھانے میں زیادہ تر لڈو اور پھل ہوتے ہیں (ملاحظہ ہو فٹ نوٹ بر ص۲۰۴ تاریخ سندھ از مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی)

دوسرے قسم کی چیزیں مثلاً مچھلی، ساگ وغیرہ تیار کرکے اس کے آگے اس طرح رکھا جاتا ہے کہ کیلے کا بہت بڑا پتہ جس کا عرض اس قدر ہوتا ہے کہ ایک یا دو آدمیوں کو اس میں لپیٹ سکیں اس کے آگے بچھا دیتے ہیں پھر انسان کے نصف قد کے برابر چاول انڈیل دیتے ہیں پھر سب سے بڑا پجاری کیلے کا ایک پتہ بطور پنکھے کے جھلتا ہے یہاں تک کہ اس (گرم چاول) کے ابخرات بت کے منہ کو لگتے ہیں اور اسی کو وہ لوگ اس کا کھانا سمجھتے ہیں...... کھانے سے قبل گانا بجانا ہوتا ہے کبھی کبھی سو سو لڑکیاں (جو غالباً دیوداسی ہونگی) جن کو اسی کام کے لئے وظیفہ ملتا ہے اس کام کو انجام دیتی ہیں .... کھاتے وقت دروازہ بند کر دیتے ہیں اور جب وہ (بت) کھا چکتا ہے تو دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اس کے بعد کھانا وقف ہے جو چاہے کھائے یہاں تک کہ پرندے اور کتے بھی اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔ یہ کام ہر روز کیا جاتا ہے......"

سلیمان تاجر (۲۳۷ھ / ۸۵۱ء) جس نے بسلسلۂ تجارت عراق سے چین تک متعدد سفر کئے ہیں اور جس کے بیانات سلسلۃ التواریخ کے نام سے ۱۸۴۵ء میں پیرس سے شائع ہو چکے ہیں ہند کی بعض توہم پرستانہ غیبی آزمائشوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ملزم کے ہاتھ پر سات پان رکھ کر اس پر گرم (دہکتا ہوا) لوہا رکھا جاتا ہے یا کھولتے ہوئے پانی میں سے اس کو انگوٹھی نکالنا پڑتی ہے۔ اگر اس صورت میں اس کا ہاتھ جل جائے تو مجرم خیال کیا جاتا ہے"[۱]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قانونی سزاؤں کے علاوہ ہندوستان میں غیبی آزمائشوں کا طریقہ بھی رائج تھا[۲]۔

ع۱ :۔ عرب و ہند کے تعلقات باب اوّل مولفہ ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی

ع۲ :۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۱۸۷ مولفہ مہا مہوپادھیائے (رائے بہادر) گوری شنکر ہیرا چند اوجھا۔

قرونِ وسطیٰ کے بعض عجیب و غریب رسوم و عادات

اِس عہد کی معاشرتی حالت

کیا تھی اس کا اندازہ لگانے کے لئے اُن بعض رسوم و عادات کا مطالعہ بھی ضروری ہے جن کو البیرونی نے کتاب الہند میں ذرا تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ البیرونی نے ہندوستان میں ایک عرصہ تک رہکر یہاں کے مذہب، ادب، جغرافیہ، ہیئت و نجوم نیز رسم و رواج اور قوانین کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے۔ وہ ہندوؤں کے رسوم و عادات کے بارے میں لکھتا ہے کہ "ہندوؤں کا طور و طریقہ ہمارے زمانہ میں ہمارے ملک والوں کے رسم و رواج سے اس درجہ مخالف ہے کہ وہ اس وجہ سے ہم لوگوں کے لئے ایک اعجوبہ بنجاتا ہے اور ہم لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے بالقصد حالت طبعی کو اُلٹ دیا ہے" ان کے بعض رسوم حسب ذیل ہیں:۔

(۱) "یہ لوگ بال بالکل نہیں منڈاتے۔ اِن کی اصلی حالت گرمی کی شدت سے ننگے رہنے کی ہے۔ بال اس لئے نہیں منڈاتے کہ کھلا رہنے سے سر کو گرمی نہ چڑھ جائے۔

(۲) داڑھی کی حفاظت کے لئے اس کی چوٹیاں گوندھ لیتے ہیں اور موئے زیرِ ناف صاف نہیں کرتے۔

(۳) ننگے رہنے پر فخر کرنے کے لئے ناخن بڑھائے رہتے ہیں اس لئے کہ ناخن کے ساتھ محنت طلب کام نہیں ہو سکتا اور اس لئے بھی کہ اس سے سر کھجانے اور جوں مارنے میں آرام ملتا ہے۔

(۴) نہار منہ شراب پیتے ہیں اس کے بعد کھانا کھاتے ہیں۔

(۵) گائے کا پیشاب تھوڑا تھوڑا پیتے ہیں اور اس کا گوشت نہیں کھاتے۔

ع۱؎ سلیمان تاجر کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ تین تین ہاتھ لمبی داڑھیاں رکھنے کے عادی تھے (ملاحظہ ہو عرب و ہند کے تعلقات باب اوّل)

[illegible]

ہندوؤں کا تعصب اجنبیوں کے ساتھ اور اُس کے وجوہات

ہندوؤں کے مذہبی معتقدات، رسم و رواج نیز عادات عہد یمنی کے شروع زمانہ میں جیسے بھی کچھ تھے ان کا ایک اجمالی نقشہ گذشتہ سطروں میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ نقشہ ادھورا رہ جائے گا اگر اس میں یہ نہ دکھایا جائے کہ ہندوؤں کا طرز عمل اور برتاؤ اجنبیوں کے ساتھ کیسا تھا۔ البیرونی نے ۴۲۱ھ تک پنجاب کے کسی علاقہ میں رہ کر اپنی علمی تحقیقات کو مکمل کیا تھا اس کو یہیں کے لوگوں سے واسطہ پڑا اور انھیں کا حال اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ یہ وہ علاقہ تھا جو البیرونی کے پنجاب میں داخل ہونے سے کچھ ہی دن پہلے اسلامی سلطنت کا جزو قرار پایا تھا۔ اور جہاں اسلامی اثرات مفقود تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کو بھی ذہن میں رکھئے کہ یہاں (پنجاب) کے لوگوں کے دلوں میں حملہ آوروں (مسلمانوں) اور ان کے تمام ہم قوم اور ہم مذہب لوگوں کی طرف سے معاندانہ جذبات کا موجود ہونا بالکل قدرتی بات تھی۔

البیرونی نے ہندوؤں کی مغائرت کے کئی ایک اسباب بتلائے ہیں جن میں سب سے پہلا "زبان کے اختلاف کا ہے۔ اور دوسرا دین کے مختلف ہونے کا۔ دین کے بارے میں لکھتا ہے کہ "ہندو دین میں ہم سے کلی مغائرت رکھتے ہیں۔ نہ ہم کسی ایسی چیز کا اقرار کرتے ہیں جو ان کے یہاں مانی جاتی ہے اور نہ وہ ہمارے ہاں کی کسی چیز کو تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مذہبی نزاع کم کرتے ہیں اور بحث و مناظرہ کے سوا جان، بدن اور مال کو نقصان نہیں پہونچاتے لیکن غیروں کے

(اُردو ترجمہ صفحہ ۱۳۱)

(۱) کتاب الہند از البیرونی مترجمہ سید اصغر علی ص ۲۳۹ تا ص ۲۴۲ - جنوبی ہند کے رسوم و عادات کا نقشہ "تحفۃ المجاہدین" مؤلفہ شیخ زین الدین المعبری صفحات ۲۰ تا ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیے۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ حکیم سید شمس اللہ قادری نے شائع کرا دیا ہے (مؤلف)

ساتھ ان کی یہ روش نہیں ہے۔ غیروں کو یہ لوگ ملیچھ یعنی ناپاک کہتے ہیں اور ان کو ناپاک سمجھنے کی وجہ سے ان سے ملنا جلنا۔ شادی بیاہ کرنا۔ ان کے قریب جانا یا ساتھ بیٹھنا اور ساتھ کھانا جائز نہیں سمجھتے"

اس کے بعد لکھتا ہے کہ "قطع تعلق کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ لوگ رسم و عادات میں ہم سے اس درجہ اختلاف رکھتے ہیں کہ اپنے بچوں کو ہم سے اور ہماری ہیئت و لباس وغیرہ سے تقریباً ڈراتے ہیں۔ اور ہم لوگوں کو شیطان کی طرف منسوب کرتے ہیں اور شیطان کو خدا کا مخالف یا دشمن قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ اس نسبت کا استعمال عام طور پر ہم لوگوں کے حق میں کیا جاتا ہے لیکن وہ ہمارے اور کل دوسری قوموں کو درمیان مشترک ہے"

"نفرت و منافرت کے بڑھ جانے کا (چوتھا) سبب یہ ہوا کہ فرقہ شمنیہ (بودھ) اگرچہ برہمنوں سے سخت عداوت رکھتا ہے پھر بھی بمقابلہ دوسرے غیر ہندو مذاہب کے ہندوؤں سے زیادہ قریب ہے" اس کے بعد سبب بیان کیا ہے کہ چونکہ بلخ۔ کابل۔ پنجاب وغیرہ مسلمانوں نے بودھوں سے چھین لئے اس لئے مسلمانوں سے بودھ ہندو کے مقابلہ میں نفرت کرنے لگے۔

منافرت کا پانچواں سبب اس نے ہندوؤں کی خود پسندی و خود بینی کو قرار دیا ہے اس کے بارے میں وہ تحریر کرتا ہے: "ان لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ملک ہے تو ان کا ملک۔ انسان ہیں تو ان کی قوم کے لوگ۔ بادشاہ ہیں تو ان کے بادشاہ۔ دین ہے تو وہی جو ان کا مذہب ہے اور علم ہے تو وہ جو اُن کے پاس ہے۔ اس لئے یہ لوگ بہت تعلّی کرتے ہیں اور جو تھوڑا سا علم ان کے پاس ہے اس کو بہت سمجھتے ہیں اور خود پسندی میں مبتلا ہو کر جاہل رہ جاتے ہیں۔ جو کچھ یہ جانتے ہیں اس کو تبلانے میں بخل کرنا اور غیر قوم والے در کنار خود اپنی قوم کے نااہل لوگوں سے بھی شدت کے ساتھ چھپانا ان کی

لیکن ہندوستان کی آبادی کے یہ چاروں بڑے بڑے طبقے بھی اپنی اپنی جگہ ایک متحد گروہ نہ تھے بلکہ ہر طبقے میں الگ الگ بہت سی ذاتیں بن گئیں تھیں۔ ہر شخص اپنی ذات یا برادری کے رسم و رواج اور آئین و ضوابط کا پابند تھا۔ اور اس کی اصلی قوم یا ملک جو کچھ سمجھو یہی محدود جماعت تھی۔ یہاں پر اتنا اور یاد رکھئے کہ ہر ملک کے اندر ترقی کے اس ابتدائی دور میں جبکہ انسان نے آپس میں مل جل کر رہنا سیکھا تو اس کے تمدن کی پہلی صورت خاندان، قبیلہ یا برادری تھی اور ہر فرد اسی قبیلہ یا برادری کو اپنی دنیا سمجھتا تھا۔ لیکن زمانہ کی ترقی کے ساتھ جب تمدن کی ضرورتیں بڑھیں تو مختلف قبائل کے میل جول سے انسانی برادری کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا گیا اور اگر کسی وجہ سے ملک کی تمام آبادی سیاسی طور پر ایک حکومت کے زیر نگیں نہ رہ سکی تو بھی اُنکے رسم و رواج اور معاشرت کے اصول بہت یکساں ہو گئے۔ اور شادی بیاہ۔ کھانے پینے کے معاملات میں باہمی یگانگت پیدا ہو گئی۔ لیکن ہندوؤں کے قبائل یا برادریوں میں جس قسم کی "پابندی" کا آئین مروج تھا اور ہے۔ اُس کی نظیر کسی ملک میں نہیں مل سکتی۔ تو پھر ایسی سوسائٹی جو ابھی تمدن کے ابتدائی دور میں تھی اور اُسی پر قائم رہنا چاہتی تھی بھلا زمانہ کی تیز رفتاری کا ساتھ کیونکر دے سکتی تھی۔

اس لئے بعض مورخین کا یہ کہنا کہ ہندوؤں کی ترقی تمدن کو غیر اقوام کے حملہ نے خراب کیا صحیح نہیں ہے۔ تاریخ سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ہندوؤں کے عرصۂ دراز (۲۵۰۰ ق م ... اتک) ہندوستان میں رہنے کے بعد مسلمان اس ملک میں آئے ہندو تمدن اگر ترقی کی طرف مائل ہوتا تو اس کا بہت کافی وقت اور موقع تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں۔ کہ جس قدر زمانہ گذرتا گیا اُسی قدر ہندوؤں میں زوال و پستی کے آثار پیدا ہوتے چلے گئے۔ قدیم مذہب میں جس قسم کی سادگی اور زندہ دلی پائی جاتی تھی اس کا مقابلہ جدید ہندو دھرم سے کیجئے۔ تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ اور ثابت ہوگا

کہ عہد مینی کے شروع میں ہندو سوسائٹی پر ایسے عقائد و خیالات چھا گئے تھے جو آدمی کی ساری خوشدلی اور اولوالعزمی کو مٹا دیتے ہیں۔ زندگی اور زندگی کا ہر فعل۔ قوم وسلطنت کا عروج و زوال غرضکہ ہر چھوٹا بڑا واقعہ "کرموں کا پھل" اور "ہونی بات" مانا جاتا تھا تناسخ "یعنی پیدائش و موت کے لامتناہی دور پر غور کرتے کرتے اگر دماغ پریشان نہ ہوتا تو اس قابل بھی نہ رہتا تھا کہ انسان اپنے عزم و فکر سے کام لیکر اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کی سعی کرتا۔ اس فلسفہ کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عمل کی قوتیں مضمحل ہو جائیں اور اخلاق و اذہان اور سیاست و معاشرت میں ہر قسم کی ترقیاں رُک جائیں یہی ہندو قوم کا اصلی مرض تھا۔ اس کا الزام کسی غیر قوم کو دینا فضول ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہندوستان کا مہلک جمود کسی بہت بڑے انقلاب کے بغیر ہرگز دور نہیں ہو سکتا تھا۔ اور یہ انقلاب مسلمانوں کے آنے سے بروئے کار آیا۔

جس کی وجہ سے ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک از سرِ نو زندگی کے آثار پیدا ہو گئے"[1]

---

[1] بحوالہ "تاریخ ہند" مولفہ ہاشمی صاحب ص۲۲ –

باب سوم

نئی حکومتیں سنہ ۷۰۰ تا ۱۲۰۰ء

فصل اوّل۔ راجپوتوں کا عہد حکومت

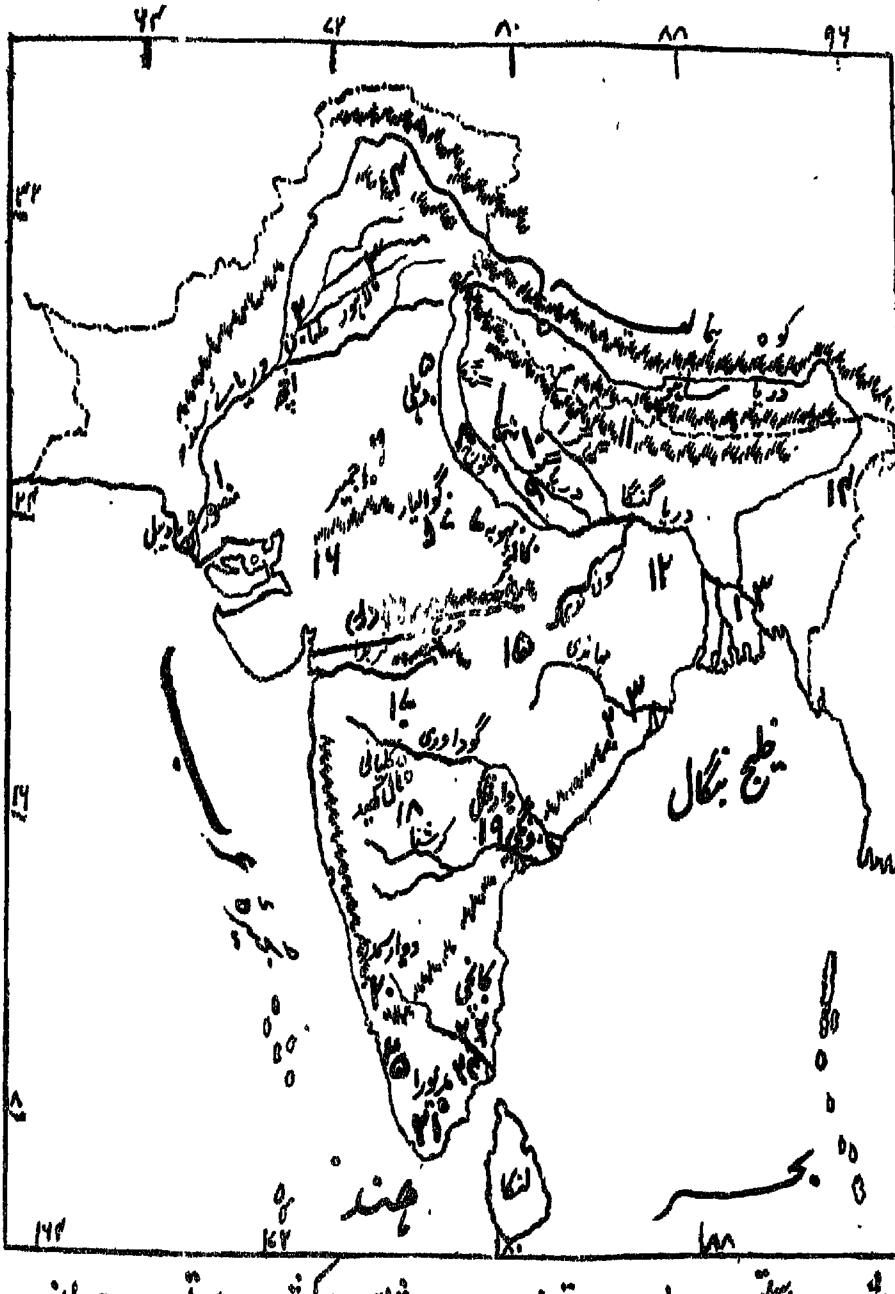
سندھ کے حالات بیان کرتے وقت ہم یہ بتا چکے ہیں کہ راجہ ہرش (۶۰۶ تا ۶۴۷ء) کے بعد قنوج کی سلطنت کا شیرازہ بکھرتے ہی شمال وجنوب، مشرق ومغرب میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں خودسر ہوگئیں۔ اور اُن میں آئے دن لڑائیاں اور فسادات رہنے لگے۔ شخصی وراثتی حکومتوں میں مرکز کمزور ہوتے ہی سرداران سلطنت کا خودمختار وخودسر ہوجانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہندوستان نے بارہا طوائف الملوکی کے دور دیکھے ہیں۔ لیکن ہندوؤں کی تاریخ میں اس مرتبہ (۷۰۰ ــ ۱۲۰۰) کا بگڑنا ایسا تھا جس کے بعد پھر پنپنا انھیں نصیب نہ ہوا یہی سبب ہے کہ قدیم تاریخ کے اس آخری دور میں ہمیں اشوک یا چندرگپت جیسا کوئی اقبال مند فرمانروا دکھائی نہیں پڑتا۔ طاقتور سے طاقتور ریاست کی حدودِ حکومت بھی ہندوستان کے دو ایک صوبوں سے آگے نہ بڑھ سکیں حشرات الارض کی طرح نکلی ہوئی ان ریاستوں کے حالات جمع کرنا صرف اس مورخ کا کام ہے۔ جو کسی خاص ریاست کی مقامی تاریخ تیار کرے۔ ہم صرف اس پر اکتفا کریں گے کہ بعض مشہور ریاستوں اور شاہی خاندانوں کے مجمل حالات لکھ دیں تاکہ ناظرین کو اس بات کا سرسری اندازہ ہو سکے کہ خیبر سے آنیوالے ترک مسلمان سے کچھ پہلے ہندوستان کی سیاسی حالت کیا تھی۔



شمسی حکومت ۱۲۳۶ء .... (مرتبہ مؤلف)

مشہور مقامات:— ۱۔ سیالکوٹ ۲۔ جالندھر ۳ کوئل ۴ برن ۴ امروہہ ۵ سنبھل ۶ بدایوں ۸ قنوج ۹ کالپی ۱۰ اودھ ۱۱ فیض آباد ۱۲ کڑا ۱۳ الہ آباد ۱۴ پنڈوہ ۱۵ اکلالہ ۱۶ ست گاؤں ۱۷۔ دیوکٹی ۱۸ کلیانی ۱۹ مالکھید ۲۰ ترچناپلی ۲۱ تنجور ۷ کانٹی

راجپوتوں کا زمانہ



مشہور ریاستیں:- ۱ منصورہ ۲ ملتان ۳ سندھ شاہی ۴ کشمیر ۵ تومر ۶ چوہان ۷ چندیلے ۷ الف کچھپ گھٹ ۸ گورجر-پرتیہار-گہروار ۹ بہار ۱۰ اتھارد ۱۱ نیپال ۱۲ پال ۱۳ سین ۱۴ آسام ۱۵ کلچوری ۱۶ سولنکی ۱۶ الف پرمار ۱۷ یادو ۱۸ چالوکیہ-راشٹرکوٹ ۱۹ کاکتی ۲۰ ہوئسل ۲۱ پانڈیہ ۲۲ چولا ۲۳ گنگا خاندان ۲۴ پلوی ۲۵ چیرا -

(مرتبہ مؤلف)

راجپوت کون ہیں

اس زمانے میں سب سے نمایاں چیز راجپوت قوم کا غلبہ ہے۔ جن کے کئی خاندانوں کی شمالی ہندوستان میں جا بجا حکومتیں قائم ہوئیں۔ اُن کی اصل ونسل کے بارے میں اب کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ یورپی محققین نیز اکثر علمائے ہند کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ لوگ اُن حملہ آور قبائل کی اولاد سے ہیں جو مگدھ کے زوال کے بعد سے ۵۰۰ صدی عیسوی تک برابر ہندوستان میں آتے رہے برہمنوں نے ان کو حکمراں ہونے کی وجہ سے سوسائٹی میں اونچی جگہ دیکر نئے ہندومت کا حامی بنالیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس موقع پر پنجاب کے ایک نہایت مشہور ہندو لیڈر و مورخ لالہ لاجپت رائے کی تاریخ ہند حصّہ اوّل سے راجپوتوں کی اصلیت کے بارے میں حسب ذیل اقتباس پیش کر دیا جاوے۔

"اس میں کچھ شک نہیں کہ موجودہ ہندو سوسائٹی میں ایسے بہت سے آدمی شامل

---

۱ ب۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب نے راجپوتوں کے حسب ونسب پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ملاحظہ ہو میڈیول انڈیا صفحہ ۲۵ تا صفحہ ۳۱ نیز

1. Early history of India by Smith
2. Annals and Antiquities of Rajasthan by Tod edited by Crooke vol. I, PP73—97.
3. Imperial Gazetteer Vol. II PP 308—9
4. Dr Bhandarkar (J. Bom. B. R. A. S 1903, PP413-33.
5. History of Mediaeval India Vol. II PP1-63 by vaidya
6. Journal Anthrop Institute 1911, P.P 42.

مذکورۂ بالا نامور مورخین کے بخلاف سری گوری شنکر اوجھا کی رائے یہ ہے کہ راجپوت دراصل قدیم کشتریوں کی اولاد سے ہیں (ملاحظہ ہو ہسٹری آف راجپوتانہ جلد اوّل)۔

کے مطابق یہ قوم "اگنی کل" یعنی آگ کی نسل سے پیدا ہوئی ہے۔ پرمر۔ پرہار۔ چوہان اور سولنکی چاروں مشہور راجپوت ذاتوں کا سلسلۂ نسب آگ پر جا کر ختم ہوتا ہے۔۔۔ ان ذاتوں کے علاوہ کچھ ایسی ذاتیں بھی راجپوتوں میں شامل ہو گئی ہیں جو نسلاً ہندوستان کے قدیم باشندوں سے تعلق رکھتی تھیں اس دور کی رہزنی کے بعد طوائف الملوکی اور بے ربطی سے فائدہ اٹھا کر یہ ذاتیں ذی اثر اور ذی اقتدار ہو گئیں اور سیاسی اقتدار نے انھیں راجپوت بنا دیا۔ چندیل۔ گرہ وبیر اور راٹھور راجپوت اسی شاخ سے ہیں۔ یہ تینوں ذاتیں جنوبی راجپوت کہلاتی ہیں شمالی راجپوت یعنی پرمر پرہار اور چوہان جنوبی راجپوتوں سے ہمیشہ سرگرم پیکار رہتے تھے۔"

مذکورۂ بالا اقتباسات پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے زمانہ سے راجپوتوں کا عروج شروع ہوا۔ یہ ہندی قوم نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں کے اکثر قبیلے مغول و تاتاری ہیں جو مسلمانوں کی آمد کے وقت یا اس سے کچھ ہی پہلے ہندی قوم میں شامل ہوئے تھے۔ جنوبی راجپوت ہندوستان کی غیر آریہ قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ برہمنوں نے بودھوں کی سیاسی حالت کے اضمحلال و کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو دوبارہ واپس لانے کے لئے اپنی اس نوزائیدہ راجپوت قوم سے حسب دلخواہ مدد لی۔ یہ نئی قوم مغلوں اور تاتاریوں کے جنگجو قبائل اور غیر آریوں یعنی شودروں کے ذی حوصلہ اور بہادر لوگوں کو اپنا ہمدرد اور ہوا خواہ بنا کر تیار کی گئی اور ان کو راجپوت کا خطاب دیا گیا۔

راجپوتوں کی بعض خصوصیات

راجپوتوں کے سب سے بڑے طرفدار مشہور و معروف مورخ مسٹر ٹاڈ اور پنڈت گوری شنکر اوجھا نے ان کی قومی خصوصیات کا نہایت دلچسپ خاکہ پیش کیا ہے۔ مسٹر ٹاڈ نے صحیح لکھا ہے کہ راجپوت اقوام نے ملک کی حفاظت کے لئے جان توڑ کوشش کی۔ وہ بڑے

عزت و آبرو کا انھیں اتنا خیال رہتا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے تھے اور اسی وجہ سے ان میں ہمیشہ آپس میں تلوار چلتی رہتی تھی جس نے قومی اتحاد کو غیر ممکن بنا دیا[1]۔ صغر سنی کی شادیوں کا رواج عام ہو چلا تھا اور امیروں میں متعدد شادیاں کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا[2]۔ چنانچہ اجمیر کے راجہ بیسل دیو کی ساٹھ رانیاں تھیں اور اسکی ایک بیوی "راج متی" نامی ۱۲ برس کی عمر میں بیاہ کر اجمیر آئی تھی۔

انتظام حکومت راجپوتوں کے دور حکومت میں مرکزی حکومت کا تصور ختم ہو چکا تھا ملک بیشمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا جن میں بڑی سے بڑی ریاست کے حدود حکومت عہد حاضر کے ایک صوبہ سے زائد شاید کبھی نہیں ہوئے ان ریاستوں کے راجہ اپنے پڑوسیوں کو شکست دیکر اپنی ریاست کو وسیع کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے اس طرح اکثر و بیشتر سب ہی چھتریوں کا مقصد چکرورتی راجہ بننے کا رہتا تھا اسلئے پڑوسیوں سے نبرد آزمائی کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً سب ہی ریاستوں کا انتظام حکومت فوجی ہو گیا۔ ہر راجہ سب سے زیادہ توجہ اپنی فوجی طاقت کو مضبوط کرنے میں صرف کرتا تھا۔ اسی سبب سے ریاست میں جاگیرداری کے رواج کو فروغ ہوا۔ ہر جاگیردار اپنی محدود زمینداری میں ایک مستقل چھوٹا راجہ مانا جاتا تھا اس کا فرض تھا کہ وقت ضرورت اپنے آقا کی روپیہ اور فوج سے مدد کرے۔ یہ جاگیردار بالعموم راجہ کے رشتہ دار یا اہل قبیلہ ہوتے تھے جن کی وفاداری مسلّم تھی لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ وقت پڑنے پر خود بھی راجہ ہونے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ اسلئے وہ بھی فوج کا زیادہ خیال رکھتے تھے ان کا رعایا سے صرف

---

[1] ۔ ٹاڈ راجستھان [illegible] جلد دوم میڈیول انڈیا [illegible] از ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب

[2] ۔ تاریخ ہند از اودھ بہاری پانڈے صفحہ [illegible] بحوالہ [illegible] مولفہ ستیہ جیون ورما ایم اے قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب ۔ ۱۹۳ تا ۱۹۵ ۔

اتنا تعلق رہتا تھا کہ ان کو سالانہ محصول ملجائے اور کوئی بغاوت نہ ہو۔ رعایا کی ترقی و بہبودی کا انھیں کوئی خاص خیال نہیں رہتا تھا۔ اس لئے رعایا کو بھی ان سے کوئی ہمدردی نہیں تھی وہ اپنا فرض صرف لگان دینا سمجھتی تھی۔

قانوناً یا رواجاً راجہ پوری ریاست کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ وہ ریاست میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے قانون بناتا تھا۔ رعایا اس کے پاس اپنی فریاد لے جاسکتی تھی اس طرح وہ صدرِ منصف کا کام بھی کرتا تھا۔ لڑائی میں وہ ہمیشہ سپہ سالاری کا عہدہ اختیار کرتا تھا۔ جو راجہ فوجی قابلیت نہیں رکھتا تھا اس کا عرصہ تک گدّی پر رہنا ناممکن ہوجاتا تھا۔ اس کے مشیرِ کار برہمن وزیر، اعلیٰ عہدے دار اور اہلِ خاندان ہوتے تھے۔ کبھی کبھی برہمن وزیر بھی سپہ سالاری کے فرائض انجام دیتے تھے باقی تمام اونچے عہدے زیادہ تر چھتریوں ہی کو ملتے تھے۔

گانوں کا انتظام قریب قریب گپت عہد کی طرح ہوتا تھا۔ گانوں کی رعایا اپنے آرام کی نگرانی خود ہی کرتی تھی۔ راجہ یا جاگیردار کے پاس مقدمے بہت کم جاتے تھے کیونکہ عدل و انصاف کا معقول انتظام نہ تھا گو کچھ جج ضرور رہتے تھے۔ جنوبی ہند میں پلووں اور چولوں کے زیرِ نگرانی مقامی سوراج کے ادارے ترقی کر رہے تھے۔ گانوں کی پنچایتوں کے علاوہ ضلعوں اور صوبوں کے حکمرانوں کی مدد کے لئے رعایا کی منتخب سبھائیں بنی تھیں جس کی وجہ سے یہاں شمالی ہند کے مقابلہ میں رعایا زیادہ پُر امن اور خوشحال تھی۔

ریاست کے مالیات کا انحصار زیادہ تر لگان اور ان نذرانوں پر تھا جو کسانوں اور ماتحت جاگیرداروں سے وصول ہوتا تھا۔ نیت اور شاستر (قانون) کی رُو سے راجہ کو رعایا سے ٹیکس وصول کرنے کا حق حاصل تھا۔ لگان عائد کرنے کے تین طریقے مروّج تھے یعنی بٹائی، تخمینی لگان، پیمائشی لگان۔ مسلمانوں نے بھی انھیں

(حاشیہ نوٹ صفحہ ۱۵۱ پر ملاحظہ فرمائیے)

طریقوں کو اپنے دورِ حکومت میں جاری رکھا۔ لگان کو حکومت جنس یا روپیہ کی شکل میں وصول کرتی تھی۔ ہندو دھرم شاستر کی رُو سے راجہ کو قانوناً یہ حق حاصل ہے کہ وہ رعایا سے کل پیداوار کا بقدر ۱/۶ وصول کرے لیکن عملاً یہ شکل قائم نہیں رہ سکی۔ اس کے بیّن[۱] ثبوت ہیں چنانچہ جُبک اور کوٹلیہ ارتھ شاستر میں زائد وصول کرنے کی مراعات روا رکھی گئی ہیں۔ شکرنیت میں اس کی مزید صراحت ملتی ہے۔ اس کی رو سے ۱/۴ حصہ لگان صرف بنجر اور پہاڑی زمینوں پر عائد کرنا چاہیے ورنہ زرخیز زمینوں سے راجہ بقدر ۱/۳، ۱/۴ اور ۱/۲ تک وصول کر سکتا ہے[۱]۔ لگان کی یہ شرح یقیناً بہت زائد ہے اور بالخصوص اس صورت میں جبکہ ریاست کی طرف سے آبپاشی کا کوئی انتظام نہ ہو۔ آبپاشی کی سہولتیں مہیا کرنے میں ریاست کے مزید مطالبات پیداوار کے ۱/۵ سے لیکر ۱/۳ تک ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کی آمد تک بہت سے نئے قسم کے ٹیکسوں کا بار بھی رعایا پر پڑ چکا تھا جس کے بارِ گراں سے وہ دبی ہوئی تھی اور جن کی ادائیگی اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی[۲]۔ شکرنیت میں مکانوں اور دوکانوں کے ٹیکس کا تذکرہ ملتا ہے اسی طرح منوجی مہاراج نے ٹیکسوں کی ایک لمبی فہرست دی ہے جس میں خاص خاص ٹیکس جن جن چیزوں پر عائد کئے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں مثلاً گوشت، شہد، گھی، خوشبویات،

(فٹ نوٹ صفحہ ۱۵۰ ملاحظہ ہو)

۱۔ Agrarian System in ancient India pp 26-27,
Administration of the Sultanate of Delhi pp 92-129
Hindu Revenue system pp 37, 38, 61 + 62

۱۔ شکرنیت ص ۱۴۲، ص ۱۴۸

۲۔ History of Medieval Hindu India p 140; Albairani p 276

ادویہ، سیّال چیزیں، پھول، جڑیں، پھل، پتیاں، ہری گھاس، کھالیں، مٹی کے برتن اور پتھر کی چیزیں وغیرہ وغیرہ۔[۱]

صنعت و حرفت اور علم و ادب کی ترقی | اگرچہ ملک میں مستقل طور پر امن و امان نہیں تھا پھر بھی صنعت و حرفت اور علم و ادب نے کافی ترقی کی۔ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ راجہ علماء اور صناعوں کی مدد کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اور اپنی شہرت کو قائم و دائم رکھنے کے لئے عمارتیں بنوانا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اس عہد میں بہت سے مندر، تالاب اور درسگاہیں تعمیر ہوئیں۔ مندر بنوانے کے کئی طریقے رائج تھے لیکن سب ہی مندروں میں آرائش اور پتھروں کی کھدائی و کٹائی کا از حد خیال رکھا جاتا تھا۔ بت پرستی کا عام رواج ہونے کی وجہ سے کثرت سے مورتیاں بنائی جاتی تھیں جو بالعموم زیورات سے لدی رہتی تھیں۔ اس عہد میں جو مندر تعمیر کئے گئے ان میں بلحاظ قدامت بھوبنیشور کا مندر ہے جو ساتویں صدی عیسوی کے طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔ کھجوراہو (واقع بندیلکھنڈ) اور پوری (واقع اڑیسہ) کے مندر بھی اپنی آن بان میں انوکھے ہیں اسی طرح ایلورا کا کیلاش مندر اور آبو کا جین مندر بہترین صنعت کے مظہر ہیں۔ ایلورا کی گپھاؤں میں اجنتا کی طرح مصوری بھی کی گئی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ یہ تصویریں برہمن مذہب کے متعلق ہیں جبکہ اجنتا میں جین و بودھ مذہب کے تخیلات کی نقاشی کی گئی ہے۔ دکن میں بھی بہت سے مندر بنائے گئے جو زیادہ تر ہوئسل خاندان کے راجاؤں کے بنوائے ہوئے ہیں ان میں سومناتھ پور کا مندر گیارہویں صدی عیسوی میں وشنو دیتہ بلال نے تعمیر کرایا۔ بیلور میں وشنو وردھن نے بارھویں صدی عیسوی میں ایک مندر بنوایا اسی طرح ہلیبید میں بارھویں صدی عیسوی کے اختتام پر ایک مندر اسی خاندان کے

۱۔ منوبا سیاہ ہفتم صفحہ ۱۲۹ تا صفحہ ۱۳۲

ایک راجہ نے بنوایا۔ پلّو، چالوکیہ اور چول خاندان کے راجاؤں نے بھی مندروں کے بنوانے میں کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔ پلّو خاندان کے راجاؤں نے اپنے دارالسلطنت کانچی ورم کی شان و شوکت کو بیشمار خوبصورت مندر بنوا کر دوبالا کیا۔ ان مندروں میں بعض ساتویں صدی عیسوی کے تعمیر شدہ ہیں۔ ایک ہزار صدی عیسوی میں چول خاندان کے راجہ راج راج نے تنجور میں ایک عالیشان مندر بنوایا۔ چالوکیہ راجاؤں نے بھی اپنے صدر مقام بادامی میں بہت سے نفیس مندر بنوائے۔ ہندوستان کی اس صنعت کا اثر جاوا، سماترا، کمبوڈیا وغیرہ ہندوستانی نو آبادیوں پر بھی کافی پڑا۔

برہمنی مت کو جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اس عہد میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس کا اثر علم و ادب پر بھی پڑا۔ چنانچہ شنکر اچاریہ نے بھگوت گیتا، برہم سوتر اور اپنشدوں کی شرحیں لکھیں۔ دھار راجدھانی میں پدم گپت، دھننجے، اور دھنک جیسے لائق و فائق پنڈتوں نے بالترتیب Navasahasankacharita (نوسہاسنک چرت)، Dasarupak (دس روپک)، اور "دس روپک" کی شرح لکھیں۔ اسی طرح ہلایودھ نے علم عروض پر Pingalchhandsutra (پنگل چھند سوتر) نامی کتاب کی شرح تالیف کی اور امت گتی نامی پنڈت نے "سبھاشت رتن سندوہ" تصنیف کی۔

اس عہد کے مشہور ڈرامہ نویسوں میں سب سے پہلا نام و کام "بھاب بھوتی" کا ہے اس نے مالتی مادھو، "مہاویر چرت" اور "اتر رام چرت" تین ڈرامے لکھے۔ یہ آٹھویں صدی عیسوی کا مشہور ڈرامہ نویس ہے۔ قنوج کے راجہ یشو ورمن نے اس کی سرپرستی کی یہ راجہ کا درباری شاعر تھا۔ راجہ قنوج کو جب "للتادتیہ مکتا پیڑ" نے تخت سے اتار دیا تو یہ امیر خسرو کی طرح غنیم کا قیدی ہو گیا۔ راجہ کشمیر اس کو قید کر کے لے گیا اب یہ نہیں معلوم کہ وہ کشمیر میں کب تک قید رہا۔ شاعری کے اعتبار سے اس کا پایہ بہت بلند ہے اس کے کلام پر کالیداس کا کافی اثر پڑا ہے۔ بھاب بھوتی کے بعد دوسرا نمبر "وساکھادت"

اور "بھٹ نارائن" کا ہے یہ دونوں اپنی مشہور تصانیف "مدرراکشس" اور "بینی سمہار" کی وجہ سے زندۂ جاوید ہیں۔ دسویں صدی عیسوی کا مشہور ڈرامہ نویس "راج شیکھر" ہے اس نے "کرپور منجری" کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔

سنسکرت لٹریچر پر "ماگھ" اور "سری ہرش" کا بھی کچھ کم احسان نہیں ہے۔ انھوں نے "ششپال بدھ" اور "نیسادھ چرت" نامی کتابیں تصنیف کیں۔ آخرالذکر شاعر غالباً راجہ جے چند والیٔ قنوج کا درباری شاعر تھا اس نے اپنی تصنیف میں راجہ نل اور دمینتی کا قصہ نظم کیا ہے۔ بلہن نے کلیانی کے چالوکیہ راجہ بکرمادتیہ ششم کے کارناموں کو نظم کیا اور اپنی کتاب کا نام راجہ کے نام کی مناسبت سے "وکرمانک چرت" رکھا لیکن تاریخی واقعات کے اعتبار سے سب سے مشہور تصنیف کلہن کی ہے اس نے بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں کشمیر کی تاریخ لکھی۔ کتاب کا نام راج ترنگنی ہے مصنف نے اپنے زمانہ کی سیاسیات میں خود بھی حصہ لیا ہے اسلئے اس کی تصنیف نہایت قابل قدر ہے گو واقعات پر کہیں کہیں افسانوی پردے پڑے ہوئے ہیں۔ یہی حال جینیوں کے مشہور عالم "ہیم چندر" کی تصانیف کا ہے۔

گیتوں کو نظم کرنے کا سہرا جے دیو کے سر ہے۔ یہ بارھویں صدی عیسوی کا مشہور بنگالی شاعر ہے اس نے "گیت گوبند" نامی تصنیف اپنی یادگار چھوڑی۔

نثر نگاروں میں ڈنڈن اور دھن پال پیش پیش ہیں ڈنڈن ساتویں صدی کا مشہور انشاء پرداز ہے اس نے "دش کمار چرت" اور "اونتی سندری کتھا" دو نہایت عمدہ کتابیں لکھیں اس کا طرز تحریر نہایت دل نشین ہے۔ دھن پال نے "تلک منجری" اور "یشس تلک" کو لکھکر نام پیدا کیا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے کویوں (شاعروں) نے مختلف مضامین پر کتابیں لکھیں لیکن ان کو فروغ نصیب نہیں ہوا۔[۱]

---

[۱]۔ مذکورۂ بالا سنسکرت کی اکثر و بیشتر کتابیں راقم الحروف کے مطالعہ میں رہی ہیں۔

پلّووں اور مشرقی چالوکیوں کے اثر سے تامل اور تیلگو ادب کی بھی ترقی ہوئی اور ویشنو آچاریوں نے جنوبی ہند میں بہت سی عمدہ تصنیفات کیں جن کی عزت ویدوں کے مانند تھی۔

یہی وہ زمانہ ہے جبکہ شمالی ہند میں سندھ و پنجاب کے مسلمان حکمرانوں کے زیر سایہ ہندو و مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، تجارتی، معاشرتی اور علمی تعلقات استوار ہوتے چلے جا رہے تھے جن کا راقم الحروف نے جلد اول میں نہایت وضاحت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ ان تعلقات کا نتیجہ وہ ہندی ادب ہے جس کی اس عہد میں داغ بیل پڑی۔ مسلمانوں میں پہلا ہندی شاعر جو اسی (ہندوستان) کی خاک پاک سے اٹھا مسعود سعد سلمان ہے۔ اس کے تین دیوان تھے ایک عربی دوسرا فارسی اور تیسرا ہندوستانی میں۔ عوفی لکھتا ہے "واورا سہ دیوان است یکے بتازی یکے بپارسی ویکے بہ ہندوئی"، اس طرح اس نے عربی و فارسی کے پہلو بہ پہلو ہندوستانی میں بھی ایک مستقل دیوان اپنی یادگار چھوڑا جو ملا عبدالقادر بدایونی کے زمانہ تک موجود تھا[۱]۔ یہ شاعر پانچویں صدی ہجری کا ہے۔ ہندی ادب میں یہ عہد "ویرگا تھا کال" (عہد رزم) کے نام سے مشہور ہے[۲]۔ اس زمانہ کے مشہور ہندی کوی تین ہیں۔ ان میں سے پہلے کا نام معلوم نہیں ہو سکا اس نے "کھمان راسو" سمبت ۸۱۰ سے لیکر ۱۰۰۰ تک کسی زمانہ میں ترتیب دیا۔ دوسرا ہندی شاعر "نرپت نالہ" ہے اس نے اجمیر کے راجہ بیسل دیو کے نام پر سمبت ۱۲۱۲ میں "بیسل دیو راسو" تصنیف کیا[۳]۔ اسی طرح تیسرے ہندی شاعر چند کوی نے جو چند بردائی کے نام سے مشہور ہو پرتھوی راج یا رائے پتھورا کے نام پر "پرتھوی راج راسو" ترتیب دیا[۴]۔ جس طرح پرتھوی

۱:۔ منتخب التواریخ ص ۳۸ از بدایونی ۔ ۲: ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۲ تا ص ۵۲ از پنڈت رامچندر شکل

۳:۔ بیسل دیو راسو ص ۱۰ مؤلفہ ستیہ جیون ورما ایم۔ اے

۴:۔ پرتھوی راج راسو مؤلفہ ہری ہر ناتھ ٹنڈن ایم۔ اے

تھا جس کی سرپرستی میں "بھاب بھوتی" نے سنسکرت میں کئی مشہور ڈرامے لکھے۔
یشوورمن کی مملکت پر کشمیر کے راجہ للتادتیہ مکتا پیڈ نے حملہ کیا۔ راجہ قنوج کو شکست
نصیب ہوئی اور وہ لڑتا ہوا مارا گیا اس کے مرتے ہی قنوج کی عظمت کا بھی کچھ عرصہ
کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

للتادتیہ کے جانشین قنوج پر قابض نہ رہ سکے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قنوج
مگدھ کے پال راجاؤں کا ایک باجگذار صوبہ رہ گیا۔ پھر مالوہ کے پرتہار راجہ ناگ بھٹ
دوم (۸۰۰ء تا ۸۲۵ء) نے بنگال کے راجہ دھرم پال سے قنوج چھین لیا لیکن مستقل
قبضہ بھوج اوّل (۸۴۰ تا ۸۹۰) کے زمانہ میں ہو سکا۔ آخر میں بھوج اوّل کے پوتے
اور مہندر پال (۸۹۰ تا ۹۰۸) کے لڑکے مہی پال (۹۱۰ تا ۹۴۰) کے زمانہ میں پرتہاروں
پر زوال آ گیا جبکہ انھیں دکن کے راشٹر کوٹ خاندان کے راجہ اندر سوم کے مقابلہ
میں زک اٹھانا پڑی۔ اردگرد کے تمام علاقے خود مختار ہو گئے۔ پرتہاروں کے قبضہ میں
صرف قنوج اور اس کے آس پاس کا علاقہ باقی رہ گیا۔ راجہ راجیپال پرہار (پرتہار)
اس خاندان کا آخری طاقتور راجہ تھا جس کو محمود غزنوی نے مطیع و منقاد بنایا ۱۰۱۹ء
میں قنوج پر گہرواڑ راجپوتوں نے قبضہ کر لیا۔ اس خاندان میں گوبند چندر (۱۱۱۴ء تا ۱۱۵۵ء)

۱؎ راجہ راجیپال پرہار نے چونکہ محمود غزنوی کی اطاعت قبول کر لی تھی اسلئے محمود کے غزنی واپس
لوٹ جانے کے بعد راجہ کی ماتحت ریاستوں نے بغاوت کی جن میں کالنجر کا راجہ گانڈہ اور گوالیار
کے راجہ ارجن کچھواہہ نے نمایاں حصہ لیا۔ متحدہ فوجوں کا سپہ سالار راجہ کالنجر کا لڑکا ودیادھر تھا ان متحدہ فوجوں نے راجیہ پال
کو شکست دی اور راجہ میدان جنگ ہی میں راجہ ارجن رئیس گوالیار کے ہاتھ سے مارا گیا۔
(ملاحظہ ہو کتبہ دوب کنڈ (نزد گوالیار) اور کتبہ مہوبہ بحوالہ میڈیول انڈیا صفحہ ۔ از
ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب)

(باقی صفحہ ۱۵۸ پر)

اور بروچ کو مرکز قرار دے کر حکومت کرنے لگے۔ پرتہاروں کو گوجر راجپوتوں کی ایک شاخ مانا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے سندھ کے مشہور گورنر جنید بن عبدالرحمن کی ماتحتی میں انکی مملکت پر حملہ کیا اور مالوہ و گجرات سے خراج وصول کیا۔ اس وقت مالوہ کا راجہ ناگ بھٹ اول (۷۲۵ تا ۷۴۰ء) تھا۔ اس کے پوتے وتسراج (۷۷۵ تا ۸۰۰ء) نے شمالی ہند میں اپنا اقتدار جمانے کے لئے جنوبی ہند کے راشٹرکوٹوں اور بنگال کے پال راجاؤں سے لڑائیاں لڑیں۔ یہ کشمکش اس کے بیٹے ناگ بھٹ دوم (۸۰۰ء تا ۸۲۵ء) کے زمانہ میں بھی جاری رہی اور قنوج کو راشٹرکوٹوں نے گوبند سوم کی ماتحتی میں لوٹ کر تباہ کر دیا لیکن مہراج بھوج (۸۴۰ء تا ۸۹۰ء) نے اپنے سب مخالفوں کو نیچا دکھا کر قنوج پر قبضہ کر لیا اور اس کو اپنی حکومت کا صدر مقام قرار دیا۔ قنوج کی اس زمانہ میں وہی اہمیت تھی جو آجکل دہلی کو دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے حاصل ہے۔ اسی وجہ سے ہندوستان کی ہر ریاست اس پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔

پرتہاروں پر زوال آنے کے بعد بندیل کھنڈ (جہاک بھکتی) کے چندیلے۔ ۲۔ ڈہل کے (جبل پور) کلچری۔ ۳۔ گجرات کے سولنکی۔ ۴۔ مالوہ کے پرمار۔ ۵۔ اجمیر کے چوہان۔ ۶۔ اور گوالیار کے کچھپ گھٹ خود مختار ہو گئے۔ قنوج خاص بھی گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں پرتہاروں کے قبضہ سے نکل کر گہرواروں کے پاس پہونچ گیا جن کا ذکر پچھلے صفحہ پر کیا جاچکا ہے

۲۔ چندیلے یہ گونڈ اور آریوں کی مخلوط نسل سے ہیں انھوں نے اپنے سردار یشو ورمن کی ماتحتی میں کالنجر فتح کر کے حکومت کی بنیاد ڈالی یشو ورمن (۹۳۰ء تا ۹۵۰ء) نے کھجوراہو کا مشہور مندر تعمیر کرایا جس میں وشنو دیوتا کی مورتی کو لاکر رکھا۔ یہ مورتی قنوج کے راجہ دیوپال سے زبردستی بزور شمشیر حاصل کی گئی تھی۔[۱]

---

[۱] Crescent in India by Sharma P. 10, ۱۱
& Delhi Sultanate by Prof: Moinul Haq P. 20.

نے اپنا تخت بنالیا بعد کو ۱۱۹۶ء میں دیوگری کے یادو راجہ نے اس خاندان کے آخری
راجہ وجے سنگھ کو میدان جنگ میں قتل کر کے ریاست کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ لکشمن نامی
ایک کلچری راجہ نے اڑیسہ پر حملہ کر کے سومناتھ میں نصب کرنے کے لئے ایک بت بزور
شمشیر حاصل کیا تھا[1]"

۴۔ گجرات کے سولنکی گجرات کے چاوڑا خاندان (۷۲۵ء تا ۹۶۱ء) کے آخری راجہ
سامنت سنگھ کو اس کے داماد مولراج (۹۶۱ء تا ۹۹۵ء)
نے میدان جنگ میں قتل کر کے سولنکی یا چالوکیہ خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس کے پرپوتے
بھیم اوّل (۱۰۲۲ء تا ۱۰۶۳ء) کے زمانہ میں محمود غزنوی نے سومناتھ پر حملہ کیا۔ اس کے عہد
حکومت میں دھار کے پرمار راجہ بھوج (۱۰۱۸ء تا ۱۰۶۰ء) کے سپہ سالار کلچند نے سولنکیوں
کے صدر مقام انہلواڑہ کو فتح کر کے اجاڑ دیا۔ اس خاندان میں جے سنگھ سدھراج (۱۰۹۳ء
تا ۱۱۴۳ء) اور کمارپال (۱۱۴۳ء تا ۱۱۷۳ء) دو نہایت مشہور راجہ ہوئے ہیں انھوں نے
پرماروں، چوہانوں، چیدیوں اور چندیلوں سے خراج وصول کیا اور سلطنت کو تقویت
دی۔ ان راجاؤں کا رجحان جین مت کی طرف تھا۔ محمد غوری کے حملہ کے وقت انہلواڑہ
میں مولراج ثانی حکمراں تھا۔ اس کے بعد بھیم ثانی نے (۱۱۷۸ء تا ۱۲۴۱ء) ۶۳ سال حکومت
کی۔ اس کے عہد میں گجرات سے قطب الدین ایبک نے خراج وصول کیا۔ گجرات کا مکمل
الحاق علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں ہوا جبکہ گجرات پر سولنکی خاندان کی ایک دوسری
شاخ حکمراں تھی جس کو بگھیلہ کہتے ہیں اور جس کا آخری راجہ کرن دیو دوم تھا۔ بگھیلوں
میں سب سے مشہور راجہ بیسل دیو (۱۲۴۳ء تا ۱۲۶۱ء) تھا جس نے ۱۸ سال نہایت دبدبہ
کے ساتھ حکومت کی۔

---

[1] بحوالہ دہلی سلطنت از پروفیسر معین الحق صاحب صفحہ ۲۱

۵۔ مالوہ (دھار) کے پرمار

مالوہ کے پرمار چندیلوں کی طرح پرتہاروں کے مطیع تھے۔ اس خاندان کی بنیاد اوپیندر عرف کرشن نے ڈالی مگر سب سے پہلا خود سر حکمران واک پتی راج دوم ہوا۔ وہ گجرات کے چالوکیہ حکمرانوں سے برابر برسرِ پیکار رہا۔ اس کے جانشینوں میں سے ہرش سنکلا نے جنوبی ہند کے راشٹر کوٹوں کے صدر مقام "مانیہ کھیت" کو ۹۷۲ء میں لوٹ کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ لیکن اس خاندان کا سب سے ممتاز راجہ منج[1] (۹۷۴ء تا ۹۹۵ء) تھا۔ یہ راجہ نہایت عالم فاضل تھا۔ اس کے دربار میں دھن پال، پدم گپت، دھنن جے، دھنک اور ہلایودھ جیسے نامی گرامی اہل علم تھے جن کی راجہ نے بڑی قدر و منزلت کی۔ اس نے گجرات پر چھ مرتبہ چڑھائی کی اور چالوکیوں کو شکست دی آخر خود بھی جنوبی ہند پر حملہ کرتے وقت کلیانی کے تیلپ دوم کے ہاتھ سے مارا گیا۔ منج کے بعد اس کے بھتیجے بھوج اوّل[2] (۱۰۱۰ء تا ۱۰۶۰ء) نے نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ یہ علم دوست اور فیاض تھا۔ اس نے سنسکرت کی تعلیم کیلئے ایک بڑی درسگاہ اور آبپاشی کے لئے ایک

ف۱۔ راجہ منج کئی ناموں سے مشہور ہے اسکو واک پتی بھی کہتے ہیں۔ اُتپل راجہ، اموگھ ورش اور پرتھوی ولبھ اسکے دوسرے نام ہیں۔ (ملاحظہ ہو فٹ نوٹ میڈیول انڈیا ص۱ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد)

ف۲۔ راجہ منج کا جانشین اس کا بھائی سندھ راج (سدھ راج) ہوا۔ اسکو راجہ منج نے اندھا کرا کے لکڑی کے ایک پنجرے میں قید کر رکھا تھا بعد کو اس کو قتل کرا دینا چاہا لیکن ضمیر کی بروقت ملامت نے اس کو اس کام سے باز رکھا۔ ملاحظہ ہو فٹ نوٹ میڈیول انڈیا ص۱۸ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد بحوالہ

1. Ancient India PP170—172
2. Archaeological Survey Report 1903–4 PP 238–43 by Aufecht.
3. Catalogus Catalogorum I P 418 & II P 95.

بڑا تالاب بنوایا۔ یہ بڑا منچلا اور جنگجو راجہ تھا۔ اس نے اپنے آباو اجداد کے علمی و سیاسی کارناموں کو نہ صرف زندہ کیا بلکہ انھیں اور آگے بڑھایا۔ دھار میں ایک سنسکرت کالج "سرسوتی کنٹا بھرن" (सरस्वती कन्ता भरण) قائم کیا جس میں اس نے ڈرامہ تاریخ اور دوسرے مضامین کی مختلف کتابوں کو محفوظ کرایا افسوس ہے کہ یہ شاندار علمی یادگار قائم نہیں رہ سکی۔ کہتے ہیں کہ مسلمان حملہ آوروں کی وجہ سے ضائع ہو گئی۔

راجہ غیر معمولی علمی قابلیت کا حامل تھا اس کو شعر و شاعری، نجوم و تنجیم اور دوسرے علوم میں دستگاہ کامل حاصل تھی۔ بہترین عالم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ فنون جنگ میں بھی ماہر تھا اس نے اپنے مقتول چچا راجہ منج کا چالوکیوں سے بدلہ لیا اور ریاست کے حدود کو وسعت دینے کے لئے گجرات، چیدی، اور کرناٹک تک کے راجاؤں سے لڑائیاں لڑیں آخری عمر میں اس کو اپنے پڑوسی دشمن راجاؤں سے زک اٹھانا پڑی اور غالباً اسی صدمہ سے اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے مرجانے کے بعد مالوہ پر تباہی آگئی۔ گجرات کے سولنکی راجہ اور چیدی کے کلچری متحد ہو کر مالوہ پر ٹوٹ پڑے۔ دھار کی تباہی سے پرماروں کی عظمت خاک میں مل گئی۔ بارھویں صدی کے وسط میں جب گجرات کے راجہ سدھراج (۱۰۹۳ء تا ۱۱۴۳ء) نے مالوہ فتح کر لیا اور راجہ کو پنجرہ میں گرفتار کر کے لے گیا تو پرماروں کا اقتدار بالکل جاتا رہا۔ آخری راجہ بھوج دوم نے علاءالدین خلجی کی اطاعت قبول کر لی اور مالوہ سلطنت دہلی کا ایک صوبہ بن گیا۔

۶۔ اجمیر ہندوستان کی راجپوت ریاستوں میں چوہانوں کی ریاست سانبھر کو جس کا اجمیر ایک حصہ تھا بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کہتے ہیں کہ اس ریاست کی بنا اجے دیو یا اجے پال نے ڈالی۔ اجے پال شروع میں ایک معمولی حیثیت کا مالک تھا۔ وہ اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں انا ساگر جھیل کے اطراف میں بکریاں چرایا کرتا تھا اور بعد کو ایک سادھو (ولی) کی دعا سے ایک ضلع کا رئیس بن گیا۔ اسی

نے اجمیر کی بنا ڈالی۔ اجمیر کے نام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ شاہ چوپان تھا سنسکرت میں آج بمعنی بکری اور میرو بمعنی پہاڑ مستعمل ہے۔ یہ پہاڑ غالباً اس کی چراگاہ تھی جھیل کے جنوب میں اس کے مکانات کے کھنڈرات اب بھی دیکھنے میں آتے ہیں[۱]۔

اس ریاست کے ابتدائی حالات ابھی تک پردۂ اخفا میں ہیں اس لئے تاریخی اعتبار سے واقعات کا تسلسل قائم نہیں رہ سکا البتہ بارھویں صدی کے ابتدائی دور میں ارنو راجہ کا نام جاذب نظر ہے جو غالباً ۱۱۳۹ء سے ۱۱۵۳ء تک اجمیر میں حکومت کرتا رہا۔ اس کے تین لڑکے تھے جگدیو، بیسلدیو (وگرہ راج چہارم) اور سومیسر۔ جگدیو اپنے باپ کو مار کر اجمیر کے تخت پر بیٹھا۔ لیکن اس کے اس ظالمانہ فعل سے رعایا ناراض تھی اسلئے بیسلدیو نے اس کو جلد ہی تخت سے اتار کر ریاست پر قبضہ کر لیا اور ۱۱۶۴ء تک نہایت دبدبہ کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔ اس نے مسلمانوں سے متعدد لڑائیاں لڑیں[۲] اور دہلی کو اننگ پال سوم سے چھین لیا[۳]۔ وہ ایک با اقتدار راجہ تھا اور ہمالیہ سے

۱:۔ بحوالہ چھتری کل بھوشن صـ۳۰ـ مولفہ ٹھاکر دل بھمن سنگھ مرحوم ریٹائرڈ تحصیلدار۔ ۲:۔ دہلی میں فیروز شاہ کوٹلہ والی لاٹ پر بیسمت ۱۲۲۰ بکرمی ماہ بیساکھ پورنماشی کے دن کا کندہ کیا ہوا ایک کتبہ ہے جسمیں لکھا ہے کہ راجہ (بیسلدیو) نے ہمالیہ سے بندھیاچل تک کے علاقہ کو فتح کر کے لوگوں سے خراج وصول کیا نیز یہ کہ مسلمانوں سے آریہ ورت (غالباً مشرقی پنجاب) خالی کرالیا اور اپنے وارثوں کو وصیت کی تھی کہ انکو آگے بار رکھا جائے۔ (بیسلدیو راسو) اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ کوئی ہندو مسلم لڑائی تھی۔ یہ جنگ اسی قسم کی تھی جو راجہ یا سلطان اپنی شان و شوکت کو بڑھانے اور مملکت کو وسعت دینے کیلئے لڑا کرتے تھے۔ یاد رہے کہ راجہ کے دربار میں مسلمان بھی ملازم تھے چنانچہ ایک امیر کبیر میاں تاج الدین راجہ کے جاگیرداروں میں تھے۔ (ملاحظہ ہو ہندی ساہتیہ کا اتہاس صـ۲۸ـ از پنڈت رام چندر شکل بیسلدیو راسو صـ۱۲) ۳:۔ میڈیول انڈیا صـ۱۹ـ فٹ نوٹ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد تاریخ اجمیر صـ۱۵۸ـ از ہربلاس سارڈا Carr Stephen Archaeology of Delhi P 138. Indian Antiquary ⅩⅩ p. 201

بندھیاچل تک کی سرزمین اس کے قبضہ میں تھی۔ وہ علم دوست اور عالموں کا قدر دان
تھا۔ "ہری کیلی" ناٹک [1] اس کی اپنی تصنیف بتایا جاتا ہے اور غالباً اسی کے ایماء سے اس کے
درباری شاعر سومیسور نامی نے "للت وگرہ راجا" جو ایک ناٹک کی کتاب ہے تصنیف کی۔ یہ
دونوں ڈرامے اجمیر کی میوزیم میں اب بھی محفوظ ہیں [2]

راجہ بیسلدیو کے بعد اس کا لڑکا امر گنگیہ یا اپار گنگیہ جو ابھی نابالغ تھا راجہ بنایا گیا۔ راجہ کی نابالغ ہونے کی وجہ کر
سلطنت کا کاروبار اس کا چچازاد بھائی یعنی جگدیو کا لڑکا پرتھوی بھٹ بحیثیت ایک مدار المہام انجام دیتا رہا
جو تین برس کے بعد سنہ ۱۱۶۷ء میں خود گدی کا مالک بن بیٹھا لیکن زیادہ دنوں حکومت نہیں کر سکا اور سنہ ۱۱۶۹ء میں گیا۔
سنہ ۱۱۷۰ء میں دہلی و اجمیر کا تخت حکومت بیسلدیو کے چھوٹے بھائی سومیسور کی طرف
منتقل ہو گیا۔ اسی کا لاثانی و ہونہار بیٹا پرتھوی راج یا رائے پتھورا ہے جس نے سنہ ۱۱۷۷ء سے
لیکر سنہ ۱۱۹۲ء تک اجمیر و دہلی دونوں ریاستوں پر نہایت جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی
اس کی شہرت کو چند کوی نے "پرتھوی راج راسو" [3] (راسا) لکھ کر اور زیادہ چمکا دیا۔

---

[1] :- یہ ناٹک پتھر کی سلوں پر سمبت بکرمی سنہ ۱۲۱۰ مطابق سنہ ۱۱۵۳ء ماگھ مہینہ کی ۲۰ تاریخ کو کھدوا دیا گیا تھا۔
یہ سلیں "ڈھائی دن کا جھونپڑا" کے قریب کھدائی کرنے پر برآمد ہوئی ہیں (بیسلدیو راسو ص ۶)

[2] :- میڈیول انڈیا ص ۹ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد۔

[3] :- پرتھوی راج راسو ایک ضخیم رزمیہ نظم ہے جو ۱۰۰۵۰۰ اشلوکوں پر مشتمل ہے اس کتاب میں ۶۹
سیمے (ابواب) ہیں۔ اسی کی روایات پر یقین کر کے اب تک مورخین اس عہد کے واقعات کو مستند
مانتے رہے لیکن عصر حاضر کی تحقیقات نے راسو کی روایات کو فرضی و جعلی ثابت کر دکھایا ہے۔

رائے بہادر ڈاکٹر شیام سندر داس جی کا کہنا یہ ہے کہ پرتھوی راج کے دربار میں چند کوی
نام کا کوئی شاعر تھا تو ضرور اور اس نے راسو بھی لکھا لیکن وہ اب اپنی اصلی حالت پر نہیں ہے
اس میں بہت سے ردو بدل ہوئے اور آخر میں رانا پرتاپ سنگھ کے لڑکے امر سنگھ نے اس کو
مجتمع کر دیا اس وقت "مکیہ سنگھ" نامی کوی نے اپنی طرف سے اس میں بہت سی فرضی داستانیں

(باقی صفحہ ۱۶۶ پر)

پرتھوی راج جب بالغ ہوا اور سن تمیز کو پہونچا تو اس نے اپنے باپ اور چچا کے نقش قدم
پر چل کر جنگ و جدل کو اپنا مشغلہ بنایا۔ چنانچہ ۱۱۸۲ء میں جبکہ اس کی عمر ابھی بیس سال

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۵۔ اضافہ کر دیں۔ اس کی تائید مہا مہوپادھیائے پنڈت ہرپرشاد شاستری
بھی کرتے ہیں۔ پنڈت جی موصوف نے ۱۹۰۹ء سے لیکر ۱۹۱۳ء تک بغرض تحقیق راجپوتانہ کے تین چکر لگائے۔
وہ ناگور جا کر چند کوی نسل کے ایک نامی گرامی بھاٹ نانورام سے ملے۔ ناگور چند کوی کو بطور جاگیر دیا گیا تھا
وہاں اس کے خاندان کے لوگ اب بھی موجود ہیں۔ نانورام نے پنڈت جی موصوف کو بتایا کہ چند بردائی
نے صرف تین چار ہزار اشلوک لکھے تھے اس کے بعد اس کے لڑکے جل چند نے آخری دس باب لکھ کر راسو
کو ختم کر دیا تھا۔ بعد کے لوگوں نے اس میں اضافے کئے۔ اکبر نے راسو کو سنا تھا اس کی ہمت افزائی پر
اس زمانہ میں بہت سے راسو لکھے گئے۔ نانورام کا کہنا ہے کہ اس کے پاس اصلی راسو کی نقل موجود ہے۔
پنڈت جی موصوف اس سے مہوبہ کھنڈ کی ایک نقل لائے تھے جو بالکل اوٹ پٹانگ اور ردّی ہے۔
مہا مہوپادھیائے پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا راسو کو سترھویں صدی کا ایک نہایت لغو اور
جعلی دستاویز قرار دیتے ہیں لکھتے ہیں کہ "اس میں چوہانوں، پرماروں، پریہاروں اور سولنکیوں کی پیدائش
چوہانوں کی بنشاولی (شجرہ)، پرتھوی راج کی ماں، بھائی، بہن، لڑکے، رانیاں نیز بہت سے واقعات
اور ان کے سنین سب کے سب غلط اور فرضی ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ تصنیف پرانی نہیں
ہے۔" آگے لکھتے ہیں کہ "بعض لوگ یہ کہہ کر مغالطہ دیتے ہیں کہ راسو میں بعد کو اضافے ہوتے رہے ورنہ ا[illegible]
یہ بھاری بھرکم کتاب نہیں تھی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب ایک ہی وقت میں ترتیب دی گئی ہے اور
اس کا ثبوت یہ ہے کہ راجہ کرولی کے درباری شاعر پنڈت جدوناتھ جو چند کوی کی نسل سے ہیں اس میں
۱،۰۰،۵۰۰ اشلوکوں کا ہونا شروع ہی سے تسلیم کرتے ہیں۔"

بہر حال چند کوی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "چوہان راجپوت آبو پر کئے گئے یگیہ کی وجہ
سے آگ سے پیدا ہوئے۔ پرتھوی راج اجمیر کے راجہ سومیسور کے لڑکے اور ارنوجی کے پوتے تھے۔
سومیسور کو دہلی کے راجہ اننگ پال کی لڑکی کملا بیاہی تھی۔ اسی سے پرتھوی راج نے جنم لیا۔

(باقی صفحہ ۱۶۷ پر)

ہے جبکہ محمد غوری کے پنجاب پر حملے شروع ہو چکے تھے۔

محمد غوری نے ۱۱۸۶ء میں پنجاب کی تسخیر کو مکمل کرلیا اب اُس نے اُن علاقوں کی طرف توجہ کی جو کبھی سلاطین غزنویہ کے قبضہ میں رہ چکے تھے لیکن اُن پر راجگان ہند نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ اسی قسم کا شوق جہانگیری و جہاں کشائی ہے جیسا کہ پرتھوی راج

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۷: (۱) "پرتھوی راج وجے" میں لکھا ہے کہ راجہ سومیسور کا بیاہ چیدی کے راجہ کی لڑکی کرپور دیوی سے ہوا تھا۔ اس کی تصدیق "ہمیر مہا کاویہ" اور "سرجن چرتر" سے ہوتی ہے۔ سرجن چرتر بوندی کے راجہ سرجن سین کی سوانحعمری ہے اور سترھویں صدی بکرمی میں لکھی گئی۔ ہمیر مہا کاویہ کو نین چندر نے پندرھویں صدی بکرمی میں ترتیب دیا۔ "راجہ سومیسور کے دو لڑکے ہمیر راج اور پرتھوی راج تھے۔ گدی کا مالک پرتھوی راج ہوا لیکن چونکہ وہ نابالغ تھا اسلئے اس کی ماں کرپور دیوی کا دمبام وزیر کی مدد سے ریاست کا کام ایک عرصہ تک چلاتی رہی"۔ اس کتاب میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ انگ پال نے پرتھوی راج کو گود لیا یا پرتھوی راج کا سنجوگتا سے بیاہ ہوا۔

(۲) اسی طرح راسو کی روایت کے بخلاف چالوکیوں کا "اگنی کل" کے بجائے چندر بنشی ہونا ثابت ہوتا ہے اس کی تصدیق تیرھویں صدی بکرمی کے ایک فرمان سے ہوتی ہے جو کسی چالوکیہ (سولنکی) راجہ کا ہے۔ اجمیر میں ڈھائی دن کے جھونپڑے کی ایک تحریر سے، پرتھوی راج وگ وجے ناٹک سے، اور ہمیر مہا کاویہ سے چوہانوں کا سورج بنشی ہونا مسلّم ہے۔

(۳) ۱۲۲۶ بسمت کے بجولیا (واقع راجپوتانہ) والے کتبہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سومیسور کے بڑے بھائی بیسل دیو یا وگرہ راج چہارم نے دلّی اور ہانسی کو بزور شمشیر فتح کر کے اجمیر میں ملایا۔ طبقات ناصری سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔ فارسی مورخوں نے پرتھوی راج کو اجمیر کا راجہ مانا ہے دلّی کا مالک پرتھوی راج کا بھائی گوبند رائے تھا اور پہلی لڑائی میں اسی کے بھالے سے محمد غوری زخمی ہوا تھا۔

اگرچہ چند بردائی نام کے کسی شاعر نے یہ "پرتھوی راج راسو" رائے پتھورا کے زمانہ میں لکھا ہوتا تو مندرجہ ذیل تاریخی واقعات کی غلطیاں اس سے ہرگز سرزد نہ ہوتیں مثلاً۔

(باقی صفحہ ۱۶۹ پر)

کو تھا اسلئے دونوں کا ٹکراؤ مناسب وقت کا منتظر تھا اس کے لئے بھی زیادہ عرصہ نہیں لگا اور
سنہ ۱۱۹۱ء میں ترائن کے مقام پر دونوں میں پہلی جنگ ہوئی جس میں محمد غوری ہار گیا اس کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۸ ۔ (۴) راسو کے ۲۱ ویں باب کے مطابق پرتھوی راج کی بہن پرتھا (پرتھوی بائی)
کا بیاہ میواڑ کے رانا سمر سنگھ کے ساتھ ہوا تھا جو دوسری لڑائی میں محمد غوری کے ہاتھ سے مارا گیا۔ یہ روایت
بالکل غلط ہے کیونکہ پرتھوی راج کی موت ۱۲۴۸ سمبت میں ہوئی۔ اس وقت سمر سنگھ کا دادا جیتر سنگھ اور
باپ تیج سنگھ دونوں بقید حیات تھے۔ جیتر سنگھ کا ۱۳۰۹ سمبت اور تیج سنگھ کا ۱۳۲۴ سمبت تک زندہ رہنا ثابت
ہے۔ سمر سنگھ کے عہد کے سنگین کتبہ جات میں سے ایک ۱۳۳۰ اور دوسرا ۱۳۵۸ سمبت کا ہے۔ ان کی رُو سے
پرتھوی راج کی موت کے ۱۰۹ برس بعد سمر سنگھ کا زمانہ ہے اس صورت میں اس کی شادی پرتھا سے کیونکر
ہو سکتی تھی۔

(۵) راسو کے مطابق گجرات کے راجہ بھیم نے پرتھوی راج کے والد سومیسور کو قتل کیا جس کا بدلہ پرتھوی
راج نے بھیم کو مار کر لیا"۔ لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ راجہ بھیم ۱۲۳۵ سمبت میں گدی پر بیٹھا اس وقت وہ صغیر سن
تھا۔ سومیسور کی موت ۱۲۳۶ سمبت میں ہوئی اس صورت میں وہ سومیسور کو کیسے قتل کر سکتا تھا۔ علاوہ
ازیں راجہ بھیم کو پرتھوی راج نے قتل نہیں کیا۔ راجہ بھیم کے عہد کے کتبہ جات ۱۲۶۵ سے لیکر ۱۲۹۶ سمبت
تک کے مل چکے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پرتھوی راج کے بہت بعد تک زندہ رہا۔

(۶) "آبو کے پرمار راجہ سلکھ یا سلکھن نامی نے ۱۲۳۶ سمبت میں محمد غوری کو گرفتار کیا" حقیقتاً اس
وقت محمد غوری کا وجود بھی نہ تھا وہ ۱۲۳۰ سمبت میں غزنی کا حاکم بنایا گیا۔ اس کے علاوہ آبو کی تاریخ
میں سلکھ نام کا کوئی راجہ کسی زمانہ میں نہیں ہوا۔

(۷) راسو کی روایت کے بموجب پرتھوی راج نے گیارہ برس کی عمر سے لیکر ۳۶ برس کی عمر تک چودہ
شادیاں کیں۔ ان شادیوں کی حقیقت شیخ چلی کی کہانیوں سے زائد نہیں۔ پرتھوی راج کی موت تو ۳۰ برس
کی عمر سے پہلے ہوئی تھی۔

(باقی مضمون صفحہ ۱۷۰ پر)

قریباً سوا سال کے بعد محمد غوری نے پرتھوی راج پر دوسرا حملہ کیا۔ اِس حملہ میں راجپوتوں کے قدم میدان جنگ سے اُکھڑ گئے اور پرتھوی راج مارا گیا۔ اس طرح اجمیر و دہلی پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۹ = (۸) پرتھی راج کا بیاہ راسو کی رُو سے آبو کے راجہ جَیت کی بہن "اِچھنی" سے ہوا تھا حالانکہ جَیت کے خاندان کا وہاں پتہ بھی نہ تھا۔

(۹) اسی طرح $\frac{\text{۱۱۳۹ انند سمبت}}{\text{۱۲۳۰ بکرمی سمبت}}$ میں پرتھوی راج کا سمندر شیکھر کے یادو راجہ وجے پال کی لڑکی پدماوت سے شادی یا جے چند والئی قنوج کے اشومیدھ یگیہ کی کہانی یا سنجوگتا کا سوئمبر یہ سب باتیں تاریخی حقیقت کے خلاف ہیں۔ سمبت ۱۴۶۰ میں گوالیار کے تومر راجہ بیرم دیو کے درباری شاعر نین چندر دجے چند نے "ہمیر مہا کاویہ" میں پرتھوی راج کی اور "رمبھا منجری" میں جے چندر کی بڑی تعریف کی ہے لیکن ان دونوں کتابوں میں سے کسی میں بھی پرتھوی راج اور جے چندر کی آپس کی کشمکش کا نہ کہیں ذکر ہے اور نہ اشومیدھ یگیہ اور سنجوگتا کے سوئمبر کا کہیں حال لکھا۔

(۱۰) غرضکہ راسو میں نہ تو واقعات ہی تاریخی معیار پر صحیح اُترتے ہیں اور نہ اُن کے سنین سنین کو صحیح کرنے کے لئے رائے بہادر پنڈت شیام سندر داس نے راسو کے سنین کو انند سمبت مانا اور اس طرح ۹۱ سال کے فرق کو دور کرنے کی کوشش کی پھر بھی وہ اپنے مفروضہ میں ناکام رہے۔ مثال کے لئے ایک تاریخی واقعہ لیجئے۔ راسو کے مطابق پرتھوی راج کا جنم ۱۱۱۵ سمبت میں ہوا اس کو ذرا دیر کے لئے انند سمبت مان لیجئے اس کو بکرمی سمبت بنانے کے لئے ۹۱ سال جوڑ دیجئے تو ۱۲۰۵ یا ۱۲۰۶ بکرمی سمبت ہوئے لیکن یہ وہ سنہ ہے جبکہ پرتھوی راج کے والد ابھی بچہ ہی تھے اس طرح ان کی شادی یا پرتھوی راج کی پیدائش ابھی دور کی بات تھی۔

(۱۱) اسی طرح اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو قطعی بے سرو پا ہیں مثلاً راسو کے آٹھویں باب میں میواتی مغل جنگ کا تذکرہ یا پندرھویں باب میں جبکہ پرتھوی راج "انچھنی" کو بیاہ کے مع جہیز کے واپس

(باقی مضمون صفحہ ۱۷۱ پر)

(۷) دہلی کہتے ہیں کہ دہلی میں راجپوتوں کے قبیلہ تومر کی حکومت تھی محمد غوری کو ہندستان میں تومر راجپوتوں کی کسی بڑی طاقت سے سابقہ نہیں پڑا محمود غزنوی کو البتہ تھانیسر کے راجہ سے لڑنا پڑا جو شکست کھا کر دہلی چلا آیا تھا ۱۰۱۴ء میں دہلی کے راجہ نے ایک عجیب و غریب خواب کے ذریعہ جس کا پہلی جلد میں تذکرہ کیا جا چکا ہے تھانیسر اور ہانسی کو دوبارہ مسلمانوں سے چھین لیا اور اس طرح اپنی سابقہ عظمت کو دوبارہ بحال کیا۔ تومروں کے شجرہ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ راجہ گھوس پال یا اننگ پال تھا جس کا نمبر شجرہ میں پندرھواں یا سولھواں ہے۔

تومر سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں گائے کا ایسا بچھڑا جس کے سینگ نہ ہوں بالفاظ دیگر جو دوسروں کو بلا وجہ تکلیف نہ دیتا ہو۔ تومروں کا دعویٰ ہے کہ وہ پانڈو کے خاندان سے ہیں اسلئے چندر بنسی ہیں۔ اس کے ثبوت میں وہ شہنشاہ اکبر کا ایک فرمان پیش

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۰ = ہو رہا تھا تو راستہ میں میواڑ کے مغلوں سے اس کی جنگ کا حال۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ہندوستانی شاید مغلوں کے نام سے بھی ناواقف تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ راسو بہت بعد کی تصنیف ہے اور اس میں فرضی داستانوں کے سوا اور کچھ نہیں۔

مذکورہ بالا نوٹ کی ترتیب میں حسب ذیل ماخذات پیشِ نظر تھے:۔

(۱) پرتھوی راج راسو مولفہ ہری ہر ناتھ ٹنڈن ایم۔ اے

(۲) میڈیول انڈیا از ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب۔

(۳) ہندی ساہتیہ کا اتہاس از پنڈت رام چندر شکل۔

(۴) بیسلدیو راسو مولفہ ستیہ جیون ورما ایم۔ اے

(۵) بھاشا اور ساہتیہ از رائے بہادر ڈاکٹر شیام سندر داس

(۶) ہمیر مہا کاویہ مولفہ پنڈت نیلکنٹھ جنار دن ۱۸۸۶ء۔

(۷) ہمیر راسو مولفہ رائے بہادر ڈاکٹر شیام سندر داس۔

کرتے ہیں جس میں خاندانی روایات کی بنا پر انھیں "چندر کل بہال" کا خطاب ملا۔ فرمان کی نقل فٹ نوٹ میں درج ہے۔ اس خاندان کا بانی بیسلدیو تھا جس نے اپنے لئے اننگ پال کا خطاب پسند کیا بعد کے تمام راجگان اسی خطاب سے موسوم ہوتے رہے بیسلدیو نے دہلی کو ۷۳۶ء میں دوبارہ آباد کیا۔ یہ شہر آٹھ سو برس سے ویران پڑا تھا ویران ہونے کے زمانہ میں اس کا نام جوگن پور پڑ گیا تھا۔

اس خاندان کا انیسواں راجہ پرکھی پال اننگ پال یا اننگ پال سوم ہے جس سے وگرہ راج چہارم نے دہلی کو چھین لیا۔ اور اس طرح اجمیر و دہلی کو ملا کر ایک بڑی طاقت بنا دیا۔ چونکہ تھا نیسر و ہانسی وغیرہ پہلے مسلمانوں کے قبضہ میں تھے جن پر پہلے تومروں نے قبضہ کیا بعد کو دہلی چھن جانے کے بعد ان علاقوں کے مالک چوہان ہوئے اسی لئے محمد غوری کو پرتھوی راج سے لڑنا پڑا۔ ورنہ غزنوی حکومت کے ان نکلے ہوئے علاقوں کو واپس لینے کے لئے یہ لڑائیاں اس کو راجہ اننگ پال سے لڑنا پڑتیں۔

عہ: شہنشاہ اکبر کے فرمان کی نقل۔

اللہ اکبر مہر محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی ابو النصر ...	مہر بحروف عربی	مہر بحروف عربی

"دریں زمان میمنت اقتران فرمان والاشان واجب الاطاعت والاذعان صادر شد کہ بمقتضائے وفور مراحم خاقانی و فرط تفضلات خسروانی کہ نمونۂ افضال یزدانیست فدوی خاص لایق العنایت والاحسان لچھمن سنگہ را بہ خطاب مہاراجہ بہادری و وراج چندر سوم کل چندر بہال بین الاعیان والارکان فی الامثال والاقران سرفراز و ممتاز فرمودیم باید کہ فرزندان نامدار کامگار والا تبار و وزرائے ذوی الاقتدار و امرائے عالیمقدار و جمیع ارکان دربار جہاں مدار و حکام ممالک فدوی خاص معزی الیہ را از جناب فیض مآب بادشاہے بہ شمول این خطاب برگزیدہ و القاب پسندیدہ معزز و

(باقی صفحہ ۱۷۳ پر)

۸:- گوالیار کے کچھب گھٹ

قنوج کے پرتہاروں کے زوال کے بعد ایک کچھب گھٹ سردار "بجردمن" نامی نے گوالیار پر قبضہ کر کے اپنی خود مختار حکومت قائم کی۔ اسکی حکومت کا زمانہ سنہ ۹۶۰ء سے لیکر سنہ ۹۹۰ء تک مانا جاتا ہے۔ یہ راجپوت راجہ غالباً سورج بنشی تھے اور راجچندر جی کے دوسرے صاحبزادے "کش" کو اپنا مورث اعلیٰ سمجھتے تھے۔ اسی خاندان کے ایک راجہ ارجن سنگھ نامی نے چندیلہ راجہ گانڈہ کے لڑکے ودیادھر کی ماتحتی میں قنوج کی لوٹ میں حصہ لیا اور محمود غزنوی کے دوست راجہ راجیہ پال پریہار کو قتل کیا۔ اس خاندان میں سنہ ۱۱۲۸ء تک خود مختار راجہ ہوتے رہے بعد کو یہ چندیلوں کے باجگذار بن گئے۔

۹:- قندھار (گاندھار) یا وہند کے ہندو شاہی

کابل کے بودھ حکمران جن کو اسلامی مورخین نے "خاندان رتبیل" میں سے شمار کیا ہے سنہ ۸۷۰ء ہی میں باجگذار بنائے جا چکے تھے لیکن سنہ ۲۵۶ھ میں کابل کا الحاق کر کے سامانی حکومت نے اس کو اپنا ایک صوبہ بنا لیا کابل کا الحاق آپس کے فتنہ وفساد اور خانہ جنگی کے باعث عمل میں آیا کیونکہ کابل کے آخری حکمران "لگترمان" کو اس کے برہمن وزیر کلر نے تخت سے اتار کر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ اس وزیر نے ایک نئی خاندان

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۲۔ مباہی دانستہ انظار عنایت بدولت و اقبال را باحوال فرخندہ مآل مہاراجہ معزی الیہ یوماً فیوماً متزاید دیے نہایت دانند بتاریخ پانزدہم محرم سال بست وہفتم از جلوس بدانوس مقدس زیب تحریر وزینت نظیر پذیرفت" (ماخوذ از چھتری کل تھمن صہ ۵۱۳، صہ ۵۱۵) یہ فرمان توموڑس کے رئیس راجہ پاٹن کے پاس اب بھی موجود ہے۔ پاٹن ریاست جے پور سے ۳۵ کوس کے فاصلہ پر بجانب شمال واقع ہے۔ اس کے ارد گرد ۱۵۰ اسلام مواضعات تومر راجپوتوں کے آباد ہیں۔ رئیس راجہ جے پور کا ماتحت ہے۔

۲۔ خانہ خالی را دیو میگیرد کے مصداق اس ویرانہ میں جوگنیاں اور بھوت پریت رہتے تھے لوگوں کا الیا خیال تھا اسی وجہ سے لوگ اس کو جوگن پور کہنے لگے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ چھتری کل تھمن صہ ۲۵۶)۔

کی بنیاد ڈالی جو "برہمن شاہی" کہلاتا ہے۔ اسی خاندان میں جے پال و انند پال وغیرہ راجہ ہوئے۔ اس خاندان کے حدودِ حکومت[ع۱] سے کابل کا صوبہ شروع ہی سے نکل چکا تھا۔ ہندو شاہی راجاؤں کا صدر مقام اوہند[ع۲] یا وہند یا قندھار تھا جو پشاور سے جنوب مشرق میں

ع۱:- یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندو شاہیوں کے حدودِ حکومت کو سمجھ لیا جائے خصوصاً شمالی و مغربی سرحد تاکہ بعض مورخین کی تحریروں سے جن شبہات کے اُبھرنے کا امکان ہے وہ ختم ہو جائیں۔ بعض مورخین نے جن میں سر وولزلے ہیگ اور اُن کے متبعین کی جماعت پیش پیش ہے جے پال کی شمالی مغربی سرحد کو جلال آباد و لمغان تک بڑھا دیا ہے مگر یہ سراسر غلط اور حقیقت کے بالکل خلاف ہے کیونکہ۔

(۱) رتبیل کی حکومت دریائے سندھ کے مغربی کنارے تک وسیع تھی یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ کابل وغزنی کا علاقہ سامانی سلطنت میں شامل ہو اور یہ سلطنت جلال آباد تک کا علاقہ ملک پنجاب کے راجہ کو فتح کر لینے دے۔

(۲) یہ بات بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی کہ دریائے سندھ یا زیادہ سے زیادہ درۂ خیبر اور اُس کے پہاڑی سلسلے کی قدرتی حدود کو چھوڑ کر پنجاب کے راجہ اور اسلامی سلطنت کی غیر قدرتی حدود لمغان۔ (کابل و غزنی کے وسط کا علاقہ) کے میدان میں قائم ہوتی۔

(۳) اسلامی مورخین نے جے پال وغیرہ کو "شاہ ہندوستان" کے لقب سے موسوم کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے دائرۂ حکومت میں کابل کی مملکت شامل نہیں تھی۔ کابل کو ہمیشہ ایک الگ ملک مانا گیا ہے اور تاریخ میں "کابُشٔاہ" کے نام سے یاد کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو البیرونی ص ۳۴۶)

(۴) گیارہویں صدی عیسوی میں البیرونی نے کتاب الہند کے اندر ہندوستان کا حدودِ اربعہ بیان کرتے وقت کابل کو ہندوستان کا جز نہیں مانا ہے لیکن سندھ کو جہاں پر مسلمانوں کی تین سو برس سے حکومت قائم تھی ہندوستان ہی کا ٹکڑا بتاتا ہے۔ اسلامی ممالک سے ہندوستان پہونچنے کے راستوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بیرونی نے لکھا ہے "ملک سندھ ہندوستان کا جز اور اُس سے

(باقی مضمون صفحہ ۱۷۵ پر)

دریائے کابل اور سندھ کے سنگم پر واقع تھا۔ بعد کو لاہور مستقر قرار پایا۔

۱۰۔ کشمیر شمالی ہند کی پہاڑی ریاستوں میں کشمیر، نیپال اور آسام ممتاز ہیں کشمیر راجگان قنوج کی حکومت میں کبھی نہیں رہا لیکن راجہ ہرش نے ضرور وہاں کے راجہ سے بزور مہاتما بودھ کی ایک یادگار کو حاصل کیا۔ کشمیر کے حالات کلہن نے راج ترنگنی میں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۴) اپچھم میں ہمارے یہاں سے سندھ پہونچنے کا راستہ ملک نیم روز یعنی ملک سجستان ہو کر ہے اور ہندوستان پہونچنے کا کابل ہو کر لیکن یہی راستہ لازمی نہیں ہے اگر موانع رفع ہو جاویں تو وہاں ہر طرف سے پہونچنا ممکن ہے۔ ان پہاڑوں میں جو ہندوؤں کے ملک کو گھیرے ہوئے ہیں اُن حدود تک جہاں پر ہندو قوم کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے اسی قوم یا اُن کے مشابہ دوسری قوم کے سرکش لوگ آباد ہیں" (ملاحظہ ہو کتاب الہند صـ۲۶۳ مصنفہ البیرونی)

(۵) مذکورۂ بالا بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کابل کی طرف سے ہندوستان آنے جانے میں جو بڑی رکاوٹ ہے وہ سفید کوہ و سلیمان کوہ کے سلسلے ہیں جن میں درۂ خیبر، درۂ ٹوچی، درۂ گومل وغیرہ واقع ہیں اور یہی سلسلے ہندوستان کی غربی سرحد کا کام دیتے تھے۔ ہندو قوم اور اُن جیسے دوسرے لوگوں کے رہنے کی یہ آخری جگہیں تھیں چنانچہ ایک دوسری جگہ البیرونی ہندوستان کی پچھمی سرحد کا تعین کرتے وقت لکھتا ہے "ہندوستان کے پچھم کے پہاڑوں میں (سفید کوہ و سلیمان کوہ) مختلف افغانی قبائل رہتے ہیں جن کا سلسلہ ملک سندھ کے قریب ختم ہوتا ہے" (کتاب الہند صـ۲۷۷) اور یہی قدرتی سرحد ہندوستان وافغانستان کے درمیان آج تک چلی آرہی ہے (مولف)

(۶) مشرقی مورخ یعنی البیرونی کی شہادت آپ نے سن لی اب ہم اپنے بیان کی تائید مزید کے لئے مغربی ہی اسکول کے ایک نامور مورخ مسٹر اسٹینلی لین پول کی شہادت دیکر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ مورخ مذکور کا کہنا ہے "کہ عربوں کا ابتدا میں کوہ ہندوکش کے جنوبی کوہستانی ملک کا الحاق محض برائے نام تھا۔ سجستان کے خاندان صفاریہ (۸۶۳ء تا ۹۰۳ء) کا نامور فرمانروا یعقوب بن لیث (۸۶۷ء تا ۸۷۸ء)

(باقی مضمون صفحہ ۱۷۶ پر)

تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ ہیونگ سانگ کے زمانہ میں کشمیر کا راجہ غالباً دلبھ وردھن تھا جو کارکوٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے مرجانے کے بعد اس کے تین لڑکے یکے بعد دیگرے اس کے جانشین ہوئے جن میں پہلا للتا دیتہ مکتا پیڈ ہے جس نے قنوج کی عظمت کو خاک میں ملا دیا۔ اس کا پوتا جے پیڈ ایک نہایت اولوالعزم فرمانروا تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نویں صدی عیسوی کے شروع میں کارکوٹ خاندان پر زوال آگیا اور اس کی جگہ اُتپل خاندان نے کشمیر میں اپنی حکومت کا ڈول ڈالا۔

اُتپل خاندان کا پہلا حکمراں راجہ اونتی ورمن تھا جس نے ۸۵۵ء تا ۸۸۳ء کشمیر پر حکومت کی۔ اس کے بعد شنکر ورمن (۸۸۳ء تا ۹۰۲ء) نے اس کی جگہ لی۔ اس نے رعایا پر بعض نئے محاصل عائد کئے جن کی ادائیگی رعایا کی برداشت سے باہر تھی۔ اس راجہ کی وفات کے بعد تاریخ میں کھیم یا شیم گپت (क्षेमगुप्त) (950ء تا 958ء) کا حال ملتا ہے جس نے برہمن شاہی خاندان کی لڑکی دِدّا سے شادی کی۔ راجہ کے مرجانے کے بعد چونکہ اس کی اولاد نابالغ تھی اس لئے نابالغ راجہ کی مدارالمہام دِدّا ہوئی اس نے باوجود مخالفتوں اور بغاوتوں کے ۱۰۰۳ء تک یعنی اپنی عمر بھر کشمیر کو اپنے قبضہ میں رکھا۔ رانی کے مرجانے کے بعد چونکہ اس خاندان میں حکومت کے قابل کوئی نہ رہا اسلئے حکومت اُتپل خاندان سے لوہارا یا لہرا خاندان کی طرف منتقل ہوگئی۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۵:۔ پہلا شخص تھا جس نے کابل میں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ خاندان مذکور کے بعد سلطنت سامانیہ (۸۷۴ء تا ۹۹۹ء) کے گورنر برابر اس صوبہ پر حکومت کرتے رہے مقامی گورنر سامانیہ الپتگین غزنی میں پہلی آزاد اسلامی حکومت کا بانی ہوا (ملاحظہ ہو شجرات فرمانروایان اسلام ص ۲۰۷)۔ اس بیان کے مطابق بھی کابل تین سو برس سے مسلمانوں کے زیر نگین تھا اسلئے یہ کہنا کہ غزنوی چھیڑ چھاڑ سے پہلے رائے لوہار (لاہور) کے حدود حکومت میں کابل شامل تھا تاریخی شواہد کے خلاف ہے (مولف)۔

۱؎:۔ بحوالہ کتاب الہند صفحات ۳۳، ۵۱، ۲۴۷۔

لوہارا خاندان کا پہلا فرمانروا سنگرام راجہ ہے جو رانی دِدّا کا بھتیجا اور اُدے راج کا لڑکا تھا۔ اس خاندان نے ۱۱۷۲ء تک حکمرانی کی اسی خاندان کے راجاؤں سے محمود غزنوی کو سابقہ پڑا۔ کلہن نے اس خاندان کے ایک راجہ ہرش (۱۰۸۹ء تا ۱۱۰۱ء) کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے[1]
وہ تمام خرابیاں جو ایک خود مختار ظالم حکمراں میں ہو سکتی ہیں اس راجہ کے اندر موجود تھیں۔ اس کے ناجائز محصولات سے اگر رعایا پریشان تھی تو اس کی بیہودگیوں سے اہل خاندان بالخصوص اس کی سگی بہنیں اور اس کے والد کی بیوائیں نالاں تھیں۔ مندروں کی دولت اپنے کام میں لے آیا۔ ایسے ظالم کی حکومت زیادہ دن نہیں چل سکتی تھی چنانچہ ایک دن باغیوں نے اس کے محل پر حملہ بول دیا اور راجہ کو قتل کر کے اس کے محل کو آگ لگا دی اور [illegible] اس کو اٹھا کر پھینک دیا۔

راجہ ہرش کے بعد تخت حکومت لوہارا خاندان کی ایک دوسری شاخ میں منتقل ہو گیا۔ رانی کوٹا اس خاندان کی آخری فرمانروا تھی جس سے شاہ میر نے ۱۳۳۹ء میں حکومت چھین کر اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ نیپال اور ترہت کا علاقہ غازی ملک تغلق نے فتح کیا اور آسام کی مکمل تسخیر اورنگ زیب کے زمانہ میں ہو سکی۔

۱۱- دوآبہ اور بہار ریاستیں

گنگا اور گھاگرا کا دوآبہ گیارہویں صدی عیسوی کے شروع تک راجپوتوں، پٹنہ اور قنوج کا متنازعہ فیہ علاقہ رہا ہے لیکن ۱۰۵۱ء کے قریب یہیں کی ایک غیر آریائی قوم بھار یا بھار نامی حکومت قنوج سے بغاوت کر کے آزاد ہو گئی۔ اس قوم کی آبادی اب بھی [illegible] زیادہ [illegible] سلطانپور میں پائی جاتی ہے۔ ان کا دارالحکومت [illegible] اور [illegible] اگر مقامی روایات پر اعتبار کیا جائے (ضلع بہرائچ) [illegible] خاندان کی قوت [illegible] میں ملک

[1] راج ترنگنی جلد اول دیباچہ ص ۱۱۲ [illegible] انڈیا [illegible]

[2] بدایوں کے اطراف میں [illegible] بنایا جاتا ہے۔

(باقی مضمون ص ۱۷۸ پر)

ناصر الدین گورنر اودھ نے توڑا۔ ان کا کلی استیصال ۱۲۲۶ء میں ناصر الدین محمود کے ہاتھوں ہوا جبکہ وہ بہرائچ کا گورنر تھا۔ اس نے اس خاندان کے آخری راجہ دل اور بل کو جو غالباً مل کر حکومت کرتے تھے شکست دیکر برطرف کر دیا۔

گھاگرا کے شمال میں اضلاع بہرائچ و گونڈہ وغیرہ میں آٹھویں و نویں صدی عیسوی کے درمیان منگولین نسل کی ایک پہاڑی قوم نے جس کو تھارو کہا جاتا ہے عروج حاصل کیا۔ انھوں نے گندھرب بن کو جگہ جگہ کاٹ کر آباد کیا اور بودھوں کے مشہور لیکن اجڑے ہوئے شہر سہیت مہیت کو مستقر بنا کر ایک عرصے تک حکومت کرتے رہے۔ یہ لوگ بودھ مذہب کے پیرو تھے۔ اسی قوم کے آخری راجہ سہیل دیو سے سید سالار مسعود غازیؒ کی بہرائچ کے مقام پر ۴۲۴ھ ۱۰۳۳ء میں جنگ ہوئی۔ اس ریاست کا خاتمہ قنوج کے راٹھور راجہ سری چندر دیو کے ہاتھوں گیارھویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں ہوا۔ اور بقول مسٹر کارنیگی (Carnegy) "راجہ سہیل دیو سترکھ کے مقام پر ہار گیا۔ راجپوتوں نے جو برہمنی مت کے طرفدار تھے بودھوں کو ان اضلاع سے نکال دیا۔ سہیل دیو کے خاندان والے نیپال کے علاقے جنگل کو بھاگ گئے"۔ [۷۴]

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۷: اعلیٰ پور کا زبردست کھیڑہ راقم الحروف نے خود دیکھا ہے کہا جاتا ہے کہ اسے دہلی کے بادشاہ سید علاء الدین نے وہار قوم سے فتح کیا۔ آثار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ کبھی بڑا شہر آباد ہوگا۔ حال ہی میں کھیت جوتتے وقت کھیڑہ کے اندر سے ایک مورتی سنگ مرمر کی بنی ہوئی برآمد ہوئی جس کو مسلمانوں نے ہندوؤں کے مندر میں رکھوا دیا۔ (مؤلف)

[۷۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو گزٹیئر آف انڈیا ص ۵۷۔

[۷۲] دریائے گھاگرا کے شمال میں جو بن تھا اسے گندھرب بن اور جنوب میں یعنی فیض آباد اور سلطانپور کے بن کو بنودھا کہتے تھے (گزٹیئر آف انڈیا ص ۶۶)۔

[۷۳] ہندوستان کی قدیم تاریخ میں سہیت مہیت کا دوسرا نام "سراوستی" ہے جو مہاتما بودھ کے

(باقی مضمون صفحہ ۱۷۹ پر)

۱۲۔ بنگال کے پال | مشرقی مگدھ میں گپت خاندان کی ایک شاخ حکومت کرتی تھی اُن سے ایک اور خاندان نے حکومت چھین لی

جو تاریخ میں "پال" کے نام سے مشہور ہے۔ پال خاندان کی بنیاد گوپال ([illegible]) نے ڈالی۔ اس کے بیٹے دھرم پال ([illegible]) کو قنوج کے راجہ "اندرایودھ" نے مالوہ کے گوجروں کی مدد سے شکست دی لیکن اِس شکست کا بدلہ اُس نے اِس طرح لیا کہ دکن کے راشٹر کوٹوں کی مدد سے قنوج کو فتح کرکے شمالی ہند کا مالک بن گیا۔ اُس کا خاندان ایک عرصہ تک قنوج میں حکومت کرتا رہا۔ اِس کے بعد گوجروں کے راجہ بھوج نے انھیں قنوج سے خارج کرکے پرتہاروں کی حکومت قائم کی۔ مہی پال اور رام پال نے خاندان کی گئی ہوئی طاقت کو پھر بحال کرنے کی کوشش کی اور بنارس تک سلطنت بڑھالی۔ اِس خاندان کے آخری پال راجہ کو "سین خاندان" کے بانی راجہ "بجے سین" نے شہر گوڑ سے نکال کر اپنی سلطنت قائم کرلی۔ اب پال خاندان کے راجہ صرف معمولی سردار کی حیثیت سے بہار میں رہنے لگے جن کو آخر میں مسلمانوں نے فتح کرلیا۔ یہ خاندان بودھ مت کا پیرو تھا

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۸:۔ زمانہ میں نہایت آباد اور گلزار تھا لیکن آج کل ویران پڑا ہے۔ کھنڈر کی صورت میں ہے جس پر خودرو درخت اُگ آئے ہیں۔ یہ جگہ اجودھیا سے قریباً پچاس میل شمال مغرب میں دریائے راپتی کے کنارے ہے۔ دریا کچھ ہٹ کر بہہ رہا ہے۔ مہاتما بودھ کے زمانہ میں یہاں کا راجہ پرسنجیت تھا جو مہاتما بودھ کا معتقد و پیرو تھا۔ اُس کے لڑکے ورودھک نے راجہ ہوکر بودھوں پر بڑے مظالم ڈھائے۔ یہ ریاست [illegible] تک مگدھ کے باجگذار کی حیثیت سے قائم رہی۔ فاہیان نے جب اِس شہر کو دیکھا ہے تو اُجاڑ تھا صرف دو سو خاندان آباد تھے۔ ہیونگ سانگ بھی ادھر آیا ہے۔ اُس کو وہ تالاب دکھایا گیا جس میں راجہ ورودھک نے کود کر آگ سے جان بچانے کی کوشش کی تھی۔ یہ آگ مہاتما بودھ کی بددعا کا نتیجہ تھی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو لائف فلریہ)

ع [illegible]:۔ بحوالہ "گارڈن آف انڈیا" صفحہ ۶۶، ۶۲ مصنفہ [illegible]

"اودنت پوری" اور "وکرم شیلا" کی بودھ خانقاہیں انھیں کے عہد میں بنیں اور نالندہ کے مندر کی دوبارہ تعمیر ہوئی۔

۱۳- سین خاندان

اس خاندان کی بنیاد بیجے سین نے ڈالی۔ یہ دکن سے نوکری کی تلاش میں مگدھ کی طرف آیا اور یہاں ملازمت کر کے موقع پاتے ہی راجہ بن گیا۔ اس خاندان میں راجہ بلال سین اور لکشمن سین مشہور راجہ ہوئے ہیں۔ ان کے زمانہ میں برہمنوں کا مذہب چار سو برس تک دبا رہنے کے بعد پھر ابھرا اور خوب عروج حاصل کیا۔ اختیار الدین محمد خلجی نے بنگال فتح کر کے لکشمن سین کو پورب کی طرف بھاگ جانے پر مجبور کر دیا جہاں تیرھویں صدی عیسوی تک اس خاندان کے راجہ حکومت کرتے رہے۔

فصل سوم - جنوبی ہند کی ریاستیں

۱- بادامی کے چالوکیہ

عام روایتوں میں اس خاندان کو چندر بنشی راجپوتوں کی شاخ بتایا گیا ہے حقیقت کچھ بھی ہو لیکن اتنا یاد رکھنا چاہیئے کہ یہاں کی رعایا میں دراوڑی نسل کے باشندوں کی کثرت تھی اور دراوڑی علوم وفنون بھی اس حد تک ترقی کر چکے تھے کہ آریوں کو اپنی چیزیں یہاں داخل کرنے کی گنجائش نہ مل سکی۔ آریوں کے آنے کے وقت بھی یہاں کی زبانیں تامل، تلگو، کنڑی، ملیالم وغیرہ اپنے اندر ادبی شان رکھتی تھیں۔

شنت واہنوں کے مٹ جانے کے بعد ۳۰۰ء تا ۵۵۰ء یعنی دوسو برس تک دکن کے وسطی علاقہ میں چالکیک لوگوں نے حکومت کی۔ ان کی جگہ چالوکیوں نے لی اور کم و بیش بارھویں صدی عیسوی کے شروع زمانہ تک حکمراں رہے۔ اس خاندان کا بانی "پل کیشی اول" تھا۔ اس نے اشومیدھ یگیہ کی شاہانہ رسم منائی تھی۔ اس کے بعد خاندان مذکور کو اس کے پوتے پل کیشن دوم ۶۰۹ء تا ۶۴۲ء نے عروج پر پہونچایا۔ اس نے گجرات و مدراس

کیا ہے اور اس زمانہ کے مورخین نے بھی معبر کے حالات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ڈاکٹر
سید سلیمان ندوی نے وصّاف (المتوفی ۷۲۸ھ) اور رشید الدین مصنف جامع التواریخ
(المتوفی ۷۱۸ھ) کے حوالہ سے اپنی ایک ضخیم تصنیف "عرب و ہند کے تعلقات" میں صفحہ
۲۷۱ پر معبر یا کاردمنڈل کا نہایت دلچسپ حال تحریر فرمایا ہے چونکہ یہ تجارتی و سیاسی
نقطۂ نظر سے کافی اہمیت رکھتا ہے اسلئے اس کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے "معبر کولم سے
لیکر سیلوار (نیلور) کے ملک تک سمندر کے کنارے کنارے تین فرسنگ لمبا ہے
اس کے اندر بہت سے شہر اور گانوں ہیں...... چین کے بڑے جہاز جنکو "جنک"
کہتے ہیں یہاں چین و ماچین اور سندھ و ہند کے ملکوں سے بیش قیمت سامان اور
کپڑے لاتے ہیں۔معبر سے ریشمی کپڑے۔خوشبودار لکڑی لیجاتے ہیں۔اس کے دریا سے
بڑے موتی نکالے جاتے ہیں یہاں کی پیداوار یں عراق، خراسان، شام، روم اور یورپ
تک جاتی ہیں" اس کے بعد یہاں کے راجہ سندر پانڈے اور اس کے وزیر ملک
تقی الدین بن عبدالرحمٰن کا حال درج کیا ہے۔اسی سلسلہ میں تقی الدین کے بھائی
شیخ جمال الدین کی تجارت کے بارے میں لکھا ہے "چونکہ معبر میں گھوڑے اچھے
نہیں ہوتے اسلئے درمیان میں (یعنی راجہ اور جمال الدین کے مابین) یہ معاہدہ تھا کہ
جمال الدین راجہ کو چودہ سو مضبوط عرب گھوڑے قیس کی بندرگاہ سے لادیا کرے سال
میں دس ہزار گھوڑے خلیج فارس کی دوسری بندرگاہوں مثلاً قطیف البحرین، ہرمز،
الحساء وغیرہ سے آتے تھے اور ہر گھوڑے کی قیمت ۲۲۰ طلائی سکے مقرر تھی"۔اس کے
بعد کی سطروں میں راجہ کی وفات اور اس کی دولت کی تقسیم کا حال درج کیا ہے مرنے کے
بعد اس کے نائبوں، وزیروں اور مشیروں میں جو دولت تقسیم کی گئی اس کی کثرت کا اندازہ
یوں لگائیے کہ سات ہزار بیلوں کا بوجھ سونا اور جواہرات جمال الدین کے حصہ میں آئے۔
پانڈیہ حکومت بالآخر آپس کے خانگی جھگڑوں سے برباد ہوگئی۔معبر کے بقیہ حالات علاؤالد

[illegible]

ہندوستان کی ان تمام شمالی و جنوبی راجپوت ریاستوں میں قومی تفاخر اور نسلی امتیاز نے اگر آپس میں تلواریں چلوائیں تو ساتھ ہی ساتھ مذہب کی خاطر بھی بعض وقت خون بہایا گیا چنانچہ شمالی ہندوستان میں جدید ہندومت کے پیرووں یعنی گورجروں اور بہار کے بدھ پرمت پال راجاؤں میں جو لڑائیاں ہوئیں ان میں ایک حد تک مذہبی جوش کو بھی دخل ہے۔ اسی طرح جنوبی ہندوستان کے چیرا، چولا اور پانڈیہ خاندانوں میں باوجود ہم نسل ہونے کے مذہبی بیگانگت نے بعض اوقات کشت و خون کرایا۔ پچھلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ چندیلوں کے راجہ یشو ورمن (۹۳۰ء تا ۹۵۰ء) نے اپنے تعمیر کردہ کھجراہو کے مندر کی زینت کو بڑھانے کے لئے قنوج کے راجہ سے جنگ کی اور اس سے زبردستی ایک بیش قیمت بت کو چھین کر اپنے مندر میں لا کر رکھا اسی طرح ایک چیدی راجہ کرشن نامی نے اڑیسہ کے راجہ پر حملہ کر کے سومناتھ (دوارکا) میں نصب کرنے کے لئے ایک بت بزور شمشیر حاصل کیا۔

بتوں کے حصول کے لئے آپس میں یہ جنگ آزمائی سمجھ سے باہر ہے اس میں کچھ شبہ نہیں کہ قنوج اور مہوبہ کے راجہ نسلاً مختلف تھے لیکن دونوں ریاستوں کا مذہب غالباً ایک تھا یہی صورت چیدی اور اڑیسہ کے ریاستوں کے مابین تھی تو پھر یہ جنگ آزمائی یا تو اس لئے تھی کہ ان ریاستوں میں پوجے جانے والے دیوتاؤں کے درمیان بھی چھوٹائی و بڑائی کا سوال تھا اور اس لئے وہ ریاستیں ایک دوسرے سے اپنے دیوتا کی بزرگی منوانا چاہتی تھیں اور یا پھر اس لئے کہ بت بلحاظ ساخت و وضع قطع اس قدر خوبصورت و بیش بہا تھے کہ انھیں حریف سے چھین کر اپنے قبضہ میں کرنا ضروری سمجھا گیا۔ بہرحال اصلیت جو کچھ بھی ہو اس میں کلام نہیں کہ مشرق میں سیاست کے ساتھ مذہب کا ہمیشہ تعلق رہا ہے لیکن سیاست کے ساتھ مذہبی وابستگی کے بندھن اسی وقت تک سخت رہے ہیں جب تک کہ حریف پر سیاسی تفوق حاصل نہ ہوا۔ سیاسی اقتدار حاصل ہوتے ہی یہ بندھن

(۱) اول یہ کہ اِن حملہ آور ترکوں کو ہمارے ہندوستانی سرحدی راجاؤں نے خود ہی چھیڑ کر بیٹھے بٹھائے ایک آفت اپنے سر مول لی۔

(۲) دوسرے یہ کہ اِن حملہ آور غزنوی ترکوں کے ہندوستان میں بار بار آنے کا مقصد یہ تھا کہ سندھ و ملتان کے قرامطہ کا استیصال ہو سکے اور اس طرح اُن کی شرقی وجنوبی سرحد محفوظ ہو جائے تاکہ اُن کو اپنے شمالی و مغربی حریفوں کا جو اُس وقت کے ہندو راجاؤں سے یقیناً زیادہ خطرناک و طاقتور تھے دل کھول کر مقابلہ کرنے اور اُن کو نیچا دکھانے کا موقع مل سکے۔

(۳) تیسرے یہ کہ ترک اُنھیں قدیم مغول و تاتار، ستھین و ہن اور شکوں کی اولاد تھے جو شمالی و مغربی پہاڑی دَرّوں سے ہندوستان پر اب سے بہت پہلے بار بار حملہ آور ہوتے رہے تھے اور اب اُن کی اولاد نے مسلمان ہو کر اپنے بزرگوں کے کارناموں کو از سر نو دہرا لیا اسلئے مغربی مورخین کے پیش کردہ حملہ آوری کی فرضی داستانوں پر کان نہ دھرئے بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ حملے زمانۂ ماضی کے سیاسی حملوں کا ایک تتمہ تھے جن کا مقصد محض سیاسی برتری و تفوق حاصل کرنا تھا اور مذہب کو ان حملوں میں کہیں دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ علاوہ ازیں بقول پروفیسر محمد سرور صاحب "حملہ آوروں اور حملہ آوروں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بعض حملہ آور موسمی سیلابوں کی طرح آتے اور اپنا چند روزہ جوش و خروش دکھا کر پھر سمٹ سمٹا جاتے ہیں۔ اِن کی مثال آندھیوں کی طرح ہوتی ہے۔ گو خدا کی خدائی کو ان سے بڑے بڑے نقصان سہنے پڑتے ہیں لیکن کم سے کم بیماریوں اور آلائشوں کے جراثیم جو انسانیت کو بُری طرح چمٹے ہوئے ہوتے ہیں اُن کی وجہ سے چھٹ جاتے ہیں لیکن بعض حملہ آور ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے ساتھ ایک زندگی بخش تصورِ حیات اور ارفع و اعلیٰ نظامِ تمدن لیکر آتے ہیں اگرچہ اِن حملہ آوروں کا آنا بھی شروع شروع میں بڑی خونریزی کا باعث ہوتا ہے لیکن جوں ہی فتح و تسخیر کا عمل مکمل ہو جاتا ہے تو حملہ آور جو صالح فکر اور

بہتر تمدن اپنے ساتھ لیکر آئے تھے اُن کے اچھے اثرات مفتوحہ ممالک پر پڑنے لگتے ہیں چنانچہ اُن کی وجہ سے محکوم قوموں کی زندگی میں ایک حرکت پیدا ہوجاتی ہے وسط ایشیا سے آنے والے مسلمانوں کے ہندوستان پر حملے بھی اسی قسم کے تھے۔"[عہ]

(۴) لہذا آخری لیکن سب سے زیادہ ضروری چیز جس پر آپ کو غور کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت کے ہندوستان کے سیاسی جمود و انحطاط کو دور کرنے اور سماج میں ازسرِ نو زندہ دلی و تروتازگی کی روح پیدا کرنے کے لئے کسی زبردست سیاسی انقلاب کی ضرورت تھی یا نہیں؟ آپ اس کا جواب یقیناً اثبات میں دیجئے تو پھر یہ وہی انقلاب تھا جو قدرت نے مسلمانوں کے ہاتھ سے ہندوستان میں انجام دیا اس لئے آپ ہندوؤں و ترکوں کے تعلقات کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھئے۔

عہ ۱۔ ماخوذ از "مولانا عبید اللہ سندھی" صفحہ ۲۷۶ مصنفہ پروفیسر محمد سرور صاحب۔

باب چہارم استقرارِ سلطنت

فصل اوّل "سلاطین شنسبانیہ"

غوری خاندان کی مختصر کیفیت

افغانوں کی دو مشہور قومیں ہیں ایک قیسی دوسری شنسبی۔ قیس بن عیص المعروف بہ عبدالرشید کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ یہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں مدینۂ منورہ حاضر ہو کر مسلمان ہوا۔ اور افغانستان واپس آکر اپنے قبیلے کو مسلمان بنایا۔ عبدالرشید کی اولاد افغانستان و سرحدی صوبہ کی غالب آبادی ہے۔

شنسب بن حریق جو علاقۂ غور کا رئیس تھا حضرت علیؓ کے زمانہ میں مسلمان ہوا[1] اس کی اولاد افاغنۂ شنسبی کہلائی انہیں میں لودی و سوری پٹھان شامل ہیں۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ وہ ایران کے نیم تاریخی بادشاہ ضحاک کی اولاد میں ہیں لیکن جدید تحقیقات کی رو سے یہ بادشاہ "تاجیک" یعنی اہل ایران و عرب کی مخلوط نسل سے ہیں۔ اور غالباً خراسان سے اٹھ کر ان اضلاع میں آئے۔

محمود غزنوی کے زمانہ تک ان کے ماتحت قبائل افغانستان کے پہاڑی جرگوں کی طرح نیم خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور ان کے بہت سے افراد بت پرست تھے۔ اس خاندان کا تعلق سیاسیات اسلامیہ سے ایک عرصۂ دراز سے چلا آرہا تھا۔ بنو امیہ کے خلاف جب سازشیں شروع ہوئیں تو یہ خاندان ابو مسلم خراسانی کا شریک کار بن گیا۔ خلافت عباسیہ قائم ہو جانے پر اس خاندان کی عزت افزائی کی گئی لیکن جب علویوں

[1] ۔ طبقات ناصری ص ۲۹

نے عباسیوں کے خلاف سرگرمی شروع کی تو غور کا یہ خاندان محبِّ اہل بیت ہونے کی وجہ سے علویوں کا طرفدار بن گیا یہی وجہ تھی کہ جب قرامطہ نے خراسان و افغانستان میں اپنی تحریک شروع کی تو اِس خاندان اور ان کے ناقابل تسخیر کوہی علاقے کو اپنی کوششوں کا مرکز بنایا۔ محمود غزنوی نے جب ان پر فوج کشی کی تو "آہن گران" نامی قصبہ جو غزنی سے ۲۲۵ میل جانب غرب رود میں واقع ہے ان کا سب سے زیادہ مضبوط اور دشوار گزار قلعہ تھا۔ اور محمد بن سوری اُن کا ملک یا سردار تھا، جسے لڑائی میں شکست ہوئی اور قید کر کے غزنی بھیج دیا گیا۔ اِسی شکست کے بعد غور کا یہ شنسبی خاندان شاہان غزنی کا باجگزار ہو گیا۔ اور وہاں کے قبائل میں صحیح اسلامی عقائد کی اشاعت ہوئی۔

سلطان محمود غزنوی نے محمد بن سوری کے بعد اُس کے بیٹے ابو علی کو غور کا حاکم مقرر کر دیا۔ ابو علی کے بعد اُس کا بھائی شیش، شیش کے بعد اس کا لڑکا عباس، عباس کے بعد اُس کا لڑکا امیر محمد، امیر محمد کے بعد اُس کا بیٹا قطب الدین حسن اور قطب الدین حسن کے بعد اُس کا بیٹا عز الدین حسین یکے بعد دیگرے غور کے امیر مقرر ہوتے رہے عز الدین حسین نے سلطان سنجر سے نیازمندانہ مراسم پیدا کر کے غزنی کی اطاعت سے عملی طور پر آزادی حاصل کر لی اور سلطان مسعود الکریم اور اُس کے بیٹے ارسلان نے بے اتفاقی سے کام لے کر اُس کی آزادی کو تسلیم و گوارا کر لیا تھا۔ اس کی وفات کے بعد سلاطین غزنویہ کو اُس کی اولاد سے کام پڑا جس کا حال جلد اول میں تحریر کیا جا چکا ہے۔

سلطان علاء الدین حسین جہانسوز

سلطان علاء الدین الحسین بن الحسین بن سام شاہان شنسبانیہ میں چودھواں سلطان ہے۔

اس کے زمانہ میں غزنی کے سلطان بہرام شاہ نے علاء الدین کے دو بھائیوں کو قتل کرا دیا تھا جس کا علاء الدین نے بہت سخت انتقام لیا۔ عروس البلاد غزنی سات شبانہ روز جلتا رہا اور ادھر یہ افغانستان کا نیرو ایک قصر میں بیٹھا عیش و طرب کا لطف اُٹھاتا رہا آخر

آٹھویں روز مطربوں کو حکم دیا کہ چنگ و چغانہ پر یہ نظم گائیں جو خود اس نے اپنی مدح میں نظم کی تھی ؎

جہاں داند کہ من شاہِ جہانم	چراغ دودۂ عبّاسیانم
پر آں بودم کہ از اوباشِ غزنی	بجو رود نیل جوئے خوں برانم
ولیکن گندہ پیرانند و طفلاں	شفاعت می کند بخت جوانم
ببخشیدم بدیشاں جانِ ایشاں	کہ بادا جانِ شاں پیوند جانم

مگر اس جان بخشی کا اعلان ہونے تک کم از کم ستر ہزار آدمی قتل ہو چکے تھے۔ تمام عمارات کو کہ "در آفاق نہ بودند" جلا کر خاکستر بنا دیا گیا۔ مگر تقدیر نے اس سے اِن وحشیانہ مظالم کا بدلہ لینے میں دیر نہ کی۔ کیونکہ جب وہ واپس لوٹ کر فیروزکوہ پہنچا اور غرور میں سلطان سنجر سلجوقی کی خدمت میں وہ نذرانہ جو عزالدین حسین کے زمانہ سے بھیجا جاتا تھا بھیجنا بند کر دیا تو سلطان سنجر نے غور پر لشکر کشی کی اور اس کو پابہ زنجیر گرفتار کر کے خراسان کی طرف لے گیا جہاں وہ دو سال تک سنجری لشکر کے نانبائیوں کے تنور سلگاتا اور طرح طرح کی ذلّتیں اُٹھاتا رہا۔ آخر سلطان سنجر نے "ترکانِ غز" کے خطرات کو محسوس کر کے جہانسوز پر احسان کرنا

ع۱:۔ اس نظم کے چار اشعار اور ہیں جن کو صاحب طبقات ناصری نے نقل کیا ہے، دوسرے موقع پر مندرجہ ذیل نظم تحریر کی اس کے بھی کل آٹھ شعر ہیں جن میں سے بعض درج ذیل ہیں ؎ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو طبقات ناصری صفحہ ۵۵)

آنم کہ ہست فخر ز عدلم زمانہ را	آنم کہ ہست جود ز بذلم خزانہ را
انگشتِ دستِ خویش بدنداں کند عدو	چوں بر زہ کماں نہم انگشتوانہ را
بہرام شہ بکینۂ من چوں کماں کشید	کندم بکینہ از کمر او کمانہ را
پشتیِ خصم گرچہ ہمہ رائے و رانا بود	کردم بگرز خورد سر رائے و رانا را
کیں توختن بہ تیغ درآموختم کنوں	شاہانِ روزگار و ملوکِ زمانہ را

چوتھے شعر کے اندر رائے و رانا خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔

مناسب سمجھا اس لئے قید سے رہائی بخشی۔

جہانسوز کے واپس آنے کی خبر سن کر امراء نے ناصر الدین حسین بن شجاع الدین علی کو جسے اس کی غیبت میں اپنا بادشاہ بنالیا تھا قتل کرادیا۔ جہاں سوز نے فیروز کوہ آکر تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ انہیں ایام میں "ترکان غز" نے سلطان سنجر کو گرفتار کرلیا۔ اور انہیں کی ایک جماعت نے آکر غزنی پر قبضہ کرلیا۔ جہانسوز کا ۵۵۴ھ ۱۱۵۸ء میں انتقال ہوگیا۔ یہ ملاحدہ کا سرپرست تھا۔[1]

سلطان سیف الدین محمد جہانسوز کے بعد اس کا بیٹا سیف الدین محمد تخت نشین ہوا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے دونوں چچازاد بھائیوں شمس الدین اور شہاب الدین کو جو بہاء الدین سام کے بیٹے تھے اور جنہیں جہانسوز نے قید کردیا تھا رہائی دلائی۔ یہ سلطان نہایت نیک طینت اور رحمدل تھا۔ وہ اپنے بزرگوں کے قرمطی عقائد کے خلاف اسلامی عقائد کا سختی سے پابند اور ملاحدۂ الموت سے سخت متنفر تھا اس نے تخت نشین ہوکر ملاحدہ کے تمام منادوں اور اور مبلغوں کو جو حدود غور میں پھیلے ہوئے تھے قتل کرادیا۔ اس کے زمانہ میں ترکان غز نے غور پر حملہ کیا ان کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ لشکر فراہم کرکے رودبار مرو کی طرف بڑھا جہاں عین معرکۂ جنگ میں اس کے سپہ سالار ابو العباس شیث نے پیچھے سے آکر اس کو قتل کردیا۔[2] فوج بادشاہ کو مقتول دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی اور بادشاہ کی لاش بھی میدان ہی میں چھوڑ آئی۔ بھاگی ہوئی فوجیں شہر افشیں سے آگے جب ایک قصبہ میں آکر جمع ہوئیں تو ابو العباس نے تمام سرداران لشکر کو رضامند کرکے شمس الدین کو غیاث الدین کے لقب سے بادشاہ بنادیا اور اسی جگہ ہر قسم کا انتظام کرکے ترکان غز کو شکست دیکر پسپا کیا۔ یہ واقعہ ۵۵۸ھ

---

[1] منہاج سراج ص ۶۳

[2] یہ سپہ سالار قرامطہ کا ایجنٹ تھا۔ (مولف)

یا ۵۵۶ھ کا ہے۔

سلطان سیف الدین نے صرف ایک سال اور چند ماہ حکومت کی۔

سلطان شمس الدین الملقب بہ غیاث الدین ۵۵۶ھ/۱۱۶۰ء تا ۵۹۹ھ/۱۲۰۲ء

سلطان نے نہایت شان و شوکت کے ساتھ ۴۴ سال حکومت کی اس جواں سال بادشاہ کی فتوحات و کارنامے جنھوں نے عہد محمود کی یاد تازہ کردی تھی۔ ہماری تاریخ کے احاطے سے خارج ہیں۔ اہل ہند کو صرف اس کے بھائی شہاب الدین سے سابقہ پڑا جس نے بعض فتوحات کے بعد اپنا لقب معزالدین والدنیا محمد بن سام اختیار کرلیا تھا۔ شہاب الدین بامیاں سے جہاں وہ اپنے چچا فخرالدین مسعود کے پاس رہا کرتا تھا اپنے بھائی کے تخت نشین ہونے کے بعد اجازت لیکر فیروز کوہ چلا آیا۔ ابوالعباس نے چونکہ غیاث الدین کو تخت نشین کرایا تھا۔ اس لئے وہ اس پر بہت حاوی تھا۔ بادشاہ کو قابو میں رکھنے کے لئے شورشیں کراتا رہتا تھا۔ شہاب الدین نے آکر بھائی کو مشورہ دیا کہ اپنے مقتول چچا سیف الدین کا قصاص ضرور لیا جاوے چنانچہ ایک موقعہ پر سر دربار ابوالعباس کو قتل کرا دیا گیا۔ اس کے بعد تمام شورشیں خود بخود فرو ہوگئیں۔ سلطان غیاث الدین نے اپنے ہونہار بھائی کو تگین آباد اور گرم سیر کے علاقہ کا حاکم مقرر کیا جہاں سے وہ بار بار غزنی پر جو ترکان غز کے قبضہ میں تھا حملہ آور ہوتا رہتا تھا۔ بالآخر ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء میں ترکان غز کو غزنی سے نکال کر جب غوریوں نے تیسری مرتبہ غزنی پر قبضہ جمایا تو غیاث الدین نے اپنے بھائی شہاب الدین کو یہاں کا خود مختار حاکم بنا دیا۔

شہاب الدین الملقب بہ سلطان معزالدین دسام ۱۱۷۳ء تا ۱۲۰۶ء

چونکہ شاہی خاندان کے صوبیدار اپنی جگہ پر قریب قریب خود مختار حاکم ہوتے تھے۔

ع ۱۔ بقول فرشتہ ۵۶۲ھ دیکھو ۵۶

اس لئے بعض مورخین نے ۱۱۶۳ء کو اس کے عہد بادشاہی کا آغاز قرار دیا ہے حالانکہ اپنے بڑے بھائی کی زندگی میں شہاب الدین نے خود مختار ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا اور ہمیشہ اس کا مطیع اور فرماں بردار رہا۔

غیاث الدین کو اگر فیروز کوہ میں بیٹھ کر محمود غزنوی کے قدیم مقبوضات کو واپس لینے کی آرزو ہو سکتی تھی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ خاص محمودی پایہ تخت کا مالک جس کے سوختہ اور شکستہ در و دیوار اب تک ہمّت عالی کے حیرت انگیز کرشمے یاد دلاتے تھے اس کے جنوب و مشرق کے علاقوں کو پھر غزنی کے ماتحت لانے کی سعی نہ کرتا۔ ادھر اُسے اپنے چچا کے وہ حملے بھی یاد تھے جو اس نے شمس الدین کی تخت نشینی کے وقت کیے تھے کہ تیرے بھائی نے تو یہ نام پیدا کیا دیکھیں تو کیا کر کے دکھاتا ہے۔ بہرحال غزنی کا انتظام ٹھیک ٹھاک کرنے کے بعد اس نے ہندوستان کی طرف توجہ کی۔

ع۱۔ ۵۷۱ھ/۱۱۷۵ء میں غوری نے ملاحدۂ ملتان پر فوج کشی کی اور اسے فتح کر کے

ع۲۔ اُچ کی طرف متوجہ ہوا کیونکہ یہاں ملاحدہ نے پناہ لی تھی ۱۱۷۶ء میں اُچ بھی مفتوح ہو گیا اُچ کے راجہ کی رانی[1] نے غوری سے شادی کر لی۔

ع۳۔ ۵۷۴ھ/۱۱۷۸ء میں یہ معلوم ہونے پر کہ ملاحدہ کو گجرات کے نکھیلے راجہ بھیم دیو[2] نے پناہ دی ہے غوری فوج جرار لے کر چڑھ دوڑا لیکن فوج دوری سفر کی وجہ سے خستہ حال تھی۔ اس لئے بھیم دیو کے مقابلہ میں ناکامیابی ہوئی پھر بھی اس حملہ کا حسب منشا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ ملاحدہ نے گجرات کو آئندہ کے لئے اپنی سازشوں کا مرکز بنانا چھوڑ دیا

---

[1]۔ فرشتہ کی روایت کے بموجب غوری نے رانی سے نہیں بلکہ اس کی لڑکی سے شادی کی۔ جو غزنی جا کر فرطِ غم سے نڈھال ہو کر ۲ سال کے اندر مر گئی۔

[2]۔ بعض مورخین نے راجہ کا نام مولراج دوم بتایا ہے ر ملاحظہ ہو تالیف ڈاکٹر حبیب اللہ ص۵۳ فٹ نوٹ)

یا لم کر دیا۔ ع۱

عہ ۔ ۱۱۸۰ء میں ملک خسرو یا خسرو ملک پنجاب کے حاکم سے پشاور چھین لیا۔

عہ ۔ ۱۱۸۱ء ۵۸۰ھ میں غوری نے راجہ جموں کی دعوت پر پنجاب پر حملہ کیا اور سیالکوٹ میں سرحدی قلعہ بنوایا اور وہاں ایک سردار حسین خرمیل کو متعین کیا چکر دیو راجہ جموں کی خسرو ملک سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی خسرو ملک کی مدد سے کھوکر قوم نے راجہ جموں کی اطاعت سے انحراف کیا تھا۔ اس بنا پر اس نے غوری کو پنجاب پر حملہ کی دعوت دی تھی۔

ع۱۔ غوری کے واپس جاتے ہی خسرو ملک نے سیالکوٹ پر حملہ کیا لیکن ۵۸۲ھ ۱۱۸۶ء میں محصورین کی راجہ جموں نے مدد کی اس لئے قلعہ کو فتح نہ کر سکا ۱۱۸۶ء ۵۸۲ھ میں جب غوری نے دوبارہ پنجاب کے غزنی حکمراں پر فوج کشی کی تو وجے دیو ولد راجہ چکر دیو (چکر دیو کا انتقال ہو چکا تھا) نے غوری کی مدد کی اور پنجاب کا غور سے الحاق ہو گیا۔ مولف طبقات ناصری کے والد سراج الدین کو قاضی مقرر کیا۔ خسرو ملک کو غزنی پکڑ کر لے گیا۔ جہاں سے باپ بیٹے دونوں کو سلطان غیاث الدین کی خدمت میں فیروز کوہ بھیج دیا۔ غیاث الدین نے دونوں کو دو الگ الگ قلعوں ع۲ میں نظر بند کر دیا۔ بعد کو خوارزمشاہیوں سے مقابلہ کو روانہ ہوتے وقت غالباً اس خیال سے کہ کہیں ان کی موجودگی سے کوئی فتنہ برپا نہ ہو ۵۸۶ھ میں قتل کرا دیا۔

ع۱ ۔ افسوس ہے کہ قدیم مورخین نے گجرات پر حملہ آوری کے اسباب پر روشنی نہیں ڈالی۔ اگر یہ حملہ محض ملک گیری کے شوق کو پورا کرنے کے لئے تھا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ پنجاب کے قریبی علاقے کو چھوڑ کر اس دور دراز قطعۂ ہند پر کیوں توجہ کی گئی اس لئے اصل وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ملاحدہ نے اُچ و ملتان سے اخراج کے بعد گجرات میں پناہ لی ہو۔ اس قیاس پر یقین اس لئے اور بھی کرنا پڑتا ہے کہ غوری نے پنجاب فتح کرنے سے پہلے ۵۷۸ھ میں دیبل کو فتح کر کے سندھ کے ملاحدہ کا قلع قمع کیا (طبقات ناصری ص۱۱۶)۔

ع۲ ۔ قلعوں کے نام بلروان اور سیفرود (سنقران) ہیں جن کا پتہ چلانا آج دشوار ہے۔ (ملاحظہ ہو طبقات ناصری ص۲۶-۲۷، ۱۱۵، ۱۱۶)

نوٹ :۔ مدان ہا لم علی ترخ کو لاہور کا صوبیدار بنا دیا گیا۔ مولف طبقات ناصری

کی قلیل جماعت کو برداشت کرنا پڑا بادشاہ نے پہلے سے جو گئی شمشیرزنی شروع کی رائے گوبند
نے جو ہاتھی پر سوار تھا اپنے ہاتھی کو اس پر ریل دیا سلطان نے بھی حملہ آوری میں کوتاہی نہیں
کی دونوں کے وار ایک دوسرے پر برابر ہوئے ۔سلطان کے نیزے سے رائے گوبند کے دو
دانت ٹوٹ گئے اور رائے گوبند کے نیزے نے سلطان کے بازو کو زخمی کر دیا ساتھ ہی دوسرے
ہندو سرداروں کے وار بھی سلطان پر پڑے جس سے وہ سخت زخمی ہو کر بیہوش ہو گیا قریب
تھا کہ گر پڑے اتنے میں ایک خلجی بچے نے اس کے گھوڑے کی پیٹھ پر پیچھے سے سوار ہو کر سلطان
کو کولی میں لے لیا اور گھوڑے کو میدان جنگ سے صاف نکال لے گیا میدان جنگ سے
بیس میل کے فاصلہ پر لیجا کے سلطان کو اُتارا جہاں سے مفرورین اُس کو اپنے نیزوں کی
ڈولی بنا کر لاہور کی طرف لے گئے[1] محمد غوری لاہور سے پیشاور ہوتا غزنی واپس چلا گیا اور
وہاں جا کر بھگوڑوں کو بڑی سخت سزائیں دیں۔

ادھر پرتھوی راج نے فتح یاب ہو کر قلعہ بھٹنڈا پر حملہ کیا اور قاضی ضیاء الدین کو
محصور کر لیا یہ محاصرہ ۱۳ ماہ تک جاری رہا لیکن قلعہ فتح نہ کر سکا ۔ آخر ۱۳ ماہ کے بعد قاضی
ضیاء الدین تولکی نے خود ہی صلح کر کے قلعہ خالی کر دیا اور تمام سامان لے کر لاہور پہنچ گیا۔
۵۸۸ھ ۔غوری نے غزنی پہنچ کر ان لوگوں کو جو تلاوڑی یا ترائن کے میدان سے بھاگے
تھے۔سخت سزائیں دیں اس کو اس شکست کا بہت افسوس تھا۔ اگلے سال ایک لاکھ
بیس ہزار کی جماعت لیکر جس میں ۸۰ ہزار پیادے اور ۴۰ ہزار سوار تھے لاہور کی طرف
نہایت خاموشی سے روانہ ہو گیا۔ وہ پیشاور و ملتان ہوتا ہوا جب لاہور پہنچا ہے تو
قاضی ضیاء الدین تولکی بھی بھٹنڈا سے لاہور پہونچ چکا تھا۔ لاہور پہونچکر اُسنے اپنے
ایک سردار قوام الملک رکن الدین حمزہ کو اپنا سفیر بنا کر پرتھوی راج کے پاس
بھیجا جس میں سرہند اور تھانیسر کے علاقہ کو جو سلطنت اسلامیہ کا ایک حصّہ تھے ،خالی

[1] طبقات ناصری صـ ۱۱۹

کرنے کا مطالبہ کیا۔ پرتھوی راج چونکہ لڑائی کے لئے پورے طور سے تیار تھا۔ اس لئے سلطان کو نہایت سختی سے جواب دیا جس میں اپنی فوج کی کثرت اور جنگی ہاتھیوں سے ڈرایا گیا تھا پرتھوی راج کی فوج کو اس ہندو فوج پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے۔ جس نے محمد بن قاسم اور محمود غزنوی سے شکستیں کھائیں تھیں۔ کیونکہ اول تو پرتھوی راج کی فوجوں کے دل گذشتہ فتح سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور دوسرے ہندو مسلمانوں کے طریق جنگ سے اچھی طرح آگاہ ہو چکے تھے اس کے علاوہ اس مرتبہ چھوٹے بڑے ۱۵۰ راجاؤں کی تین لاکھ منتخب فوجیں مقابلے کے لئے تیار تھیں۔ ۳ ہزار ہاتھی ان کے علاوہ تھے۔

سلطان کو جب پرتھوی راج کی طرف سے مایوسی ہوگئی تو اپنی فوجیں لے کر اسی میدان کی طرف بڑھا جہاں اس کو ایک مرتبہ پہلے شکست ہو چکی تھی۔ پرتھوی راج کی فوجیں پہلے سے موجود تھیں رات کے وقت سلطان نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے کی کمان تجربہ کار سپہ سالاروں کے ہاتھ میں دی اور انہیں سمجھا دیا کہ ایک وقت میں صرف ایک سردار حملہ کرے باقی چپ چاپ کھڑے تماشہ دیکھتے رہیں۔ جب زور شور کی لڑائی ہونے لگے تو مصروف جنگ سردار قصداً پسپا ہونا شروع کر دے اس طرح دشمن کی صفیں درہم برہم ہو جائیں گی۔ اور اس کی فوج میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ صبح تڑکے سے لیکر تیسرے پہر تک سلطان کے بتائے ہوئے طریقہ پر اس کے سرداروں نے لڑائی جاری رکھی عصر کے قریب وہ اپنے منتخب بارہ ہزار سواروں کو لے کر جو اب تک اس کے ساتھ خاموش کھڑے تھے ہندو لشکر کے قلب پر حملہ آور ہوا جہاں پرتھوی راج ڈیڑھ سو راجاؤں اور انتخابی سورماؤں کے درمیان موجود تھا۔ اس اچانک حملہ نے لڑائی کا پانسہ پلٹ دیا پرتھوی راج اور رائے گوبند نے بہ دشواری تمام میدان جنگ سے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔

مسلمانوں نے بھاگنے والوں کا تعقب کیا اور پرتھوی راج کو قلعہ سرسوتی کے قریب جالیا اور زندہ گرفتار کرکے اس کی مشعل حیات کو گل کردیا[1]۔ اس فتح سے ہانسی سامانہ اور کہرام کے قلعہ جات مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ اجمیر میں پرتھوی راج کے لڑکے اکولاجی کو راجہ بنایا اور دہلی میں پرتھوی راج کے دوسرے بیٹے رین جی کو گدی پر بٹھایا۔

سلطان کے واپس جانے کے بعد میرٹھ کے راجہ نے دہلی کے راجہ یعنی پرتھوی راج کے بیٹے کو سرکشی کی ترغیب دی اور جے چند نے پرتھوی راج کا انتقام لینے پر آمادگی ظاہر کرکے میرٹھ اور دہلی کے راجاؤں کی مدد کا وعدہ کیا۔ قطب الدین نے یہ سن کر قلعہ کہرام سے حملہ آور ہو کر میرٹھ اور دہلی کو بھی فتح کر لیا۔ اور کہرام کے بجائے دہلی کو دارالسلطنت بنایا۔ اسی سال کے موسم برسات میں انہلواڑہ کے راجہ بھیم دیو کے اشارے سے جاٹوں نے بسر کردگی جیٹوان ہانسی پر حملہ کیا اور وہاں کے گورنر نصرالدین کو محصور کر لیا۔ قطب الدین مدد کے لئے آیا اور ستمبر میں اس نے جاٹوں کو شکست

فتح میرٹھ ‖ دی ان کا لیڈر مارا گیا۔ اسی سال میرٹھ فتح کیا اور دسمبر ۱۱۹۲ء میں دہلی مفتوح ہوئی۔ قطب الدین نے دہلی کو اپنا صدر مقام بنایا۔ لیکن کہرام کے لئے یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رکا کیونکہ دوسرے اہم کام درپیش تھے۔

۱۱۹۵ء یہ سال فتوحات کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے بہت مبارک تھا۔ ۱۱۹۳ء کے موسم گرما میں اختیار الدین محمد بہار کو فتح کرتا ہوا مال غنیمت سے لدا پھندا دہلی آیا۔ قطب الدین

---

[1] طبقات ناصری صفحہ ۱۱۔ مولف تاج المآثر کی روایت یہ ہے کہ پرتھی راج کو اجمیر میں قید رکھا گیا چونکہ بعد کو سازش کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اس لئے قتل کر دیا گیا ملاحظہ ہو تاج المآثر صفحہ ۱۱۔ بحوالہ تالیف ڈاکٹر حبیب اللہ صفحہ ۵۹۔ چاند کوی کا یہ کہنا کہ محمد غوری پرتھی راج کو پکڑ کر غزنی لے گیا اور وہاں پرتھی راج کے تیر سے محمد غوری مارا گیا یا یہ کہ محمد غوری کو پرتھی راج نے گیارہ مرتبہ شکست دی اور اس کو ہر مرتبہ گرفتار کرکے چھوڑ دیا صحیح نہیں کیونکہ کسی قدیم فارسی مورخ نے اس کا تذکرہ تو کیا اشارۃً کنایۃً بھی نہیں کیا۔ (مولف)۔

نے اُس کی بڑی قدردانی کی اور اُس کو اس کا مفتوحہ علاقہ بطور جاگیر دے دیا گیا۔
اختیار الدین محمد بن بختیار قبیلۂ خلج کا ایک معمولی فرد تھا۔ یہ قبیلہ غزنی اور سیستان کے
درمیان آباد تھا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے اندر اولوالعزم آدمیوں کی کمی نہ تھی۔
اختیار الدین محمد نے پہلے ہژبر الدین حسن کی ملازمت اختیار کی، جو بدایوں کو چند ماہ
سے پیشتر فتح کر چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک دوسرے اولوالعزم سردار ملک حسام الدین
فاتح اودھ کی ملازمت کی اور دریائے گنگا اور سون کے درمیان کا علاقہ بطور جاگیر پایا۔
یہیں پر اختیار الدین کے پاس اُس کے قبیلے کے آدمیوں کا ہجوم ہوا جس کی مدد سے
اس نے اودنت پوری جو کہ بہار کا صدر مقام تھا فتح کر کے دہلی کی سلطنت میں
ملا یا۔

۹۔ اختیار الدین محمد کے دہلی سے رخصت ہونے کے بعد قطب الدین نے کول
کو فتح کیا اور یہیں پچاس ہزار سواروں کے ساتھ محمد غوری کے ساتھ شامل ہوا جو کہ قنوج
کے راجہ جے چند کو فتح کرنے کے لئے ہندوستان میں آیا تھا۔ محمد غوری خود قنوج کے
قریب مقیم رہا اور جے چند پر حملہ کرنے کے لئے قطب الدین کو بھیجا۔ لڑائی کا سبب درج
کیا جا چکا ہے۔ جے چند نے مسلمانوں سے موجودہ شہر فیروز آباد کے قریب چندواڑہ نامی
مقام پر مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور مارا گیا۔ اس طرح قنوج اور بنارس دونوں
مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔

۱۰۔ ۱۱۹۴ء میں ہیم راج برادر پرتھوی راج نے اجمیر پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔
پرتھوی راج کا لڑکا گولا جی جو اس سے پیشتر اجمیر کا راجہ تھا۔ رنتھنبور میں مسلمانوں کی
پاس پناہ گزین ہو گیا۔ رنتھنبور کے فاتح اور حاکم رکن الدین حمزہ قوام الملک نے
قطب الدین کو مدد کے لئے لکھا اس اثناء میں ہیم راج دہلی اور رنتھنبور پر فوج کشی کے
لئے اپنے رسالے بھیج چکا تھا۔ قطب الدین دہلی سے اجمیر پر حملہ آور ہوا ہیم راج کو

شکست ہوئی اور وہ چتا بنا کر جل مرا۔ اجمیر پر مسلمانوں نے اکو لاجی کو دوبارہ تخت پر بٹھایا
۱۱۔ ۱۱۹۵ء میں قطب الدین نے انہلواڑہ پر حملہ کیا انہلواڑہ کا راجہ بھیم دیو محمدؐ غوری سے ۱۱۷۸ء میں لڑ چکا تھا۔ اور اُس نے ہانسی کے گورنر نصرت الدین پر حملے کے لئے جاٹوں کی مدد کی تھی۔ راجہ کا سپہ سالار کنور پال قطب الدین سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ راجہ بھیم دیو بھاگ گیا۔ مسلمان مالِ غنیمت لے کر براہ ہانسی دہلی واپس آئے۔ قطب الدین محمدؐ غوری کی طلب کرنے پر غزنی چلا گیا۔ جہاں وہ جا کر بیمار پڑ گیا۔ محمد غوری نے اس کو وائسرائے بنا کر دہلی واپس بھیجا۔

۱۲۔ ۱۱۹۶ء کے آخر میں محمدؐ غوری ہندوستان پر حملہ آور ہوا قطب الدین اس سے ہانسی میں جا کر ملا۔ اس مہم میں بیانہ اور گوالیار مسخر کئے گئے۔

۱۳۔ ۱۱۹۷ء میں گرمیوں کے ایام میں راجہ بھیم والی گجرات کے اشارے سے اجمیر کے گرد و نواح میں بسنے والی ایک قوم مَر (the Mers) نے بغاوت کی۔ راجہ خود مدد کے لئے آیا۔ قطب الدین نے گرمی کی شدت کا خیال نہ کرتے ہوئے باغیوں کی متحدہ افواج پر حملہ کیا۔ لیکن شکست کھائی اور اجمیر میں محصور ہونا پڑا لیکن اس خبر نے کہ غزنی سے فوجیں آ رہی ہیں۔ ہندوؤں کو محاصرہ اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔ سال کے آخر میں قطب الدین نے امدادی فوجوں کو لیکر انہلواڑہ پر دوبارہ حملہ کیا۔ انہلواڑہ پر یہ حملہ براہ نادول اور سروہی ہوا تھا۔ اس لڑائی میں ۵۰ ہزار ہندو مارے گئے اور بیس ہزار گرفتار ہوئے۔

۱۴۔ شمالی ہند میں پانچ سال یعنی ۱۲۰۲ء تک سکون رہا۔ لیکن بنگال میں اختیار الدین محمدؐ کی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا اس نے زیرین بنگال کے راجہ لکشمن سین پر ۱۲۰۲ء میں حملہ کیا اور اس کے صدر مقام ندیا کو صرف ۱۸ سواروں سے فتح کیا۔ مال غنیمت لیکر لکھنوتی واپس آیا اور محمد غوری کے نام کا خطبہ سکہ جاری کیا کیونکہ محمد غوری ۱۱ فروری ۱۲۰۳ء کو اپنے بھائی کے مرنے پر غور کا بادشاہ ہو گیا تھا۔ لکشمن سین ندیا سے بھاگ کر وکرم پور نامی

کے وقت اُن ملاحدہ[1] نے جو سلطانی لشکر میں موجود اور بعض دربانی کی خدمت پر مامور
تھے موقع پاکر سوتے ہوئے سلطان کو چھریوں سے شہید کرڈالا۔ لاش غزنی لائی گئی اور
یہیں سپردِ خاک کی گئی۔ صاحب طبقاتِ ناصری نے اُس کی سنہ وفات تحریر کی ہے

شہادتِ ملکِ بحر و بر معزالدین — کز ابتدائے جہاں شہ چو او نیامد یک
سوم زغرۂ شعبان بسال ششصد و دو — فتاد در رہِ غزنین بمنزل دمیک[2]

۷۔ محمد غوری پر ایک نظر — محمود اعظم کی طرح محمد غوری بھی بڑی خوبیوں
کا حامل تھا۔ وہ عالموں کا قدردان۔ فیاض۔ منصف مزاج اور خدا ترس تھا۔ گو وہ
محمود غزنوی کی طرح کامیاب سپہ سالار نہ تھا لیکن اس کی فتوحات کہیں زیادہ منظم و دیرپا
ثابت ہوئیں۔ وجہ یہ تھی کہ محمود غزنوی نے اپنی تمام تر قوت مغرب میں ایک وسیع و عریض
سلطنت کے قیام میں صرف کردی۔ ہندوستان پر اس کے حملے اپنی جنوبی و مشرقی سرحد
کے تحفظ نیز قرامطہ کے استیصال کی وجہ سے ہوئے اس وجہ سے اس نے ہندوستان

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۰۷: یہ دمک کے بالکل قریب ایک راستہ "غوروں کے پھڑ" کے نام سے اب
تک مشہور ہے۔ پھڑ پنجابی میں پشتہ یا ٹیلہ کو کہتے ہیں مقام تعجب ہے کہ ابتک اس کا نام غوروں کا
پھڑ چلا آتا ہے۔ حالانکہ مقامی لوگ غوروں سے ناواقف ہیں (ماخوذ از رسالہ معارف بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۴۳ء)

ھ ۱:۔ مورخین نے ملاحدہ کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے مثلاً

۱۔ طبقاتِ ناصری میں فدائی ملاحدہ — ۲۔ جہاں کشائے جوینی میں فدائیاں
۳۔ گزیدہ مستوفی میں فدائیان ہند — ۴۔ ابن اثیر میں کفار الکرمیہ
۵۔ ذہبی میں اسماعیلیہ — ۶۔ ابن خلدون میں اسمٰعیلیہ
۷۔ مبارک شاہی میں فدائی ملاحدہ — ۸۔ بدایونی میں فدائی کھوکھر

(بحوالہ رسالہ معارف بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۴۳ء)

۲:۔ طبقاتِ ناصری صفحہ ۱۲۴

جو فلسفہ کے امام مانے جاتے ہیں اور مؤلف طبقات ناصری کے والد قاضی سراج الدین منہاج جو ہندوستان کے اسلامی لشکر کے قاضی تھے اور اسی طرح دوسرے لوگ بھی محمد غوری کی سرپرستی سے فیض اُٹھاتے تھے۔ ہندو شعراء کی بھی اُس نے سرپرستی کی کہتے ہیں کہ کیدار کوی اس کا درباری شاعر تھا[1]۔ منہاج الدین کے نزدیک محمد غوری کا درجہ بہت بلند ہے اس کا کہنا ہے کہ "محافظت ترتیب غزوات بر جادۂ مسلمانی ہم براں پادشاہ ختم شد" اسی طرح جہاں تک اس کے عدل کا تعلق ہے "در حوصلۂ تحریر نگنجد"[2]

محمود غزنوی کی طرح محمد غوری بھی نہایت مردم شناس تھا ایک نظر میں انسان کے ذاتی جوہر اُس پر عیاں ہو جاتے تھے چنانچہ وہ جس وقت گھکروں کی سرکوبی کے لیے ہندوستان آیا اور التمش کو دیکھا جو اس وقت قطب الدین کا غلام تھا تو اُس نے کھلے لفظوں میں قطب الدین کو یہ کہہ کر مخاطب کیا کہ "یہ (التمش) ہونہار ہے اس کی ہمت افزائی کرنا چاہیے"، چنانچہ قطب الدین ایبک نے اس کو آزاد کر کے اپنی لڑکی اُس سے بیاہ دی۔ یہ وہی التمش تھا جو آگے چل کر ہندوستان کا شہنشاہ ہوا

بیجا مذہبی تعصب نہ محمود غزنوی میں تھا اور نہ محمد غوری میں اگرچہ بارہا دونوں نے غیر مسلموں سے جنگ کی اور اُن کو قتل کیا لیکن کبھی کسی کو جبراً مسلمان نہیں کیا۔ محمود غزنوی، محمد غوری اور اُن کے جانشینوں کے لشکروں میں بہت سے ہندو سپاہی و سردار تھے، جو ان کے جھنڈے کے نیچے اُن کے ہندو و مسلمان حریفوں سے بے جگری کے ساتھ لڑتے تھے۔ چنانچہ جب محمود اعظم نے قنوج و متھرا کی طرف یلغار کی

---

[1] ہندی ادب کی تاریخ صفحہ [illegible]

[2] طبقات ناصری صفحہ ۱۲۴

حملہ کرنا چاہئے،" شہاب الدین نے اس تحریر کی پشت پر جواب لکھا "یہ انصاف کے خلاف ہے میں ایسا نہیں کرسکتا"[۱]

کیا یورپ جسے اپنی تہذیب و شائستگی پر ناز ہے کوئی ایسی مثال پیش کرسکتا ہے جس میں اس قدر رواداری سے کام لیا گیا ہو۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں جو مظالم عورتوں و بچوں پر کئے گئے اُن کا مقابلہ کرنا چاہیئے جنگ بنارس سے کہ جس میں ایک عورت اور ایک بچہ بھی ہلاک نہیں کیا گیا اور عہد حاضر کے اصول حرب کو سردار نہروالہ کے واقعہ سے مطابق کرکے دیکھنا چاہیئے۔ آج مخالف ملک کی تجارت کو تباہ و برباد کردینا، وہاں کے مال و اسباب پر قبضہ کرلینا اولین اصول قرار دیا جاتا ہے جب کہ محمد غوری اب سے آٹھ سو سال پہلے اس کو ناجائز سمجھتا تھا حقیقت یہ ہے کہ زمانہ کا قرب، و بعد اسلامی اصولوں کو تبدیل نہیں کرسکتا جس پر محمد غوری عامل تھا۔ ○

"محمود غوری ۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۵ء"

شہاب الدین محمد غوری کی شہادت کے بعد چونکہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اس کا ایک رشتہ دار علاء الدین جو بامیاں کی ریاست کا حاکم تھا بادشاہ بنا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد غوری کے بھتیجے اور غیاث الدین کے لڑکے محمود نے فیروز کوہ یعنی غورستان کے دارالسلطنت پر قبضہ کرکے علاء الدین کو خارج کردیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ محمود غوری صلح کل تھا۔ اس کے پاس صرف غور، سیستان، ہرات اور مشرقی خراسان تھا اور سلطنت کا باقی حصہ یعنی غزنی تاج الدین کے قبضہ میں اور دہلی و ملتان بالترتیب قطب الدین اور ناصر الدین قباچہ کے تحت میں تھے۔ پانچ چھ برس کے بعد جب محمود کا انتقال ہوگیا تو آپس میں ملکی لڑائیاں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ۱۲۱۵ء میں شاہ خوارزم نے غزنی کو

۱۔ جامع الحکایات قسم ۱ باب ۷۔ حکایت ۳۷

کو فتح کر کے غوریوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ مگر غوری لوگ چھوٹے چھوٹے حاکم ایک عرصہ تک رہے۔ چنانچہ بقول پروفیسر ڈارن صاحب محمد سام غوری نے چودھویں صدی کے شروع میں چنگیز خاں کے کسی جانشین سے مقابلہ کیا اور ہرات کو بچایا۔ خود تیمور نے اپنی تزک تیموری میں غیاث الدین بن ایاز الدین یا معز الدین کو خراسان، غرغستان اور غور کا حاکم ہونا بیان کیا ہے۔

"راجپوتوں کے انحطاط اور مسلمانوں کی فتوحات کے اسباب"

بعض مورخین نے عجیب مضحکہ خیز اسباب بیان کئے ہیں مثلاً یہ کہ "اہل ہند گرم ملک کے باشندے تھے اس لئے کمزور سست، بزدل اور کاہل تھے برخلاف اس کے فاتح جو سرد ملک کے رہنے والے تھے قوی چست و چالاک اور بہادر تھے یا یہ کہ راجپوت راجاؤں کے ہاتھی میدان جنگ سے بھاگ جاتے تھے اس لئے انہیں شکست ہوتی تھی وغیرہ وغیرہ۔" یہ اور اسی قسم کے دیگر خیالات صحیح نہیں ہیں۔ ہندوستان کے راجاؤں نے بھی میدان جنگ میں اپنے غیر ملکی حریف کی طرح بلا کی بہادری، ثابت قدمی، جسمانی طاقت اور قوت عمل کا ثبوت دیا ہے۔ ترک و افغان اور راجپوت درحقیقت ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ مسلمان قبائل ہمیشہ سیادت و قوت حاصل کرنے کے لئے آپس میں جنگ کرتے رہتے تھے۔ یہی حال راجپوتوں کا بھی تھا۔ دونوں کے یہاں لڑائی کا نتیجہ سپہ سالار کے انجام پر منحصر ہوتا تھا۔ بہرکیف حملہ آوروں کی کامیابی اور راجپوتوں کے انحطاط کے اسباب کچھ دوسرے ہی ہیں۔

سب سے اہم سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کے اندر تمدنی و مذہبی نظامات تمام و رسم برہم ہو چکے تھے۔ مذہبی علماء کی مطلق العنانی اور ان کی ذاتی اغراض

---

[1] ہندی ادب کی تاریخ [illegible]

نے اخلاق وتہذیب کو تباہ کر دیا تھا نئے نئے پنتھ اور گروہ نکل رہے تھے۔ دکن کے ایک
پنڈت وِجالا نے شیومت کے اندر لنگ اور بھگ کی پوجا کو اصل عبادت قرار دیکر ایک نیا فرقہ
جاری کیا۔ دکن میں آج بھی لنگ اور بھگ کی پوجا کرنے والے بکثرت موجود ہیں۔ انہیں
شیوی فرقوں میں اگھوریوں کا بھی ایک فرقہ ہے جو انسان کے گوشت کو کھانا جائز سمجھتا
ہے۔ مہادیو کے لنگ کی پوجا کرنے والوں کا معاصر ایک دوسرا گروہ اگم نامی پیدا ہوا۔
جن کے عقیدہ میں ناقابل بیان بے حیائیاں موجب ثواب سمجھی جاتی ہیں۔ اسی زمانہ میں
ہندوؤں کے اندر ایک ویشنوں کا فرقہ پیدا ہوا۔ ان کے مذہب میں کوئی چیز حرام نہیں ہے
ایک دوسرا فرقہ پرم ہنس نامی نکلا جن کے معتقدین نے داڑھی مونچھ منڈانا۔ مادر زاد
ننگے رہنا اور عورتوں سے لنگ کی پوجا کرانا احسن عمل قرار دیا۔ حاصل کلام یہ کہ یہ تمام
فرقے اور پنتھ ایجاد ہو رہے تھے اور کسی نہ کسی راجہ کی سرپرستی سے امداد پاتے تھے۔ مذکورۂ
بالا قسم کے تمام فرقے اور ان کے اعمال کا آج پتہ لگانا ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ ہندوؤں
کے اندر بت پرستی کی کثرت اور ایشور کے ایک ہونے کے تخیل نے خود اعتمادی اور
عزت نفس کے پاک جذبات کو بالکل مردہ کر دیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ادنیٰ و اعلیٰ کے
امتیاز نے قوم کے اندر سے محبت ویگانگت کو یکسر مٹا دیا تھا۔ ملک کی حفاظت اور
حکومت صرف اونچی ذات کے صرف ایک چھوٹے سے گروہ کے اندر محدود تھی اس لئے
ویش اور شودر طبقوں کو جن میں آبادی کا بہت بڑا حصہ شامل تھا۔ حکمراں طبقہ کی فتح و شکست
سے کوئی لگاؤ اور ہمدردی نہ تھی۔ چھتریوں کو بھی صرف اپنے حکمراں خاندان کی عارضی
فتح وکامیابی کی فکر ہوتی تھی ورنہ بقول ڈاکٹر تاراچند صاحب تہذیب و تمدن سماج

---

۸ تا ۱۰ ستیارتھ پرکاش باب ۱۱ ملاحظہ ہو صفحات ۳۸۵، ۳۸۴ - ۱۲ - ۱۱، ۱۹، ۱۵۰، ۱۵۰
۹۵-۹۴، ۹۸، ۹۹، ۴ — ۵۰۰ وغیرہ وغیرہ

۱۱ اس زمانہ میں عام کیفیت یہی تھی۔ البتہ علماء کے مخصوص گروہ کو مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے (مولف)

اور ملک کی حفاظت سے انہیں کوئی مطلب نہ تھا۔ غرضکہ ہندو سماج کا نظام اخوت و اتحاد پر مبنی نہ تھا۔ ہندو برائے نام ایک مذہب کے پیرو تھے ورنہ اصل میں ان کے اندر سیکڑوں فرقے درفرقے اور طبقے تھے۔ جنہیں ایک کو دوسرے سے کسی قسم کا کوئی ربط و لگاؤ نہ تھا۔ ان میں مذہب جماعتی نہیں بلکہ شخصی معاملہ سمجھا جاتا تھا۔ کھانا پینا تو درکنار عبادت بھی لوگ مل کر نہیں کر سکتے تھے۔ برخلاف اس کے مسلمانوں میں مذہباً کامل یک جہتی تھی۔ ان کا معاشرتی نظام اخوت و مساوات پر مبنی تھا۔ ان کے افراد کی فضیلت کا معیار نیک عمل اور فرائض مذہبی کی بجا آوری تھی ان میں اپنی قابلیت و لیاقت کی بنا پر ایک غلام کو بھی شہنشاہ بننے کا موقع تھا۔ اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اُن کے اندر توحید و رسالت کے معتقدات نے جوشِ عمل، عزتِ نفس اور خود اعتمادی کے جذبات پیدا کر دئے تھے۔ اُن کے اندر رنگ و نسل اور قوم و وطن کا امتیاز مفقود تھا۔ سب ایک تھے۔ اور سب برابر۔ ہر صالح کو خواہ وہ دُنیا کے کسی گوشہ کا کیوں نہ ہو ترقی کی تمام شاہراہیں کشادہ تھیں اور اُس کے برخلاف غیر صالح کے لئے خواہ دولت و حشمت کے لحاظ سے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اور حسب و نسب کے لحاظ سے کتنا ہی معزز کیوں نہ ہو قدم قدم پر تعزیریں تھیں۔ غرض مسلمانوں کے برخلاف ہندوستانیوں میں مذہبی، سیاسی یا سماجی اتحاد نہ تھا ان کے سماج کی بنیاد عدم مساوات اور عدم رواداری پر تھی اور یہی خاص وجہ اس قوم کی کمزوری کی تھی۔

راجپوتوں کو بیرونی حملہ آوروں کے مقابلہ میں جو ناکامی ہوئی اس کی دوسری وجہ اُن کی فوجی طاقت کا حریف کے مقابلہ میں کمتر ہونا ہے۔ ہندوستانی فوجوں کے سپاہی غیر تربیت یافتہ ہوتے تھے۔ اور عموماً وقت کے وقت بھرتی کر لئے جاتے تھے۔ یہ فوجیں ہاتھیوں رتھوں اور پیادوں پر مشتمل ہوتی تھیں ان کی نقل و حرکت سست اور جارحانہ قوت کا حلقۂ اثر محدود ہوتا تھا۔ ترک زیادہ تر گھوڑوں پر سوار ہو کر لڑتے

تھے۔ وہ دُنیا کے بہترین شہسوار اور تیرانداز تھے۔ اُن کے حملوں کا دائرہ بہت وسیع ہوتا
تھا۔ ہندوستان کی پیادہ فوجیں ان سواروں کے آگے ٹھہر نہیں سکتی تھیں۔ یہ سوار
ہندوستانی فوجوں کو چاروں طرف سے گھیر کر ایک دم ٹوٹ پڑتے تھے۔ اگر ان کا حملہ
ناکامیاب رہا تو فوراً بڑی تیزی سے پیچھے ہٹ آتے اور اپنے کو شکست سے بچا لیتے
اور اگر اپنے حملہ میں کامیاب ہوتے تو ہندو فوجیں سمٹ کر ایک مرکز پر جمع ہو کر بے بس
گڈمڈ ہو جاتیں اور مسلمان انہیں کاٹ کر رکھ دیتے۔ لیکن یہاں پر یہ بات یاد رکھنے
کے قابل ہے کہ اس سبب کو غزنوی دور کے صرف اولین عہد کے لئے صحیح قرار دیا
جا سکتا ہے کیونکہ اس کے بعد جب مسلمانوں کی پنجاب میں مستحکم سلطنت قائم ہو گئی۔
اور ان کا بنارس و کالنجر تک کی ہندو ریاستوں سے میل جول بڑھا تو ہندو بھی مسلمانوں
کے فنونِ جنگ سے آگاہ ہو گئے۔ چنانچہ راجہ پرمال کے شہرۂ آفاق درباری آلہ اودل
کے استاد میاں نعلی تھے سید صاحب بنارس کے جاگیردار اور راجہ کے دربار کے معززین میں
تھے۔ اسی طرح محمد غوری کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے پہلے بیسل دیو راجہ اجمیر
کے دربار میں ایک مسلمان سردار تاج الدین نامی تھا۔[1] بہت ممکن ہے کہ دوسری
ریاستوں میں بھی مسلمان سردار موجود ہوں جن کی وجہ سے اسلامی فنِ حرب ہندوستان
میں پھیلا ہو۔

---

[1] ملاحظہ ہو سلسلہ [illegible] ہندی ادب کی تاریخ [illegible]

ہے۔ دونوں بھائیوں نے تمام عمر ملاحدہ کے استیصال میں صرف کی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔

ملتان میں چونکہ قرامطہ کی حکومت رہ چکی تھی جس کا خاتمہ غزنویوں نے کیا تھا اب غزنوی اقتدار کے ٹھیس لگتے ہی پھر نئی شکل میں نمودار ہوئی۔ پہلے یہ حکومت قرامطہ کی سرپرست تھی اور اب اسماعیلیہ یا ملاحدہ کی پشت پناہ ہوئی اسی وجہ سے سلطان غوری نے ملتان پر حملہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس زمانہ میں (ملتان کی فتح کے وقت) محمد بن علی کرہ سوچ تمام سلاطین ملاحدہ میں سب سے زیادہ مستعد و چالاک تھا گمان غالب ہے کہ راجہ بھیم دیو حاکم گجرات کے درمیان غوری کے خلاف سلام و پیام کا سلسلہ جاری ہو کر دوستی کا عہد نامہ ہو چکا تھا۔ راجہ بھیم نے ملاحدہ کی شہ پاکر سندھ و ملتان کو علی کرماخ سے چھین لینے کا ڈول ڈالا۔ اسی خبر کو سن کر غوری نے گجرات پر حملہ کیا تھا۔ غوری نے ملتان و نواح ملتان و نیز شمالی مغربی پہاڑی قوموں۔ کے ملحدانہ عقائد کی درستگی میں بہت کوشش کی۔ خوارزمیوں کے ہاتھوں سے جب اُسے اندخود کے مقام پر شکست ہوئی تو اُس کا بُرا اثر اُس کی ہندوستان کی انھیں مفتوحہ اقوام پر زائد پڑا جن کی تسخیر کے لئے وہ ۱۲۰۵ء میں لاہور کی طرف آیا اور واپس جاتے ہوئے دمیک واقع ضلع جہلم میں ایک ملحد کے ہاتھوں سے شہید ہوا۔ ملاحدۂ الموت کی سرگرمیاں اس زمانہ میں معراج کمال کو پہونچی ہوئی تھیں۔ سلطان غوری کے لشکر کے پیش امام حضرت امام فخر الدین رازیؒ تھے۔ امام موصوف کی جلالتِ شان و تبحر علمی کا ایک زمانہ گواہ ہے۔ انہیں کے بارے میں حضرت مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے۔

"گر بہ استدلال کارِ دین بدے　　فخر رازی رازدارِ دین بدے"

ان کے شاگردوں میں کچھ ملاحدہ بھی تھے جن سے امام صاحب بالکل بے خبر تھے۔ یہ ملاحدہ جب مسلمانوں میں شامل رہتے تو اپنے آپ کو اعلیٰ درجے کا عابد و زاہد ثابت

کرتے اور بعض اوقات سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے۔ غوری کو اپنے لشکر میں اُن کی موجودگی کا علم نہ ہوسکا۔ بہر حال انھیں کے ہاتھوں ۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء کو شہید ہوا۔ شہید کرنے والے قاتل بھاگتے ہوئے پکڑے گئے اور پہچانے گئے تو وہی اشخاص تھے جو حضرت امام فخر الدین رازیؒ کی مجلس میں بڑے شوق اور گرویدگی سے شامل ہوا کرتے تھے۔ لوگوں نے قیاس کیا کہ امام صاحب کا تعلق بھی ملاحدہ سے ہے۔ اس لئے گرفتار کر لئے گئے۔ امام صاحب نے بڑی مشکل سے اپنی برأت کا ثبوت دیکر اپنی جان بچائی۔[1]

اِن کا خاتمہ ہلاکو خاں کے ہاتھوں ۱۲۵۶ء کے بعد ہوا جبکہ اُس نے اِن کے مستقر "قلعۂ الموت" کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

فصل دوم

خاندانِ غلامان جون ۱۲۰۶ء تا اپریل ۱۲۳۶ء

(۱) سلطان قطب الدین ایبک[2]
۲۶۔ جون ۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۰ء

اگرچہ سندھ و ملتان محمد بن قاسم کی مساعی سے اور پنجاب سلاطین غزنی کی کوشش سے مسلمان حاکموں کے زیر نگیں آگئے تھے اور ایبک کے دور تک اِن علاقوں میں اسلامی تہذیب و تمدن اوج کمال پر پہونچ چکے تھے لیکن اس امر کا سہرا ایبک ہی کے سر ہے کہ اس نے ہندوستان کے مرکزی شہر دہلی کو دار السلطنت قرار دیکر ہر قسم کے بیرونی دباؤ سے آزاد ایک اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اسی لئے مورخ اُسے ہندوستان کا پہلا فرمانروا قرار دیتے ہیں۔

---

[1] محمد غوری اور رازیؒ کے تعلقات کے سلسلے میں ملاحظہ ہو بدایونی ج ۱ ص ۵۳
[2] ایبک ترکی میں اُسے کہتے ہیں جس کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہو (طبقات ناصری ص ۱۳۸)

سے لڑنے کے لئے سرحد پر بھیجا گیا جہاں یہ قید ہو گیا اور ایک سال کے بعد رہائی پائی۔ بادشاہ کی نوازشات روز بروز بڑھتی گئیں اور بالآخر یہ اپنی خداداد قابلیت سے سلطان کے ہندی مقبوضات کا ایک دن نائب السلطنت مقرر ہو گیا۔

ایبک کی تخت نشینی

ایبک ۱۱۹۲ء سے ۱۲۰۶ء تک نائب السلطنت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہا۔ اِس دوران میں جو کارہائے نمایاں اس کی وجہ سے ظہور میں آئے ان کا تذکرہ پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ سلطان محمد غوری کو ایبک کی اطاعت شعاری، وفاکیشی اور جاں نثاری کا کما حقہٗ احساس تھا۔ چنانچہ جب ۱۲۰۶ء میں سلطان آخری بار پنجاب میں وارد ہوا تو غالباً فروری ۱۲۰۶ء کے موسمِ بہار میں لاہور پہونچکر ایک دربار منعقد کیا جس میں ایبک کو ملک کا خطاب عطا کر کے ہندوستان میں اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ ہمعصر مورخ فخر الدین مبارک شاہ صدیقی لکھتا ہے۔

"ایں پہلوان وجہاندار ہند را ملک خطاب فرمود، و ولی عہد ہند کرد[1]"

اِس جشن کے بعد سلطان نے ایبک کو دہلی روانہ کیا اور خود غزنی کی طرف مراجعت کی لیکن جہلم کے قریب دمیک کے مقام پر ۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء کو ملاحدہ کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔

ملک قطب الدین ایبک کو اپنے محسن و آقا کی شہادت کا بڑا صدمہ ہوا لیکن مصلحت وقت کے پیشِ نظر اپنے آپ کو سنبھالا اور تخت نشینی کے مراسم کی ادائیگی کے لئے لاہور واپس لوٹ آیا اور یہاں پہونچکر تمام اُمراء اور رعایا کے متفقہ تعاون سے تاجِ شاہی زیب سر

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۲۱۔ جب محفل ختم ہوئی تو قطب الدین ایبک نے جو کچھ زر و جواہر اور درہم و دینار انعام میں پایا تھا سب کا سب ادنیٰ خادموں کو تقسیم کر دیا اور ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھا۔ صبح کو جب اس کا علم محمد غوری کو ہوا تو اس نے ایبک کی اِس ادا کو بہت پسند کیا۔ اور اُسی وقت طبقۂ امراء میں اسے شامل کر لیا۔ (۱) طبقات ناصری ص۱۳۸ ، طبقات اکبری ص۴۰ ،

(۱) تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص۲۹

کیا۔ تخت نشینی کے مراسم ۱۸ ذی قعدہ ۶۰۲ھ مطابق ۲۵ جون ۱۲۰۶ء نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ادا کئے گئے[1]۔ دوبارہ یہی تمام مراسم دہلی میں ادا کئے گئے جبکہ محمد غوری کے جانشین سلطان غیاث الدین محمود نے فیروز کوہ سے ملک قطب الدین ایبک کے لئے ہندوستان کی سند حکومت، چتر شاہی اور خطاب سلطانی روانہ کیا۔ اس موقع پر سلطان قطب الدین ایبک نے اس قدر داد و دہش کی کہ لک بخش کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اُس زمانہ کے ایک مشہور فاضل بہاء الدین نے اِن الفاظ میں تعریف کی[2]:

"اے بخشش لک تو جہاں آوردہ — کان را کف تو کار بجاں آوردہ
از رشک کف تو خوں گرفتہ دل کان — وز لعل بہانہ در میاں آوردہ"

قومی حکومت کا آغاز

قطب الدین ایبک کی ۱۲۰۶ء میں لاہور میں تخت نشینی ہندوستان کی قومی تاریخ میں ایک نئے اور ولولہ انگیز دور کا آغاز ہے اور اسی سنہ سے ہم زمانۂ وسطیٰ کی تاریخ شروع کرتے ہیں۔ کیونکہ شہاب الدین غوری کے انتقال پر ہندوستان کی جدید حکومت میں غیر معمولی تغیر پیدا ہوگیا یعنی اس وقت تک ہندوستان کے جدید حکمران جو باہر سے آکر ہندوستان پر مسلط ہوئے تھے باہر سے حکومت کرتے تھے۔ یعنی غزنی یا غور ان کا پایۂ تخت تھا اور ہندوستان کی ایک صوبے کی حیثیت تھی لیکن جب شہاب الدین غوری کے انتقال کے بعد قطب الدین ایبک مرحوم سلطان کا ہندوستان میں جانشین قرار دیا گیا تو اس کو غزنی یا غور سے کوئی تعلق نہ رہا بلکہ دہلی اس کا پایۂ تخت قرار پایا اور اسی دہلی میں بیٹھ کر یہ ہندوستان کے تمام مقبوضات پر حکومت کرنے لگا۔ دوسرے الفاظ میں ہندوستان کا پایۂ تخت جو ملک کے باہر غزنی یا غور میں تھا وہ خود ہندوستان

---

[1]: ملاحظہ ہو طبقات ناصری فٹ نوٹ، برصفحہ ۲۵ از راورٹی۔

[2]: بحوالہ بدایونی جلد اوّل صفحہ ۵۵، طبقات ناصری فٹ نوٹ ۱ از راورٹی برصفحہ ۵۱۲، صفحہ ۵۱۳۔

میں آگیا کیونکہ قطب الدین اور اس کے تمام جانشینوں نے ہندوستان کو اپنا گھر بنالیا تھا اور وسط ایشیا سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اس طریقے سے ۱۲۰۶ء سے قومی حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ یقینی طور پر معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ قطب الدین چند سال اور زندہ رہتا تو اس کا آئندہ اصول عمل کیا ہوتا ممکن ہے کہ غزنی کی بادشاہی اور مرحوم آقا کی پوری سلطنت پر قبضہ کرنے کی آرزو اس کو بیرون ہند کی جانب کھینچتی اور اپنے ہم چشم اور ہم نشیں امرائے ترک میں امتیاز حاصل کرنے کا لالچ دلاتی لیکن اگر اس کے تربیت یافتہ غلام اور لائق جانشین کی آئندہ حکمت عملی دیکھ کر قطب الدین کے دلی منصوبوں کا اندازہ کرنا جائز ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ نہ صرف وہ بلکہ اس کے ساتھ بہت سے ترک سردار غالباً یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ان کا "مستقبل" ہندوستان میں ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ قطب الدین ایبک کی تخت نشینی ہندوستان کی متحدہ سلطنت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ تخت نشین ہوتے ہی قطب الدین نے تمام مخالف طاقتوں کو راستے سے ہٹا کر شمالی ہند کو ایک رشتے میں منسلک کرنے کی کوشش کی تاکہ تمام ملک دہلی کے مرکز کے تحت آجائے۔ اور یہ قطب الدین کا ایک مبارک منصوبہ تھا۔ کیونکہ ملک کو اس بات کی بہت ضرورت تھی کہ طوائف الملوکی کی جگہ جس میں ہندوستان کا ملک برسوں سے مبتلا تھا متحدہ سلطنت پیدا کی جائے اور حقیقت میں یہ بات کچھ کم سبق آموز نہیں ہے کہ ایک افغانی یا غوری بادشاہ کے غلام کے دل میں وہ وسیع سلطنت ہند قائم کرنے کے ولولے پیدا ہوئے جن سے دہلی کے عالی نسب چوہانوں اور قنوج کے ذی ثروت گھرانوں کے دل و دماغ عاری تھے۔ تاریخ ہند میں راجہ ہرش کے بعد قطب الدین ایبک ہی وہ شخص ہے کہ جس کا تمام ہندوستان کو "ایک چتر کے نیچے" لانے کی آرزو کرنا بجا تھا۔ صدیوں کے بعد لکھنوتی سے نہر والہ تک تمام اہل ہند

کو اپنی بیٹی دے دی اور تاج الدین یلدوز کی بہن سے خود شادی کر لی اور غالباً ان حالات میں جہاں تلوار کام نہ دے شادی بیاہ کا حربہ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں تاریخ ہند کے اور زمانوں میں بھی ملتی ہیں۔ یہ حربہ اس حد تک تو کامیاب ہوا کہ قباچہ نے اپنے خسر کی اطاعت اختیار کر لی لیکن یلدوز ایسا حریف تھا کہ اس ازدواجی تعلق کے باوجود اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس حریف سے قطب الدین آخر تک ڈرتا رہا۔ یلدوز قباچہ کی اطاعت سے مشتعل ہو گیا اور اپنے دعوے کے اثبات میں سندھ پر حملہ کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قباچہ کو ملتان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

قطب الدین نے ناصر الدین کی مدد کے لئے فوجیں بھیجیں۔ چنانچہ تاج الدین کو شکست ہوئی اور وہ لاہور سے غزنی اور پھر اپنے قدیم صوبہ کرمان کی طرف چلا گیا۔ قطب الدین نے آگے بڑھ کر ۶۰۲ھ/۱۲۰۵ء میں غزنی پر قبضہ کر لیا[1] لیکن تاج الدین کے جوابی حملے نے اسے لاہور واپس آنے پر مجبور کیا۔ جہاں وہ چوگان[2] کھیلتا ہوا ۱۲۱۰ء میں انتقال کر گیا۔

عادت و خصلت

سلطان قطب الدین نے فتح دہلی سے لیکر مرتے[3] تک اٹھارہ سال ہندوستان میں حکومت کی جس میں سے چودہ سال وہ وائسرائے کی حیثیت سے رہا اور آخری چار سال ہندوستان کا شہنشاہ رہا۔ سلطان ہونے کے بعد کوئی قابل تذکرہ جنگ کسی ہندو راجہ سے اس نے نہیں لڑی بلکہ وہ اپنی حکومت کے

۱۔ قطب الدین نے اپنے حریف تاج الدین یلدوز سے غزنی فتح کر کے وہاں چالیس روز تک داد عیش دی اس پر وہاں کے امراء نے تاج الدین کو کرمان سے بلایا جہاں وہ شکست کھا کر چلا گیا تھا۔ (طبقات ناصری ص ۱۳۵)

۲۔ قرون وسطیٰ میں مسلمان سلاطین اور امراء میں چوگان کا کھیل بہت مقبول تھا۔ ہمارے زمانہ میں "پولو" کوئی نئی چیز نہیں ہے (مؤلف)

۳۔ قطب الدین ایبک کی تاریخ وفات "سلطنت پناہ" سے نکلتی ہے۔

باپ کا نام ایلخان تھا اس کو اس کے چچازاد بھائیوں نے از راہ حسد ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ اس سوداگر نے اس کو بخارا میں لا کر ایک دوسرے سوداگر کے ہاتھ بیچا۔ اس سوداگر نے اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت اپنے بچوں کی طرح کی۔ پھر اس کو حاجی جمال الدین چست قبا نے خریدا۔ حاجی جی موصوف سے اس کو قطب الدین نے اپنے آقا محمد غوری کی اجازت لیکر ایک لاکھ جیتل (ڈیڑھ ہزار روپیہ) میں خرید لیا۔ پہلے اس کو میر شکار کا عہدہ دیا۔ بعدہٗ گوالیار برن اور بدایوں کا یکے بعد دیگرے گورنر بنایا۔ آخری مرتبہ جب محمد غوری گھکر یا کھوکر قوم کا فساد رفع کرنے کے لئے ہندوستان آیا تو اس موقع پر شمس الدین نے اپنی کارگزاری سے محمد غوری کو بہت مسرور کیا۔ محمد غوری نے خلعت فاخرہ عطا کر کے قطب الدین سے اس کی سفارش کی کہ یہ جوہر قابل ہے اس کو بڑھانا چاہئے۔ چنانچہ قطب الدین نے اس کو آزاد کر کے اپنی لڑکی بیاہ دی۔

تخت نشینی کے وقت سلطنت کی حالت	آرام شاہ کے بادشاہ ہوتے ہی ناصر الدین قباچہ نے سندھ و ملتان

میں خود مختاری کا اعلان کیا۔ اُدھر بنگالہ میں حسام الدین عوض خلجی نے خود مختار ہو کر تاج شاہی سر پر رکھا۔ تاج الدین نے غزنی سے حملہ آور ہو کر لاہور اور تمام پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ صرف صوبہ

۱؎ حسن سیرت اور فراست کے ساتھ خدا نے اسے زیور جمال سے بھی آراستہ کیا تھا اور جب دوبارہ کوئی سوداگر خرید کر اسے غزنی لایا تو اس کی شہرت سلطان معز الدین سام کے دربار تک پہنچی۔ مگر سوداگر نے اس کی قیمت اتنی زیادہ طلب کی کہ بادشاہ ناراض ہو گیا اور اس نے دوسروں کو بھی اس غلام کے خریدنے سے روک دیا۔ کئی سال پھر بعد جب قطب الدین ایبک دہلی سے غزنی گیا تو اس نے بادشاہ سے بطور خاص شمس الدین کے خریدنے کی اجازت لی۔ اور یہ سودا غزنی کے بجائے دہلی میں طے ہوا۔ گویا خود ہندوستان والوں نے ہی آئندہ فرمانروا کو ایک لاکھ جیتل یا ۲۲۵۰ روپیہ آٹھ آنہ میں خرید لیا۔ (ملاحظہ ہو طبقات ناصری [illegible] از راورٹی)

۲؎ ۱۲۱۵ء تک لاہور یلدوز کے قبضہ میں رہا۔ ۱۲۱۷ء میں چنگیزیوں کے دباؤ سے جب خوارزمی

آگرہ و اودھ کا علاقہ دہلی کی حکومت میں شامل رہا۔ آرام شاہ اس بدنظمی کا کوئی تدارک نہ کر سکا۔ گوالیار۔ اجین۔ رنتھبور۔ قنوج اور منڈاور کے قلعے بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتے رہے۔ التمش کے تخت نشین ہونے کے بعد بعض مسلمان اُمراء نے مخالفت پر کمر باندھی۔ اس لئے شروع کے دو تین سال اس خانہ جنگی کے فرو کرنے میں صرف ہوئے

التمش کے مغربی حریف

تخت نشین ہوتے ہی غزنی کے حاکم تاج الدین یلدوز نے جواب تک دہلی کو غزنی کا ایک صوبہ سمجھ رہا تھا التمش کو بلا طلب سلطان کا خطاب اور تحفہ ہندوستان روانہ کیا۔[1] التمش اس بے عزتی کو بھولا نہیں۔ جب ۱۲۱۵ء میں شاہ خوارزم نے غزنی پر قبضہ کر لیا تو تاج الدین غزنی سے نکل کر لاہور چلا آیا۔ لاہور اس نے ناصر الدین سے فتح کیا تھا۔ التمش نے اس پر برا مانا کیونکہ وہ قباچہ کو باغی حاکم لیکن اس کی مملکت کو دہلی کا صوبہ سمجھتا تھا۔ یلدوز نے دہلی کی طرف خود ہی پیش قدمی کی۔ دونوں فوجوں کا تصادم تلاوڑی کے میدان میں ۲۵ جنوری ۱۲۱۶ء کو ہوا۔ یلدوز گرفتار ہو کر بدایوں میں قید کر دیا گیا اور یہیں اُس کا انتقال ہوا۔ اس کی قبر جامع مسجد شمسی کے جنوبی گوشہ کے عقب میں واقع ہے۔

یلدوز کے لاہور سے روانہ ہوتے ہی اُس پر ناصر الدین قباچہ نے پھر قبضہ کر لیا لیکن التمش نے ۱۲۱۷ء میں اُس سے لاہور چھین لیا اور بالائی پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۲۹ = غزنی کی طرف بڑھے اور انھوں نے غزنی پر قبضہ کر لیا تو تاج الدین یلدوز کو غزنی سے ہٹ کر لاہور چلا آنا پڑا۔ یہاں آ کر اس نے اپنے شہنشاہی حقوق کی بنا پر حکومت دہلی سے بھی بعض مطالبات کئے جنھیں التمش نے رد کر دیا۔

[1] التمش شروع سالوں میں اس قابل نہیں تھا کہ تاج الدین یلدوز جیسے قوی حریف سے ٹکر لے سکے اس لئے اُس نے پنجاب پر یلدوز کا حق شاہی تسلیم کر لیا۔

ادھر یہ لڑائیاں ہو رہی تھیں اُدھر شاہ خوارزم نے غور و غزنی کو فتح کر کے ہندوستان کی طرف فوجیں روانہ کیں۔ ناصر الدین قباچہ نے اِن فوجوں کو ملتان کے قریب شکست دے کر واپس لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ ۱۲۲۱ء میں مغولان چنگیزی کا طوفان ہندوستان کی طرف بڑھا۔ یہ بلا صحرائے تاتار سے اٹھی اور فلسطین میں جا کر ختم ہوئی۔ علاء الدین خوارزمی نے جو بلخ و بخارا کا نہایت مشہور بادشاہ تھا۔ چنگیز خاں کے کچھ سفیر قتل کرا دئے تھے۔ بس لڑائی کا یہی بہانہ تھا۔ خوارزم شاہ بحر خزر میں پناہ گزیں ہوا اور وہیں مر گیا۔ اُس کا بیٹا جلال الدین ۱۲۳۱ء تک مغلوں سے لڑتا بھڑتا رہا۔ اُس نے بعض مرتبہ مغلوں پر فتح بھی پائی لیکن اُس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ۱۲۲۱ء میں چنگیز خاں اس کا تعاقب کرتا ہوا اٹک کے کنارے تک آیا۔ اٹک کی لڑائی میں وہ خود موجود تھا۔ جلال الدین کی بہادری[۱] کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ آخر کار جلال الدین نے التمش سے مدد مانگی۔ التمش نے

۱۔ یہ لڑائی دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر لڑی گئی جلال الدین کے پاس صرف چند ہزار رفیق تھے اور مقابلہ کئی لاکھ تیغ زنوں سے تھا جن کو آج تک کوئی بھی مغلوب نہیں کر سکا تھا۔ لڑائی صبح سے دوپہر تک جاری رہی سلطان کے رفیق فوق العادت شجاعت سے لڑتے اور کٹ کٹ کر گرتے رہے حتیٰ کہ لشکر کے دونوں بازو میمنہ و میسرہ منتشر ہو گئے اور اُن کا کوئی سپاہی زندہ نہ رہا لیکن قلب سپاہ کی یکجہتی میں جس میں سلطان خود لڑ رہا تھا مطلق فرق نہ آیا۔ قلب سپاہ میں ۷ ہزار سے زیادہ نوجوان نہیں تھے ان میں سے بھی صرف ۷۰۰ باقی رہ گئے تھے۔ حملہ آور سمندر کی موجوں کی طرح ہر طرف سے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ اور ممکن تھا کہ چنگیز خاں کے حکم کے مطابق سلطان کو زندہ گرفتار کر لینے میں کامیاب ہو جاتے لیکن موقع کی نزاکت کا احساس کر کے سلطان کے ماموں زاد بھائی نے بیحد اصرار کے ساتھ اُسے میدان چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ سلطان اپنے جنگی گھوڑے سے اتر کر اسپ خاصہ پر سوار ہوا۔ اہل و عیال کو الوداع کہی اس کے بعد ایک آخری حملہ کر کے مغلوں کو تھوڑی دور تک ہٹا دیا اور پھر رخ بدل کر دریا کے کنارے آیا۔ دریا کا کنارہ اُس مقام پر آٹھ دس گز کے قریب بلند تھا۔ اتنی بلندی سے سندھ جیسے تیز و عمیق دریا میں گھوڑا کدا دیا اور خود بھی دریا [illegible]

(باقی صفحہ ۲۳۲ پر)

اس کو معقول جواب دے کر چنگیزی بلا کو ہندوستان کے سر سے ٹال دیا۔ اس نے جلال الدین کے سفیر کو اس بنا پر قتل کرا دیا کہ وہ فوج اور اُمراء میں سازش کا جال بچھا رہا تھا اور جلال الدین کو لکھا کہ بجائے لاہور کے دہلی کی آب و ہوا آپ کے زائد مفید ہوگی۔ جلال الدین سمجھ گیا۔ اس نے دہلی کی رہائش کو قبول نہ کر کے قوم کھوکر یا گھکر کی طرف توجہ کی۔ پہلے اُن سے لڑا اور پھر صلح کر لی۔ کھوکر قوم کے سردار نے اپنی لڑکی جلال الدین کو بیاہ دی۔ چونکہ گھکروں سے قباچہ کی ان بن تھی اس لئے جلال الدین نے اپنی مخصوص دس ہزار فوج کو لیکر قباچہ پر حملہ کیا اور اس کو شکست دے کر اُس سے خراج وصول کیا۔ بالآخر ۱۲۲۴ء میں وہ سندھ اور شمالی گجرات سے مال و دولت سمیٹتا ہوا ایران کی اُمید پر کرمان چلا گیا مگر دجلہ و فرات کے دوآبہ میں قتل کر دیا گیا۔

جلال الدین کا خطرہ ٹل جانے کے بعد ایلتتمش نے بنگال کی طرف توجہ کی جس کا ذکر آگے آئے گا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد ۱۲۲۸ء میں اُس نے آخری مرتبہ سندھ و ملتان پر حملہ کیا۔ ناصر الدین نے جلال الدین کے ہندوستان سے واپس جاتے ہی سندھ و ملتان پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔ وہ بالائی پنجاب کا بھی دعویدار تھا۔[1] ایلتتمش پہلے

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۳۱:۔ کام تھا کہ دوست و دشمن سب کے منہ سے واہ نکل گئی۔ چنگیز خاں اور اُس کے مغل جنگ آزما حیرت سے تکتے ہی رہے اور جلال الدین گھوڑا تیرا کر دوسرے کنارے پر پہونچ گیا (ماخوذ از تاریخ ہند ج ۲ ص ۱۳ مصنفہ سید ہاشمی صاحب)

[1] اصل وجہ یہی ہے جو مذکور ہوئی لیکن حملہ کا قریبی سبب بعض فارسی تاریخوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ خوارزمی فوج کے ایک حصہ نے چنگیز خانیوں سے شکست کھانے کے بعد سندھ کے شمالی مغربی اضلاع میں پناہ لی تھی۔ ناصر الدین قباچہ نے وہاں بھی انھیں چین نہ لینے دیا اور شکست دے کر اپنے ملک سے نکال دیا۔ ان شکست خوردہ اور مظلوم سپاہیوں نے سلطان دہلی سے فریاد کی اور وہ قباچہ سے ان کا انتقام لینے پر آمادہ ہو گیا (ماخوذ از تاریخ ہند ج ۳ صفحہ ۱۵ مصنفہ سید ہاشمی صاحب)

(باقی صفحہ ۲۳۳ پر)

اُچ کی طرف بڑھا۔ ناصر الدین اُچھ کو اپنے وزیر کے سپرد کرکے خود اہراوٹ (یہ شہر اب دریائے
سندھ نے مٹا دیا) کی طرف ہٹ آیا۔ ادھر لاہور کے گورنر نصیر الدین آئیلم نے التمش کے حکم
سے ملتان پر حملہ کیا۔ التمش نے ۹ فروری ۱۲۲۸ء کو اُچھ کا خود محاصرہ کیا اور اپنے وزیر
کمال الدین محمد جنیدی کو قباچہ کے تعاقب میں بھیجا۔ قباچہ نے مجبور ہو کر اپنے بیٹے
علاء الدین بہرام شاہ کو جو قطب الدین ایبک کی لڑکی کے بطن سے تھا التمش سے صلح
کرنے کے لئے بھیجا۔ چنانچہ صلح نامہ کے بموجب ہ مئی ۱۲۲۸ء کو اُچھ التمش کے قبضہ میں
آگیا۔ اس صلحنامہ کی اطلاع غالباً جنیدی کو نہ تھی اس لئے اُس نے قباچہ کا تعاقب جاری
رکھا۔ اور بالآخر بھکر میں قباچہ کو محصور کر لیا۔ قباچہ زیریں سندھ کی طرف فرار کے ارادے
سے کشتی میں سوار ہوا لیکن معہ خاندان کے ڈوب گیا۔ اس طرح یہ مہم بھی ختم ہو گئی۔ قباچہ
کی فوجوں نے التمش کی ملازمت قبول کر لی۔ التمش اگست ۱۲۲۸ء کو اپنے وزیر کو اپنا
قائم مقام کرکے دہلی لوٹ آیا۔ اُچھ سے واپسی کے وقت التمش اپنے ساتھ قاضی منہاج الدین
جوزجانی (مصنف طبقات ناصری) کو جو چند روز پیشتر وارد سندھ ہو کر اُچ میں مقیم تھا اپنے ہمراہ
لیتا آیا۔ وزیر نے سومرہ خاندان کے گیارہویں راجہ سنان الدین کو مغلوب کرکے جو زیریں
سندھ کا مالک تھا اُس کا ملک اُسی کو واپس کر دیا۔ اس طرح التمش کی حکومت مغرب میں
سمندر تک وسیع ہو گئی۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۳۲ شمس الدین التمش کی مذہبیت اور صالح زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان تمام وجوہ کے مقابلہ میں
سب سے زیادہ قرین قیاس وجہ یہ ہے کہ ناصر الدین قباچہ نے حکومت کے نشہ سے سرشار ہو کر ملتان میں بعض ایسی ناشائستہ
حرکتیں شروع کیں جو مذہباً قابل اعتراض تھیں۔ اس پر ملتان کے فاضل اجل حضرت شیخ بہاء الدین زکریا
ملتانی اور قاضی شرف الدین وغیرہ نے سلطان کو ادھر متوجہ کیا اور اس سے مدد مانگی (ملاحظہ ہو سیر الاولیا ۵۳۷
فوائد الفواد ص ۱۱۹، فرشتہ ص ۶۲۳، اسلامک کلچر ص ۱۲۹ بابتہ ماہ اپریل ۱۹۴۲ء)

۱:- اُچھ ملتان سے جنوب میں ۵۵ میل کے فاصلہ پر اور بھٹنڈہ سے دو سو میل کے فاصلہ پر دریائے ستلج کے کنارے آباد ہے۔

التمش اور بنگال

گذشتہ صفحات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اختیار الدین محمد نے کس طرح بنگال و بہار کو فتح کر کے ہندوستان کی اسلامی سلطنت کو وسعت دی۔ بنگال کے مفتوح ہونے کے بعد اُس نے تبت اور آسام کے فتح کرنے کی تجاویز پر غور کرنا شروع کیا۔ ۱۲۰۵ء میں میچ قوم کے ایک نومسلم سردار علی کی رہنمائی میں اُس نے دس ہزار سپاہیوں کو لیکر آسام و تبت کا رُخ کیا۔ موجودہ ضلع دیناج پور کے مشہور مقام دیو کوٹ سے گذرتے ہوئے کامروپ راج میں داخل ہوا۔ اُس نے راجہ کامروپ کو اپنا دوست بنا کر اُس سے وعدہ لیا کہ وہ آگے بڑھنے میں اُس کی مدد کرے اور واپسی میں اُس کی فوجوں کے سدِّ راہ نہ ہو۔ پھر بردھانکوٹ پہونچکر جو کہ کامروپ دیس کے راجہ کی شمالی سرحد پر واقع تھا ایک دریا کا پل باندھا اور اُس کو پار کر کے تبت کے ملک میں داخل ہوا۔ دس دن چلنے کے بعد ایک شہر میں داخل ہوا جہاں اس کو بہت سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ اس جگہ سے اُس نے واپس لوٹ آنا مناسب سمجھا اور اس مہم کو اگلے سال کے لئے بشرط تیاری اُٹھا رکھا۔ واپسی میں رسد کی قلت سفر کی صعوبت اور کامروپ کے راجہ کی وعدہ خلافی نے فوج کو بہت نقصان پہونچایا۔ دریا کا پل شکستہ پایا۔ ایک جگہ پایاب سمجھ کر فوج نے پار ہونے کی کوشش کی تو بہت سے ڈوب گئے۔ غرضکہ دس ہزار میں سے لکھنوتی پہونچتے پہونچتے بمشکل سَو سپاہی زندہ بچے ہندوستان میں مسلمانوں کی یہ سب سے بڑی ہزیمت تھی۔ اس کا اختیار الدین محمد کو سخت صدمہ ہوا۔ اور اُس نے بحالت بیماری اپنی جان دی اور بعض مورخین کے نزدیک خلجی قبیلہ کے ایک سردار علی مردان نے اُس کو مار ڈالا۔

اختیار الدین کی موت میں علی مردان کا لوگوں کو ہاتھ نظر آیا اس لئے اُسے گرفتار کر کے قید کر دیا گیا لیکن وہ بھاگ کر لاہور پہونچ گیا اور قطب الدین کو بنگال کی معاملات پر توجہ دلائی۔ قطب الدین کے سامنے چونکہ سلطنت کے دوسرے اہم مسائل درپیش تھے اس لئے اُس نے کوئی توجہ نہ کی۔ ادھر بنگال میں اختیار الدین محمد کے مرتے ہی منتشر

میں تقسیم جاگیرات پر جھگڑے شروع ہو گئے۔ اور اسی خلفشار میں علی مردان کا سب سے بڑا رقیب اور دشمن محمد بن شیران مارا گیا۔ علی مردان لاہور سے جا کر بنگال کا بادشاہ ہو گیا اور قطب الدین کے مرتے ہی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اپنا شاہی لقب علاء الدین اختیار کیا۔ علی مردان نے نہایت رعب و داب کے ساتھ تین سال تک حکومت کی۔ یہ نہایت ظالم اور طنطنہ کا بادشاہ تھا۔ بالآخر امراء نے اس کی سختی و ظلم سے تنگ آ کر اس کے خلاف سازش کی اور دیوکوٹ کے سرحدی گورنر حسام الدین عوض کو اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ علی مردان ۱۲۱۳ء میں مارا گیا۔

حسام الدین عوض نے غیاث الدین لقب اختیار کر کے تاج شاہی سر پر رکھا اور خود مختارانہ حکومت شروع کر دی۔ دہلی کی کمزوری اور خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اس نے بہار پر فوج کشی کی لیکن ناکامیاب رہا۔ التتمش نے بنگال کے معاملات کی طرف ۱۲۲۵ء میں توجہ کی۔ چنانچہ التتمش کے پہونچتے ہی عوض نے فوراً اطاعت قبول کر لی اور شاہی لقب ترک کر دیا۔ التتمش نے بہار کا گورنر اپنے ایک معتمد و معتبر سردار ملک عزالدین کو بنایا اور اودھ کی گورنری اپنے سب سے بڑے لڑکے ناصر الدین محمود کو دی تاکہ بہار و بنگال دونوں صوبوں کی نگرانی کر سکے۔ اس مہم میں ۳۰ ہاتھی اور ۸۰ لاکھ روپیے ہاتھ لگے[1]۔ التتمش کے پیٹھ پھیرتے ہی عیوض نے بغاوت کر دی اور بہار کے گورنر کو مار بھگایا۔ اس پر اودھ کے صوبیدار ناصر الدین محمود نے بنگال پر حملہ کیا اور ۱۲۲۶ء میں عیوض کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ تمام خلجی سرداروں کو جنھوں نے دہلی سلطنت کے خلاف ایک پارٹی بنا رکھی تھی قید کر دیا۔ محمود اپنی وفات تک یعنی اپریل ۱۲۲۹ء تک بنگال کا گورنر رہا۔ اس کے مرتے ہی حالات پھر بگڑ گئے۔ عیوض کے لڑکے بالکا یا بلکا نے اختیار الدین دولت شاہ بالکا کے نام سے خود مختارانہ حکومت شروع کر دی۔ ۳۱-۱۲۳۰ء کے موسم سرما میں التتمش نے دوبارہ

---

[1] ملاحظہ ہو طبقات ناصری صـ ۱۷۱

بنگال پر چڑھائی کی۔ بالکا قتل ہوا۔ اُس کی جگہ التتمش نے علاءالدین جانی کو بنگال کا گورنر مقرر کیا۔

اس کے بعد بنگال سلطنت دہلی کا ایک مستقل صوبہ بن گیا اور کم و بیش ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک یہاں کے صوبہ دار سلاطین دہلی کے فرماں بردار رہے اور اسی تعلق نے رفتہ رفتہ تمام شمالی ہندوستان کے باشندوں میں ہم ملک ہونے کا وہ احساس پیدا کیا جسے "اتحادِ اہلِ ہند" کی موجودہ آرزو کا پہلا تخم کہہ سکتے ہیں۔ دُنیا کے اور ملکوں میں بھی مطلق العنان بادشاہوں نے بالواسطہ یہ خدمت انجام دی ہے لیکن سلاطین دہلی کی ممتاز خصوصیت اور عظمت کا اس لئے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اُن کی انتظامی قابلیت اور منصوبہ شہنشاہی نے اتنے وسیع براعظم کی شیرازہ بندی کی اس منصوبے کا اظہار آگے چل کر ہم خود اُلغ خاں بلبن کی زبانی سنیں گے۔ ○

راجپوتانہ کی تسخیر

۱۲۲۵ء میں بنگال کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد التتمش نے راجپوتانہ کی طرف توجہ کی۔ اُس زمانہ میں راجپوتانے کے اندر راجپوتوں کے دو زبردست مستقر تھے ایک دہلی سے جنوب کی طرف رنتھنبور[1] (رنتھمبور) اور دوسرا مغرب کی طرف منڈاور[2] (منڈور)۔ اور دونوں ہی کا فتح کرنا ضروری تھا گو ان پر حملہ آوری کے وجوہ کی تفصیل کہیں درج نہیں ہے لیکن اُس زمانہ کے حالات

---

[1] دریائے چمبل کے کنارے ایک بلند پہاڑی پر یہ سنگین قلعہ تعمیر کیا گیا تھا اس کا قدیم نام رن استھمبا پور ہے یعنی جنگی ستون کا مقام۔ کہتے ہیں کہ ازمنہ گذشتہ میں، سو بار سے زیادہ اس پر حملے ہوئے اور کوئی بھی اسے فتح نہ کر سکا۔

[2] قلعہ منڈور یا منڈا در ریاست مارواڑ کا قدیم صدر مقام اور پریہار قوم کے راجپوتوں کا مرکز تھا۔ اجمیر سے تقریباً سو میل مغرب میں موجودہ جودھپور کے قریب اس کے کھنڈر آج بھی گذشتہ وسعت و سنگینی کی گواہی دیتے ہیں۔

پر نظر ڈالنے سے کئی باتیں سمجھ میں آتی ہیں مثلاً جوش سپہ گری کا تقاضہ یہ تھا کہ راجپوتانے کے سرکش منچلوں کو تلوار کا جوہر دکھا دیا جائے تاکہ اُن پر مسلمانوں کی جنگی برتری کا رعب غالب آجائے اور اس طرح وہ سلطنت دہلی کے لئے آئندہ خطرہ ثابت نہ ہو سکیں چنانچہ یہی طریق کار بیراکبر کے زمانہ تک سلاطین دہلی کار بند رہے۔ باجگذاری کا اقرار لینے کے سوا انھوں نے یہاں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو مٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اُن کے اعلیٰ تدبر اور موقع شناسی کی اس سے بہتر شہادت اور کیا ہوگی کہ اُن کے طریق عمل پر صدہا سال گزر جانے کے باوجود موجودہ فرمانروا بھی کاربند ہیں۔ چونکہ راجپوتانہ کی ریتلی سرزمین اور کوہ اراولی کی چوٹیوں کے پار گجرات و مالوے کے سرسبز میدان تھے اور دہلی سے وہاں پہونچنے میں راجپوتانے سے گذرے بغیر چارہ نہ تھا اس لئے بھی سلاطین دہلی کو بار بار حملہ کرنے کی ضرورت پیش آئی اور قلعہ رن تھمبور و چتور کی زمین بار بار بہادروں کے خون سے رنگین ہوئی۔

رن تھمبور کا قلعہ پرتھی راج کے قبضہ میں تھا جب مسلمانوں کا اجمیر پر قبضہ ہوگیا تو یہ بھی غالباً بغیر لڑے بھڑے مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ قرینہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جب آزادی پسند راجپوت اجمیر کو دوبارہ اپنے قبضہ میں نہ لا سکے تو انھوں نے رن تھمبور کو اپنا جنگی مستقر منتخب کیا اور مسلمانوں کی مختصر فوج کو جو یہاں مقیم تھی نکال کر کسی نہ کسی طرح اس پر قابض ہوگئے اسی وقت سے یہ قلعہ ایک طرح سے تمام مشرقی راجپوتانہ کے آزاد و جنگجو قبائل کا مامن بن گیا۔ اور چونکہ اس کے قریب ہی جنوب میں اراولی پہاڑ

---

۱ :- یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ راجپوتانہ پر غلبہ قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں نے قطب الدین ایبک ہی کے زمانہ سے راجپوتانہ کی کنجی یعنی اجمیر پر قبضہ کر لیا تھا۔ ضرورت کے وقت اسی مرکز جنگ سے وہ اپنی فوجیں راجپوتانے کے ہر گوشہ میں پھیلا دیتے تھے۔ یہی پالیسی انگریزوں نے بھی عمل کیا اور اسی پر براہ راست آخر تک اپنا قبضہ رکھا ہے۔ (مؤلف)

سلطنت دہلی میں داخل ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ راجپوتوں کے طاقت پکڑ جانے کا خطرہ بھی ایک حد تک جاتا رہا یہی وجہ تھی کہ التتمش نے ادھر سے فراغت پانے کے بعد اپنے سب سے خطرناک وقوی حریف قباچہ حاکم سندھ پر دھبی کے ساتھ حملہ کیا اور جمادی الاوّل ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء میں اُسے شکست دیکر سندھ کا دہلی سے الحاق کرلیا۔ اس طرح ۱۲۲۸ء میں قریباً پورا شمالی ہندوستان (مالوہ کے علاوہ) التتمش کے قبضہ میں آگیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ خلیفہ بغداد کے سفیر التتمش کے لئے بادشاہی کی سند اور خلعت لیکر دہلی آئے۔ یہ سفارت قاضی جلال عروس کے زیر سرکردگی تھی[۱]۔

منشور خلافت سلطنت دہلی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ خلیفۂ وقت نے حکومت کی سند عطا فرمائی ہو یا بالفاظ دیگر دنیائے اسلام نے ہندوستان کی مستقل اور جداگانہ بادشاہی تسلیم کی ہو ورنہ کچھ عرصہ پہلے تک دہلی کو سلطنت غزنی کے تابع سمجھا جاتا تھا۔ التتمش نے اس تقریب کی خوشی میں ۲۲ ربیع الاول ۶۲۶ھ مطابق فروری ۱۲۲۹ء کو جبکہ خلیفۂ بغداد المستنصر باللہ کے سفراء منشور خلافت لیکر آئے شہر کو آئینہ بند کرکے جشن ترتیب دیا اور اس کی یادگار باقی رکھنے کے لئے چھوٹے سے چھوٹے سکّہ پر بھی خلیفۂ وقت کا نام بزبان ہندی کندہ کرایا[۲]۔ اس سے یہ مقصود بھی تھا کہ عام پبلک کو یہ معلوم ہوجائے کہ آن کا قانونی واعلیٰ حاکم کون ہے نیز یہ کہ آن کا شہنشاہ یعنی التتمش بھی ان سلاطین کے ایک ہے جو دنیائے اسلام کی مرکزی حکومت (بغداد) کے تابع فرمان ہیں۔ اور اس طرح ہندوستان کا ملک دارالسلام کا ایک جزو ہے۔ اس سفارت نے ہند اور دیگر اسلامی ممالک میں سلسلۂ ارتباط کو قوی کردیا اور ایران وعراق کے اہل علم اور تاجر کثرت سے ہندوستان میں آنے لگے۔

---

[۱]:- ضیائے برنی صفحہ ۱۰۳

[۲]:- ایڈمنسٹریشن آف دہلی سلطنت ص ۲۷

آخری فتوحات وموت

شمالی ہند میں صرف مالوہ کا علاقہ باقی تھا جہاں غزنوی وغوری سپاہ کے قدم نہیں آئے تھے۔ راستہ میں گوالیار گو پہلے مسخر ہوچکا تھا لیکن اب خودمختاری کا دم بھر رہا تھا۔ اس لئے افواج شمسی نے بڑھ کر پہلے اسی قلعہ کا محاصرہ کیا اور دس گیارہ مہینے تک اسے گھیرے پڑی رہیں آخر ماہ صفر ۶۳۰ھ (۱۲۳۳ء) میں راجہ چھپ کر فرار ہوگیا اور باقی ماندہ محصورین نے جو غالباً فاقہ کشی میں مبتلا تھے قلعے کے پھاٹک کھول دئے۔

مالوہ خاص کو دو برس کے بعد فتح کیا گیا اس طرح ۶۳۲ھ (۱۲۳۴ء) میں بھیلسہ واجین کے مفتوح ہوجانے سے سلطنت دہلی کی حدود دریائے نربدا تک وسیع ہوگئیں۔ کہا جاتا ہے کہ اجین کے فتح کرنے میں اس نے مہاکال دیو کا بت خانہ مسمار کیا۔ اس مندر میں راجہ بکرماجیت کی بہت بڑی پتھر کی مورت نصب تھی جس کے ارد گرد چند چھوٹی چھوٹی تانبے اور پیتل کی مورتیں تھیں۔ انھیں اٹھواکر وہ دہلی لے گیا۔ تاریخ ہند میں ایسی بت شکنی کی خال خال مثالیں اور بھی موجود ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ مذہبی تعصب کسی خاص ملکی مصلحت پر مبنی ہوتا تھا ورنہ اسلامی شریعت کی رو سے جائز نہیں کہ منادر و معابد کو توڑا جائے۔ خود شمس الدین کی فتوحات ہمارے پیش نظر ہیں ان میں قلعہ منڈور (منڈاور) کا پرانا مندر جو ۱۲۱۱ء سے پہلے کا بنا ہوا ہے[1] اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کو ہر مندر کے توڑ دینے کا ایسا شوق نہ تھا جیسا کہ اس زمانہ کی انگریزی تاریخوں میں (کسی خاص مصلحت کی وجہ سے) دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بھیلسہ کے بالکل قریب ہی بودھ مت والوں کے کئی قدیم اسٹوپ (گنبد) اور زیارت گاہیں موجود ہیں جنھیں شمس الدین یا بعد کے کسی مسلمان فرمانروا نے خواہ مخواہ تڑوا کر مفت کا ثواب حاصل نہیں کیا۔

---

[1] گزیٹیر جلد ۲ صفحہ ۱۷۱۔

سنہ ۳۶-۱۲۳۵ء کے موسم سرما میں التمش نے گھکڑوں کی سرکوبی کے لئے سفر کیا لیکن راستہ میں بیمار ہوگیا۔ بیماری ترقی کرتی گئی اور اسی بیماری میں بروز سہ شنبہ ۲۰ شعبان ۶۳۳ھ مطابق ۲۹ اپریل ۱۲۳۶ء کو سلطان کا انتقال ہوگیا[1]۔ مقبرہ غیر مسقف مسجد قوۃ الاسلام کے عقب میں مہرولی جانے والی سڑک کے بائیں جانب واقع ہے۔

سلطان کی عادت و خصلت

یہ سلطان بڑا خدا ترس، رحمدل، عابد و زاہد، شب زندہ دار اور سخی و دلیر تھا۔ ارکان اسلام کی بڑی سختی سے پابندی کرتا اور دوسروں کو ترغیب دیتا۔ پنج وقتہ نماز بڑی مسجد میں باجماعت ادا کرتا اور درویش خدا آگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کی مجلس میں اکثر حاضر رہتا تھا۔ حضرت خواجہ صاحب موصوف خواجہ معین الدین چشتی رح کے خلیفہ اول ہیں۔ التمش موصوف کی بڑی عزت کرتا تھا۔ جب ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ مطابق ۷ دسمبر ۱۲۳۵ء کو قطب صاحب[2] واصل بحق ہوئے تو وفات سے پہلے وصیت کی کہ "اُن کے جنازہ کی نماز ایسا شخص پڑھائے جس نے کبھی عصر کی سنتیں قضا نہ کی ہوں اور ہمیشہ نماز باجماعت میں تکبیر اولیٰ شریک رہا ہو۔ علاوہ ازیں حرام کی طرف کبھی قدم نہ بڑھایا ہو۔ یہ شرطیں صرف سلطان التمش کی ذات

---

[1]۔ قاضی منہاج الدین جرجانی (مصنف طبقات ناصری) نے سلطان کی تاریخ وفات لکھی ہے ؎

چو شش صد سی و سہ از سال ہجری — گذشت و بست روز از ماہ شعبان
بشد سلطان شمس الدین التمش — بسوئے جنت المأویٰ خراماں

[2]۔ حضرت خواجہ صاحب موصوف کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں۔ نہایت ہر دل عزیز بزرگ تھے۔ ہندو و مسلمان دونوں اب تک اُن کا احترام کرتے ہیں چنانچہ سال گذشتہ یعنی دسمبر ۱۹۴۷ء میں جبکہ دہلی شہر کی فضا مکدر تھی اور بظاہر یہ غیر ممکن سی بات تھی کہ آپ کا سالانہ عرس ہو سکے اس موقع پر [illegible] مہاتما گاندھی جی کا دل بے چین ہوگیا اور انھوں نے خود مہرولی تشریف لیجا کر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے مشورے سے عرس کا انتظام کرایا۔ حضرت قطب صاحب رح کے بقیہ حالات زندگی ترکی سلاطین کے عہد حکومت کے دیگر صوفیاء عظام کے ساتھ الگ سے بیان کئے جائیں گے۔

میں پوری ہوتی تھیں، اس لئے اسی نے جنازہ کی نماز پڑھانے کی سعادت حاصل کی[1]"

واقعہ یہ ہے کہ حضرت قطب صاحبؒ کی صحبت نے التتمش کی زندگی پر بڑا اثر ڈالا۔ وہ اس کو رعایا پروری اور فقیروں، غریبوں، اور درویشوں کے ساتھ دوستی کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ اور وہ اس پر عمل کرتا تھا[2]۔ اس کی بابت حضرت قطب صاحبؒ فوائد السالکین[3] میں فرماتے ہیں۔

"اس کا (یعنی التتمش کا) اعتقاد صحیح تھا۔ راتوں کو وہ جاگتا، کسی نے اس کو سوتے نہیں دیکھا، وہ بیدار رہ کر عالم تحیر میں کھڑا رہتا اور اگر سو جاتا تو فوراً بیدار ہو جاتا، اٹھ کر وضو کرتا اور مصلّے پر جا بیٹھتا، اپنے نوکروں میں سے کسی کو نہ اٹھاتا اور کہتا کہ آرام سے سونے والوں کو تکلیف کیوں دی جائے، رات کو وہ گدڑی پہن لیتا تا کہ کسی کو خبر نہ ہو اور کسی شخص کو ساتھ لے کر باہر نکل جاتا اس کے ہاتھ میں سونے کے ٹنکوں کا ایک توشہ دان ہوتا، ہر مستحق کے دروازہ پر جاتا حالات پوچھتا اور مدد کرتا، وہاں سے واپس ہوتا تو مسجدوں، ویرانوں اور خانقاہوں و بازاروں میں گشت کرتا اور ان جگہوں کے رہنے والوں اور درویشوں کو مالی مدد پہونچاتا .... دن کو اس کے دربار میں عام اجازت تھی کہ جو ننگے بھوکے ہوں اس کے پاس لائے جائیں اور جب وہ آتے تو ان میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیتا اور ان کو قسمیں دے کر تلقین کرتا کہ جب ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ رہے یا کوئی ان پر ظلم کرے تو وہ یہاں آ کر عدل و انصاف کی زنجیر کو جو باہر لٹکی ہوتی ہے ہلائیں[4] تاکہ وہ ان کے ساتھ

---

[1] :- خزینۃ الاصفیاء ص۲۷۵، رسالہ معارف بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۲۴ء ص ۱۵۹۔

[2] :- جواہر فریدی ص۲۲۴ از اصغر چشتی، مونس الارواح قلمی ص۸ از جہاں آرا بیگم۔ اسی قسم کی تلقین حضرت قاضی حمید الدین ناگوری خلیفہ اوّل حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ بھی کرتے رہتے تھے (ملاحظہ ہو سبع سنابل ص۲۲۳) [illegible]

[3] :- یہ ۱۹ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے جس میں حضرت قطب صاحبؒ کی سات مجلسوں کے ملفوظات ہیں جنہیں ان کے مرید باصفا حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے جمع کیا ہے۔ [4] :- فوائد الفواد ص۲۳، فوائد السالکین قلمی ص۱۹۔

[5] :- عدل و انصاف کے لئے نور الدین جہانگیر کی طلائی زنجیر کوئی نئی چیز نہیں ہے، ہندوستان میں ترک سلاطین اس کا استعمال صدیوں پہلے سے جانتے تھے۔

انصاف کرسکے، ورنہ قیامت کے روز ان کی فریاد کا بار اس کی طاقت برداشت نہ کرسکے گی" [ع۱]

التمش کی اس نیک نفسی کی وجہ سے تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر اولیاء اللہ کی فہرست میں کیا ہے چنانچہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پیر و مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ نے سلطان کو جو آن کا مرید بھی تھا انسان کامل بتایا ہے۔ انسان کامل از روئے تصوف خود فراموشی و خود آگہی کی چوتھی و آخری منزل ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ التمش کے عہد حکومت میں جب خواجہ عثمان ہارونیؒ دہلی تشریف فرما ہوئے تو انھوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو سلطان کی تربیت پر مامور فرمایا تھا [ع۲] حضرت شیخ اجمیریؒ سے خصوصی تعلقات کا ثبوت مولف خزینۃ الاصفیاء کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی فراہم ہوتا ہے، لکھتا ہے:-

"بادشاہ رحم دل و عادل و سلطان کامل و یکی از خلفائے نامدار و مریدان باوقار خواجہ قطب الدین بختیارؒ است، و از محبوبان و نظر منظوران خواجہ معین الدینؒ سنجری بود، و کمال اعتقاد بخدمت حضرات اہل چشت نیک سرشت پیدا کرد، اگرچہ بظاہر تعلق بہ پادشاہی داشت لیکن از دل فقیر و فقیر دوست بود، کم خوردی و کم خفتی، شبہائے دراز بیدار بودے ۔ ۔ ۔ ۔ الخ" [ع۳]

اس میں شبہ نہیں کہ سلطان کو درویشوں سے تعلق و لگاؤ بچپن ہی سے تھا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ بخارا میں ایک حاجی نامی امیر کا غلام تھا اس کے مالک نے اسے کچھ پیسے دیکر انگور خریدنے کے لئے بازار بھیجا۔ پیسے راستہ میں کھو گئے چونکہ یہ ابھی بچہ ہی تو تھا زار و قطار رونے لگا کہ اتنے میں ادھر ایک درویش آ نکلا اس نے اسے دوکان پر لیجا کر انگور دلائے

ع۱۔ فوائد السالکین ص۱۹، رسالہ معارف ص۱۵۱ ماہ ستمبر ۱۹۴۵ء

ع۲۔ گنج الاسرار مولفہ حضرت شیخ اجمیریؒ مملوکہ برادرم خلیق احمد نظامی لکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اسلامک کلچر ص۱۶۲ ماہ اپریل ۱۹۴۶ء

ع۳۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص۲۷۹ از غلام سرور

[illegible]

۲ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضر ہوا اور نذر پیش کی حضرت شیخ نے بالمشافہ

دوسروں کے لئے دستور العمل کا کام دیتے رہے۔ وہ نہ صرف ایک بہادر سپاہی اور دانشمند مدبر تھا بلکہ عالموں اور درویشوں کا بڑا قدردان تھا"[1]

ڈاکٹر صاحب موصوف نے جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ التمش کی فیاضی و قدردانی نے دہلی کو علماء و فضلاء کا مرکز بنا رکھا تھا۔ بلبن جس کا دربار خود بھی اپنے عہد میں علماء کرام اور مشائخین عظام کے اجتماع کے لئے بے مثل و لاثانی تھا اکثر کہا کرتا تھا کہ اس نے ایسے اکابر و مشائخ کو کسی دربار میں نہیں دیکھا جیسے کہ التمش کے دربار میں تھے[2]۔ قاضی حمید الدین[3] ناگوری، حاجی مجد الدین[4]، مولانا جمال الدین[5] بسطامی، سید نور الدین مبارک غزنوی[6] اسی عہد کے درخشندہ جوہر تھے۔ فخر الملک عطائی[7] جو تیس سال تک بغداد

---

[1] :- اہل ہند کی مختصر تاریخ از ڈاکٹر تارا چند۔

[2] :- ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از برنی صفحہ ۱۳۷ تا ۱۴۲ نیز صفحہ ۲۵

[3] :- التمش قاضی حمید الدین ناگوری کا کتنا احترام کرتا تھا اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے بھتیجے ملک سعد الدین کو مرید ہونے کے لئے قاضی صاحب موصوف کی خدمت میں پیش کیا (ماخوذ از رسالہ اسلامک کلچر صفحہ ۱۶۴ ماہ اپریل ۱۹۴۶ء، سبع سنابل صفحہ ۲۳۳)۔

[4] :- حاجی مجد الدین کو جو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید و خلیفہ ہیں "صدر ولایات" کے ذمہ دار عہدہ پر مامور کیا (ملاحظہ ہو اخبار الاخیار صفحہ ۵۲)

[5] :- مولانا جمال الدین بسطامی کو شیخ الاسلامی کا عہدہ تفویض تھا (اسلامک کلچر صفحہ ۱۶۵ اپریل ۱۹۴۶ء)

[6] :- سید نور الدین مبارک غزنوی شاہی دربار میں [illegible] وعظ و تلقین کے لئے مشہور ہیں (ضیاء برنی صفحہ ۴۱-۴۲)

[7] :- فتوح السلاطین میں وزیر کی آمد [illegible] کے ساتھ درج ہے لیکن عطائی [illegible] بجائے اسے عصامی تحریر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو [illegible] السلاطین [illegible])

میں خلفاء عباسیہ کا وزیر رہ چکا تھا اور کمالات ظاہر و باطن میں شہرت تامہ رکھتا تھا سلطان التمش کے دربار میں آیا اور اسی کی قدر شناسی نے اسے منصب وزارت پر متمکن کیا قاضی منہاج الدین سراج (مصنف طبقات ناصری) اور نور الدین محمد عوفی (مصنف جامع الحکایات اور لباب الالباب وغیرہ) اسی کے زمانہ میں تھے چنگیز خانی فتنہ کی وجہ سے بہت سے حکماء و شعراء وسط ایشیا سے ہندوستان کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے انھیں میں امیر روحانی بھی تھا جو بخارا سے دہلی آیا اور التمش کی زرپاشیوں سے فیضیاب ہوا۔ غرضیکہ ان تمام بزرگوں کی وجہ سے سلطان کا دربار دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے محمودی و سنجری دربار معلوم ہوتا تھا۔

مذکورۂ بالا حضرات کے علاوہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ جلال الدین تبریزیؒ[1]، شیخ بدر الدین غزنویؒ[2]، قاضی قطب الدین کاشانیؒ[3] وغیرہ سے دہلی کی فضا معمور و منور تھی۔ سلطان کے پیر و مرشد حضرت شیخ عثمان ہارونیؒ[4] اور خواجہ معین الدین چشتیؒ کا بھی دہلی میں تشریف لانا ثابت ہے۔ خواجہ عماد الدین بلگرامی اور سید محمد صغریٰ بلگرامی

---

[1]۔ سلطان نے شیخ جلال الدین تبریزی کا جبکہ وہ بغداد سے دہلی تشریف لائے شاہانہ استقبال کیا اور مؤلف سیر العارفین کی روایت کے بموجب شیخ کو دیکھ کر فوراً گھوڑے پر سے اتر پڑا اور ان کی طرف استقبال کے لئے تیزی سے بڑھا (سیر العارفین صفحہ ۱۶۱) مزید حالات کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۃ الواصلین از مولوی رضی الدین بسمل۔ بار دوم مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۴۵؁۔ فٹ نوٹ صفحہ ۲۳ تا ۲۵۔

[2]۔ شیخ بدر الدین غزنوی کی سلطان بڑی عزت کرتا تھا ایک مرتبہ جب وہ بادشاہ سے ملنے کو تشریف لے گئے تو بادشاہ نے شاہی محل کے دروازہ پر آکر ان کا استقبال کیا اور معانقہ کرنے کے بعد انھیں محل کے اندر لے گیا (فوائد الفواد صفحہ ۸۸)

[3]۔ قاضی قطب الدین کاشانی کی بھی دربار میں بڑی قدر و منزلت تھی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فوائد الفواد (صفحہ ۲۳۶)

[4]۔ حضرت شیخ عثمان ہارونیؒ مرید و خلیفہ ہیں حضرت خواجہ حاجی شریف زندنیؒ کے قنوج کی مقامی

(باقی صفحہ ۲۴۷ پر)

کی سلطان بڑی عزت کرتا تھا[۱] جس طرح پایۂ تخت دہلی میں علماء و صلحاء کا اجتماع تھا اسی طرح بدایوں بھی جہاں التمتش ایک عرصہ تک عہدۂ گورنری پر فائز رہا تھا نہایت گرانقدر بزرگوں کا مسکن بن چکا تھا۔ حضرت خواجہ عثمان ہرونی کے مرید و خلیفہ اور سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے سگے نانا حضرت سید عرب بخاریؒ المتوفی ۷۱۸ھ مع حضرت سید احمدؒ صاحب (والد بزرگوار حضرت سلطان المشائخؒ) بدایوں میں فروکش تھے۔ اسی طرح قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے مرید و خلیفہ حضرت سلطان العارفینؒ (نام خواجہ بدرالدین لقب موئے تاب) اپنے جمالی و جلالی فیض کا پرتو ڈال رہے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے استاد شیخ حسام الدین عرف حاجی جمال ملتانیؒ (مرید و خلیفہ حضرت صدرالدین بن بہاء الدین زکریا ملتانیؒ) اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے استاد محترم سید علاء الدین اصولیؒ (مرید حضرت جلال الدین تبریزیؒ) بدایوں کے صاحب کشف اولیاء اللہ میں سے تھے۔ علماء میں خواجہ ضیاء الدین نخشبیؒ، شیخ شہاب الدین مہمرہؒ، مولانا رضی الدین صغانیؒ (صاحب مشارق الانوار) اور قاضی سعد الدین عثمانی وغیرہ نہایت بلند پایہ بزرگ تھے۔[۲]

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۶: یہ روایت پر اگر اعتبار کیا جائے تو ہندوستان میں خواجہ اجمیریؒ سے بہت پہلے آپ کے دادا پیر کا یہاں ہونا ثابت ہوتا ہے۔ قنوج میں ایک مزار شریف ہے جو حضرت شریف زندنیؒ کی طرف منسوب ہے۔ اس کے لوح مبارک پر یہ شعر کندہ ہے:

بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہ است ۔۔۔ سجدہ گاہِ ملک و روضۂ شاہنشاہ است

اس شعر کے نیچے لکھا ہوا ہے:

"مزار پاک حضرت خواجہ حاجی شریف زندنیؒ ۶۱۲ھ" ۔۔۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۱۔ اسلامک کلچر ص ۱۲۷، ص ۱۲۵ ماہ اپریل ۱۹۲۶ء بحوالہ تاریخ فرشتہ

۲۔ مآثر الکرام ص ۱، ص ۱۱ ۔۔۔ ۲۔ تذکرۃ الواصلین۔

٭ ان کا نام خواجہ سید حسن لقب شیخ شاہی روشن ضمیر و حسن تاب (۱۲۱۱ء) [illegible] آپ کے برادر خورد حضرت [illegible] صاحب۔

اُس نے اطراف و اکناف ہند میں بہت سی درسگاہیں تعمیر کرائیں جہاں دور دور سے طلباء آتے تھے اور وظائف حاصل کر کے تحصیل علم میں مشغول رہتے تھے۔ فیروز تغلق نے ایک صدی سے زیادہ زمانہ گذرنے کے بعد اپنی فتوحات فیروز شاہی میں دہلی کے ایک بڑے دارالعلوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مدرسہ سلطان شمس الدین التمش مسمار ہو چکا تھا میں نے دوبارہ اس کی تعمیر کرائی اور صندل کے دروازے لگوائے علاوہ اس کے ستون صحن، گنبد وغیرہ کو بھی از سر نو تعمیر کرایا۔"[۱]

بہر کیف سطور بالا پر نظر ڈالنے سے شمس الدین التمش کی ایک صحیح و روشن تصویر ہمارے ذہن میں آ سکتی ہے۔ اس کی پاکبازی و نیک نفسی میں کسی کو کلام کی گنجائش نہیں۔ مسلم سلاطین میں یہ شرف صرف اسی سلطان کو حاصل ہے کہ چشتی طبقہ کے اکابر و بزرگوں نے جو دنیوی سلاطین سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتے تھے اس کو اپنا دوست کہہ کر مخاطب کیا ہے۔[۲] ایسے سلطان کے زیر سایہ رہ کر ہندوستان اور ہندوستان والوں پر اللہ کی کیا کچھ رحمتیں نازل نہ ہوئی ہوں گی ان کا آج ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ حقیقتاً وہ ہندوستان کا ایک قابل فخر اور قابل تقلید سلطان ہے۔

التمش کی یادگاریں

سلطان مرحوم کی سب سے عمدہ و بہتر یادگار تو خود اُس کے ذاتی خصائل ہیں جو ملفوظات و تواریخ میں ایک عرصۂ دراز تک باقی رہیں گے۔ دنیوی اعتبار سے اُس نے آٹھ لڑکے اور ایک لڑکی اپنی یادگار چھوڑے ان کے علاوہ کچھ عمارتیں ہیں جو آج تک اُس کی یاد دلاتی ہیں اُس نے ۲۳۲-۱۲۳۱ء میں قطب الدین کے بنیاد کردہ دو منزلہ قطب مینار کو سات منزل تک مکمل کرایا اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے نام نامی پر اس کو قطب مینار کے نام سے موسوم کیا۔[۳]

عہ۱: فتوحات فیروز شاہی ص ۳۸۳ عہ۲: اسرار الاولیاء قلمی ص ۱۱۰ عہ۳: راورٹی ص ۲۲-۱۲۲

فٹ نوٹ، میڈیول انڈیا ص ۱۶۶ فٹ نوٹ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد

کے علاوہ مسجد قوۃ الاسلام میں تین دروازے اضافہ کئے۔ دہلی میں حوض شمسی[1] یا تالاب شمسی بھی اسی کی یادگار ہے۔ التمش اقطاع بدایوں کا جو اس عہد میں دہلی کا سب سے زیادہ وسیع صوبہ تھا ایک عرصہ تک گورنر رہا تھا اس کے عہد گورنری کی یادگار جامع مسجد شمسی[2] اور عیدگاہ شمسی کی صورت میں آج تک موجود ہے۔ اسی طرح قصبہ منڈاور (واقع ضلع بجنور) میں جہاں باغی راجپوتوں کی سرکوبی کے لئے اسے دو مہینہ تک قیام کرنا پڑا تھا ایک وسیع جامع مسجد تیار کرائی۔ اجمیر شہر میں "اڑھائی دن کا جھونپڑا" بھی التمش ہی کا بنا کردہ ہے۔ اس کی بعد کو توسیع ہوتی رہی۔ عہد حاضر میں جو عالیشان دروازہ شہر کے بازار کی طرف ہے۔ وہ ہز اکزالٹڈ ہائی نس محبوب علی خاں مرحوم نظام دکن کا بنوایا ہوا ہے۔

۱: سلطان ایک حوض بنوانا چاہتا تھا اس کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ ایک رات اسے نبی کریمؐ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ نے ایک جگہ کو متعین فرمایا صبح اٹھ کر یہ خواب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بیان کیا گیا چنانچہ خواجہ صاحب موصوف سلطان کو لیکر اس متعین جگہ پر پہونچے دیکھا کہ وہاں گھوڑے کے سم کا نشان ہے اور چشمہ جاری ہے۔ اسلئے اسی جگہ حوض شمسی کی بنا ڈالی گئی۔ (ملاحظہ ہو فوائد السالکین ص۱، جواہر فریدی ص۱۹۸، خزینۃ الاصفیاء ص۲۷۲ فرشتہ ص۶۹ نولکشور پریس)۔

چونکہ حوض شمسی متبرک خیال کیا جاتا تھا اسلئے بہت سے صوفیاء کرام نے اپنا مسکن بنالیا اور ایک مسجد بھی بنائی جو ابتک اولیا مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اسی بابرکت حوض کی مٹی کو حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے اپنے پیر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی قبر ساتے وقت استعمال کیا۔ اس حوض کے فیوض و برکات کا حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیاء اکثر تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ اور اگر فوائد الفواد کی اس روایت کو سامنے رکھا جائے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے سلطان التمش کو بعد وفات محض اس حوض کی تعمیر کی وجہ سے بخش دیا تو اس نیک کام کی اہمیت سمجھ میں آسکتی ہے (فوائد الفواد ص۱۱۹، اسلامک کلچر ص۱۲۸، اپریل ۱۹۲۷ء)

۲: اس مسجد کا بیرونی طول وعرض ۲۷۶ × ۲۱۴ فیٹ۔ اندرونی صحن ۱۸۰ انچ طولاً اور ۹۴ فیٹ عرضاً ہے۔ سطح زمین سے ۲۱ فیٹ اونچائی تک دیواریں کنکر اور پتھروں سے تعمیر کی گئیں ہیں اور اس کے اوپر کا (باقی صفحہ ۲۵۰ پر)

فصل سوم دور انتشار

خاندان غلاماں ۱۲۳۶ء تا ۱۲۴۶ء

(۴) سلطان رکن الدین فیروز شاہ ابن التمش ۲۹ شعبان ۶۳۳ھ / اپریل ۱۲۳۶ء تا ۱۸ ربیع الاول ۶۳۴ھ / نومبر ۱۲۳۶ء

سلطان شمس الدین التمش کی وفات کے بعد اُس کی ہدایت کے برخلاف سلطان رضیہ کے بجائے امراء نے رکن الدین کو اپنا بادشاہ بنایا۔ رکن الدین بالکل لاابالی مزاج کا امیرزادہ

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۹۔ تمام عمارت نہایت پختہ چوڑی اینٹوں سے بنایا گیا ہے۔ التمش کی تعمیر کردہ جامع شمسی کی وقتاً فوقتاً ترمیم ہوتی رہی چنانچہ ۷۲۶ھ میں جبکہ دہلی میں سلطان محمد جونا خاں حکمراں تھا حسین بن حسین کوتوال شہر بدایوں نے شمالی جانب مسجد کی عمارت بنوائی [illegible] میں نواب قطب الدین چشتی نے بعہد اکبر بادشاہ مسجد کا درمیانی گنبد اور اُس کے سامنے حوض تعمیر کرایا اسی طرح جہانگیر کے عہد حکومت میں مسجد کی تعمیر ومرمت ہوئی۔ آخر میں ۱۸۷۰ء میں کلکٹر ضلع مسٹر لیپ کے ایما و مشورہ سے مسلمانان شہر بدایوں نے چندہ کرکے مسجد کی مرمت کرائی یہ کام مولوی طفیل احمد صاحب وکیل حنفی بدایوں کی [illegible] میں پایۂ تکمیل تک پہونچا اس سے پیشتر ۱۸۵۶ء میں مولوی صاحب موصوف [illegible] بزرگوار مولوی رضی اللہ صاحب مرحوم مسجد کے گنبد کلاں کی استرکاری کرا چکے تھے۔ گنبد کے اندر و باہر نیز محراب پر جو آیات قرآنی مرقوم ہیں وہ حافظ نیاز احمد صاحب مرقع قلم کی محنت کا نتیجہ ہیں۔

یہ مسجد ٹھیک قبلہ رو واقع ہے اس لئے یہ روایت جس کو بعض خود غرض لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ یہاں پر کوئی مندر تھا سراسر غلط ہے کیونکہ [illegible] نہیں ہوا کرتا مسجد شمسی کا سنہ تعمیر ۱۲۲۳ء مطابق ۶۲۰ھ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر کا سلسلہ التمش کی عہد گورنری (۱۱۹۹ء تا ۱۲۰۴ء) سے شروع ہو کر ۶۲۰ھ تک جاری رہا۔ [illegible] عیدگاہ شمسی جو شہر کے قریب میں ایک میل کے

(باقی صفحہ ۲۵۱ پر)

رکن الدین کے لاہور کی طرف روانہ ہونے کے بعد شاہ ترخان نے رضیہ کو قتل کرنے کی تیاری کی۔ دہلی کی رعایا رضیہ کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ رکن الدین کی فوج نے بادشاہ کو قید کرکے دہلی آکر رضیہ کا ساتھ دیا اس طرح بادشاہ اور اُس کی ماں دونوں کو محل میں قید کر دیا گیا۔ رکن الدین کی مدت حکومت صرف ۶ ماہ ۲۷ یوم ہے[۱]۔

(۵) رضیۃ الدین یا رضیہ بیگم نومبر ۱۲۳۶ء تا ۱۳ اپریل ۱۲۴۰ء

سلطان رضیہ کا عہد

ملک داری سے خوب واقف اور تعلیم یافتہ عورت تھی۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوتی اور صف قتال میں شمشیر زنی کرتی تھی۔ دربار میں تخت عدالت پر جلوس کرتی اور تمام فرائض شاہی کو عمدگی کے ساتھ انجام دیتی تھی۔ التمش نے اس کی شجاعت و فراست کی بنا پر اسے اپنا ولی عہد بنایا تھا اور اپنے بعد اس کے تخت نشین ہونے کے بارے میں وصیت کی تھی[۲] جس کو امراء نے نہیں مانا کیونکہ وہ ایک عورت کو اپنے اوپر حکمراں دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے لیکن اب واقعات کی رفتار سے مجبور ہو کر انھوں نے رضیہ کی بادشاہی پر اتفاق کر لیا پھر بھی پورے طور پر مطمئن نہیں ہوئے اور اس کے خلاف شورش کی آگ کہیں نہ کہیں ہمیشہ بھڑکتی رہی۔

باغیوں کی سرکوبی

رضیہ جب تخت حکومت پر بیٹھی ہے تو ملتان، ہانسی، لاہور اور بدایوں کے گورنر باغی ہو کر دہلی کی طرف بڑھے

---

[۱]۔ طبقات ناصری ص ۶۳۶ از راورٹی فٹ نوٹ ۲

[۲]۔ گوالیار کی فتح سے فارغ ہونے کے بعد التمش نے دہلی آکر تاج الملک محمود کو (جو مشرف ممالک کے عہدہ پر سرفراز تھا) ایک فرمان لکھنے کا حکم دیا جس کی رو سے رضیہ کو اپنا ولی عہد اور جانشین مقرر کیا (طبقات ناصری ص ۶۳۸ از راورٹی)۔

تھے۔ رضیہ نے نہایت تدبر و استقلال سے کام لیکر سب کا کامیاب مقابلہ کیا۔ نصرالدین جو عزالدین کے باغی ہو جانے پر بداؤں کا گورنر بنایا گیا تھا۔ رضیہ کی مدد کے لئے بداؤں سے چلا لیکن [illegible] عزالدین اور محمد جنیدی (وزیر رکن الدین) کے مقابلہ پر مارا گیا۔ اس عرصہ میں رضیہ نے حالات پر قابو پالیا تھا اُس کی کامیابی نے محمد جنیدی کی جمعیت پسپائی پھیر دیا اور وہ شکست کھا کر سرمور کی پہاڑیوں میں بھاگ گیا اور وہیں مر گیا۔ رضیہ نے خواجہ مہذب الدین کو جو جنیدی کا ماتحت رہ چکا تھا اپنا وزیر بنایا۔

۱۹ مارچ [illegible] کو [illegible] نے گوالیار کے باغی گورنر [illegible] الدین جنیدی اور اُس کے معاون و مددگار منہاج الدین کو بس میں کیا۔ پھر [illegible] کے آخر میں پنجاب کے گورنر ایاز کو ٹھیک کیا۔ پنجاب سے ۱۵ مارچ [illegible] کو دہلی واپس آئی جہاں ۳ اپریل [illegible] کو اُسے ترکی اُمراء کا مقابلہ کرنا پڑا جو یاقوت حبشی کے عروج کی وجہ سے سلطانہ سے ناراض تھے۔ اُس نے ایک حبشی غلام جمال الدین یاقوت کو اُس کی قابلیت کے مطابق امیر الامراء کا عہدہ عطا فرمایا تھا لیکن ترک و افغان اُمراء جو اُس کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے اس کی امیر الامرائی سے برافروختہ ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو گئے چنانچہ جب وہ [illegible]

عہ ۱۔ میجر [illegible] جی۔ [illegible] جنھوں نے طبقات ناصری پر نہایت قابل قدر فٹ نوٹ درج کئے ہیں [illegible] [illegible] فرشتہ [illegible] جمال الدین یاقوت کو امیر الامراء کے عہدہ پر [illegible] حالانکہ [illegible] جمال الدین کا اصل عہدہ "امیر آخور" تھا [illegible] غالباً [illegible] وہ بادشاہ [illegible] گھوڑے پر سوار [illegible] شخص کے [illegible] جمال الدین [illegible] اُمراء کے [illegible] کام کے [illegible] جمال الدین [illegible] ترکی اُمراء [illegible] جمال الدین دونوں کے [illegible] تھے۔

عہ ۲۔ جمال الدین یاقوت پر رضیہ کو بڑا اعتماد تھا اس کو بعض مورخین نے افسانہ کی شکل دے کر

(باقی صفحہ ۲۵۵ پر)

کے حاکم ملک التونیہ کی بغاوت فرو کرنے کے لئے روانہ ہوئی تو راستہ میں اُمرا لشکر نے
جمال الدین کو قتل کر دیا اور رضیہ کو گرفتار کر کے بٹھنڈہ بھیج دیا۔

رضیہ کی شہادت لشکریوں نے دہلی واپس آ کر معز الدین بہرام شاہ بن التتمش کو اپنا
بادشاہ بنالیا۔ بہرام شاہ کا وزیر اختیار الدین ایتگین تھا۔ التونیہ
حکومت میں حسب منشا [illegible] نہ ملنے کی وجہ سے وزیر سے ناراض ہو گیا۔ اُس نے رضیہ
کو قید سے رہا کر کے اُس کے ساتھ نکاح کر لیا اور اس بہانہ سے تخت دہلی کو دوبارہ حاصل

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵۳ [illegible] رضیہ کو بدنام کرنے کی ناکام کوشش کی ہے ورنہ حقیقت صرف اتنی ہے
کہ ترکی اُمرا کی ایک بڑی جماعت [illegible] میں ملک عز الدین کبیر خاں، ملک عز الدین محمد سالاری،
ملک التونیہ وغیرہ شروع ہی سے رضیہ کے مخالف تھے ان میں سے ہر امیر اپنے کو زائد سے زائد مراعات
کا مستحق سمجھتا تھا اس لئے وہ ایک اجنبی امیر جمال الدین یاقوت حبشی کی اس قربت کو جو اس کو
رضیہ سے تھی کیونکر برداشت کر سکتے تھے رضیہ سے مخالفت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ مردوں
کی طرح کھلا خزانہ ہاتھی پر سوار ہوتی تھی اور دربار میں آ کر اُمور سلطنت کو انجام دیتی تھی۔ اس
بے پردگی کو ترکی امیر برداشت نہیں کر سکتے تھے اس کے علاوہ ایک عورت کی ماتحتی ترکی سرشت
کے مخالف تھی اگر رضیہ و یاقوت کے درمیان کوئی دوسری بات ہوتی تو اس کو صاحب طبقات ناصری
ضرور تحریر کرتا کیونکہ اس نے رضیہ کے تمام حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس کے علاوہ
وہ رضیہ کا مخالف بھی تھا [illegible] اس معاملہ میں خاموش ہے (ملاحظہ ہو طبقات ناصری ص ۱۸۹)
اس کے علاوہ حضرت امیر خسرو رضیہ کی پاکبازی کی شہادت دیتے ہیں ؎

[illegible] | سر بر آراستہ از راہ سر یرت
[illegible] | کے بہ حرف او نہ نہاد انگشت

ملاحظہ ہو مثنوی دولرانی خضر خانی قلمی در کتب خانہ حبیب گنج علی گڑھ۔ ڈاکٹر حبیب اللہ نے اپنی تالیف میں یہ
وجہ بیان کی ہے کہ رضیہ اُمرا کی طاقت کو توڑنے کی کوشش کر رہی تھی اسلئے اُمرا اس کے خلاف ہو گئے۔
(Vide Foundation of the Muslim Rule in India.
P. 113).

کرنے کے لئے رضیہ کو لیکر روانہ ہوگیا۔ اس اثناء میں بادشاہ اختیار الدین کو قتل کرا چکا تھا لیکن التونیہ کا مقصد چونکہ کچھ اور تھا اس لئے مجبوراً بادشاہ نے مقابلہ پر فوج بھیجی۔ ۲۵ اکتوبر ۱۲۴۰ء کو کیتھل کے مقام پر لڑائی ہوئی۔ التونیہ اور رضیہ کو شکست ہوئی۔ دونوں بھاگے لیکن ہندوؤں نے گرفتار کرکے قتل کردیا۔ مؤلف طبقات ناصری کے الفاظ یہ ہیں:-

"رضیہ و التونیہ بدست ہندوان گرفتار شدند و ہر دو شہید گشتند و ہزیمت ایشاں ۲۴ ربیع الاول ۶۳۸ھ بود و شہادت سلطان رضیہ روز سہ شنبہ ۲۵ ربیع الآخر ۶۳۸ھ بود"

اس کے بموجب لڑائی کے ایک ماہ بعد سلطان کی شہادت وقوع پذیر ہوئی۔ شہادت کے متعلق ابن بطوطہ کی ایک روایت یہ ہے کہ رضیہ راستہ میں [illegible] کسان نے اس کی پوشاک تلے زری اور موتی ٹکی انگیا دیکھ لی۔ جانا کہ عورت ہے مار کر کپڑے اتار لئے اور لاش زمین میں گاڑ دی۔ پتہ چلنے پر اس کی لاش دلّی سے چند میل کے فاصلہ پر جمنا کے کنارے دفن کی گئی۔ وہاں زائروں کا ہجوم رہتا تھا۔

اسماعیلیوں کا دہلی میں فساد

پچھلے صفحات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ۶۲۵ھ میں شمس الدین التمش نے سندھ کا پورا علاقہ ناصر الدین قباچہ سے چھین لیا تھا اور اس پر اپنے حاکم مقرر کر دیئے تھے۔ ناصر الدین سے پہلے یہاں کے مالک سومری تھے [illegible] اسماعیلی تھے [illegible] محمد غوری نے ملتان و سندھ سے بیدخل کر دیا تھا۔ انہوں نے [illegible] آلت [illegible] گیا اور سمندر تک غیروں کا قبضہ ہو گیا تو مجبوراً [illegible] آئے اور یہاں ایک نیا مرکز قائم کرکے اور محمد تور نامی سو[illegible] کو اپنا [illegible]

۱؎ اسمعیلیوں کو ایک مرکز پر رہنا بہت محبوب ہے۔ [illegible] جب ایک مرکز تباہ ہوتا ہے تو فوراً دوسرا مرکز تیار کر لیتے ہیں جیسا کہ مصر، یمن، گجرات، خراسان میں بارہا ہوا۔ سندھ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ ان کا نیا مرکز محمد طور میں تھا جس کو محمد تور سومرہ نے آباد کیا۔ اس کو سندھی زبان میں مہاتم تور کہتے (باقی مضمون صفحہ ۲۵۶ پر)

اِس سنٹے مرکز سے انھوں نے نورالدین ترک نامی ایک داعی کو دہلی بھیج کر انقلاب پیدا کرنے کی آخری کوشش کی جس طرح انھوں نے کبھی ملتان ومنصورہ پر سازش کے ذریعہ قبضہ کرکے اپنی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسی طرح انھوں نے اب دہلی میں اپنی قدیم روش کا اعادہ کرنا چاہا۔ اسمٰعیلیوں نے یہ سمجھ کر کہ دہلی کے تخت پر ایک عورت قابض ہے اور ملک میں خانہ جنگی برپا ہے غالباً انقلاب آسانی سے ہوجائے گا۔ چنانچہ نورالدین نے ایک جماعت فراہم کرکے ۶ رجب یوم جمعہ سنہ ٦٣٤ھ مطابق ۵ مارچ سنہ ١٢٣٧ء کو ایک ہزار کی تعداد میں مسلح ہوکر جامع مسجد پر حملہ کیا جہاں شہر کے سب چیدہ چیدہ مسلمان نماز جمعہ کے واسطے جمع تھے۔ اس وقت مسلمان خاموشی کے ساتھ خطبہ سن رہے تھے کہ اچانک ان لوگوں نے اندر گھس کر قتل عام شروع کردیا۔ بہت سے مسلمان شہید ہوگئے۔ شہر والوں نے جب شور وغوغا سنا تو کئی امرائے شہر مثلاً امیر امام ناصر شاعر اور نصیر الدین ایتم وغیرہ مسلح ہوکر اپنے سپاہیوں کے ساتھ موقع پر پہونچ گئے۔ اب ایک طرف سے مسلح سپاہیوں نے اور دوسری طرف سے عام مسلمانوں نے ان کی پتھروں اور اینٹوں سے تواضع شروع کردی یہاں تک کہ ان کا ایک ایک شخص اس فتنہ میں مارا گیا اور امن قائم ہوگیا۔ نورالدین ترک کے ہمراہی زیادہ تر سندھی اور گجراتی تھے کچھ گنگا اور جمنا کے دوآبہ کے باشندے بھی تھے لیکن یہ سب اپنے مقصد میں ناکامیاب رہے۔[۱]

(۹) سلطان معزالدین بہرام شاہ بن التمش

۱۳ اکتوبر سنہ ۱۲۴۰ء تا ۱۰ مئی سنہ ۱۲۴۲ء

سلطان بہرام شاہ نے اپنے مراسم تخت نشینی ۲۸ رمضان سنہ ٦٣٧ھ مطابق ۲۳ مارچ [illegible]

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵۵ ہے ہیں، اس کی جگہ پر آج کل "نگر پارکر" نامی گاؤں آباد ہے۔ (مولف)

۱۔ طبقات ناصری صفحہ ۱۸۹ تاریخ سندھ جلد ۳ از سید ابوظفر صاحب۔ فرشتہ نے اس شورش کا ذکر التمش کے دور حکومت میں کیا ہے جو صاحب طبقات ناصری کی روایت کے مقابل صحیح نہیں مانا جاسکتا۔ (مولف)

کو ادا کئے۔ عہد رکن الدین و رضیہ میں جو اختلافات اُمرائے سلطنت کے درمیان پیدا
ہو گئے تھے انھیں بہرام شاہ بھی دور نہ کر سکا۔ اُمرا کی آپس کی نا اتفاقی سے حکومت کو
بڑے نقصانات اُٹھانا پڑے کیونکہ اس سے مغلوں کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے
کی جرأت ہوئی اور سلاطین دہلی کی فاتحانہ رفتار کم و بیش پچاس سال کے لئے مدھم پڑ گئی۔
تخت نشینی کے بعد ہی اُمرائے سلطنت میں سازشیں شروع ہو گئیں۔ سب سے پہلے
بہرام شاہ کے وزیر سنقار نے اس کو قتل کرنے کی سازش کی لیکن سلطان کو بروقت
اطلاع ہو گئی۔ سنقار گرفتار کر لیا گیا پھر اُمراء چہلگان کی سفارش سے اُس کو بدایوں
کا گورنر بنا کر دہلی سے باہر بھیج دیا۔ وہ وہاں سے بادشاہ کی اجازت کے بغیر دہلی کی
طرف آیا اس پر بادشاہ نے اُس کو قتل کرا دیا۔ یہ بات اُمراء چہلگان کو بُری معلوم
ہوئی۔

اُمراء چہلگان (شمسی) کی بددلی کا ایک سبب قاضی شمس الدین کا قتل ہے۔ یہ ایک
نامور فقیہہ تھا جس کی لوگ بڑی عزت کرتے تھے۔ بہرام شاہ نے ایوب نامی ایک درویش
کے کہنے سے اس کو قتل کرا دیا جس سے شہر میں سخت برہمی پیدا ہو گئی۔ اِدھر بادشاہ کے
نئے وزیر خواجہ مہذب الدین نے جو بادشاہ کا دشمن ہو گیا تھا موقع سے فائدہ اُٹھایا اور
اُن سرداران لشکر کو جو مغلوں کے دفعیہ کے لئے لاہور کی طرف بڑھ رہے تھے بدگمان
کر دیا۔ یہ بدگمانی اس قدر بڑھی کہ سرداران لشکر نے دہلی واپس آ کر شاہی قلعہ کا محاصرہ
کر لیا۔ بادشاہ نے قاضی منہاج الدین مصنف طبقات ناصری کو جس کو اس زمانہ
ہی میں دہلی کا قاضی القضاۃ بنایا تھا باغیوں کو سمجھانے کے لئے بھیجا مگر وہ باز نہ آئے
بالآخر ۳½ ماہ کے محاصرہ کے بعد بہرام شاہ کو گرفتار کر لیا گیا اور پانچ دن کے بعد (ذی
قعدہ ۶۳۹ھ) ۱۲۴۲ء کو قتل کر دیا۔

مغلوں کا حملہ اور لاہور کی تباہی ۱۲۴۱ء | چنگیز خاں (المتوفی رمضان ۶۲۴ھ / ۱۲۲۷ء)

کے زمانہ ہی سے مغلوں کا ہندوستان پر دانت تھا انھیں لڑائی چھیڑنے کے لئے بہت سے حیلے مل سکتے تھے کیونکہ شمس الدین کے زمانہ سے سلطنت دہلی خراسان وسیستان اور مکران وغزنی کے اُن امیرزادوں کا مامن بن گئی تھی جو کسی طرح چنگیز خانی سیلاب سے بچ کر ہندوستان چلے آئے تھے۔ اس کے علاوہ چونکہ افغانستان پر اُن کا پورا تسلط تھا اس لئے سندھ و پنجاب ہر وقت اُن کی زد میں تھے اِدھر اُمرائے ہند کی نااتفاقی نے مغلوں کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی جرأت دلائی۔ بہرکیف ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء میں غور و ہرات کے مغل سرداروں نے ایک بڑی فوج مرتّب کی اور طائر نامی سپہ سالار کے ماتحت دریائے سندھ کو عبور کر کے ملتان کی طرف پیش قدمی کی۔ ملتان سرحد کا سب سے بڑا جنگی مرکز اور آباد شہر تھا۔ یہاں کا عامل کبیر خاں ایاز تھا جو حکومت دہلی سے ناراض تھا اور اپنی خودمختاری کا اعلان کر چکا تھا۔ مغلوں نے اُس کی جنگی تیاریوں کا حال سن کر اپنا رُخ لاہور کی طرف پھیر دیا اس طرح سلطنت ہند سے مغلوں کی پہلی لڑائی جہلم کے بجائے راوی کے کناروں پر واقع ہوئی۔

لاہور اُن دنوں نہایت بارونق تجارتی شہر تھا لیکن ملتان و سندھ کے الحاق کے بعد اس کی جنگی اہمیت کم ہو گئی تھی اس لئے مغلوں کے اِس اچانک حملے کے وقت قلعہ میں جنگی اسلحہ اور ساز و سامان اِس قدر کافی نہ تھا کہ حملہ آوروں کا جم کر مقابلہ کیا جا سکے۔ اِس کے علاوہ سب سے بڑی خرابی یہ ہوئی کہ شہر کے بہت سے ذی اثر باشندوں نے مدافعت میں حصّہ لینے سے انکار کر دیا[۱]۔ یہ رنگ دیکھ کر چند روز ہی کی لڑائی میں لاہو

[۱]: ۔ انکار کی وجہ یہ تھی کہ یہاں کے سوداگروں کو وسط ایشیا کے ممالک سے تجارت کرنے کے لئے مغلوں سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ اِس سلسلے میں انھیں مغل حکام سے وہ تحریری سندیں مل گئیں تھیں جن میں حفظِ جان و مال کا وعدہ درج تھا۔ اس قسم کی تحریریں ترکی اصطلاح میں "پائزہ" کہلاتی تھیں۔ (طبقات ناصری ص۶۵۵ از راورٹی)

کے عامل ملک قراقش کو شہر کی مدافعت سے نا اُمیدی ہو گئی۔ دہلی ایک طرف بٹھنڈہ یا سامانہ کی جنگی چھاونیوں سے بھی کوئی فوجی مدد وقت پر نہ پہونچ سکی اور ادھر مغلوں کی منجنیقوں[1] نے پیہم سنگ باری کر کے قلعہ کی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے اور وہ ان میں داخل ہو کر شہر کے اندر تک آنے لگے۔ آخر ایک رات عامل لاہور یعنی ملک قراقش اپنے ملازمین کے ساتھ شہر سے باہر آیا اور دشمنوں کا حصار توڑ کر نہایت بہادری کے ساتھ لڑتا بھڑتا دہلی کی طرف چلا گیا۔ اُس کی جرأت یقیناً قابل تعریف تھی لیکن ادھر تو اس واقعے نے محصورین کو شکستہ دل کر دیا اور اُدھر [illegible] کے حملوں میں زیادہ شدت آ گئی۔ اس نازک موقع پر اسلامی فوج کے دو گروہوں نے مدافعت کا بیڑہ اُٹھایا اور کوتوال شہر (آق سنقر) اور امیر آخور (دین دار [illegible]) کی ماتحتی میں اُس وقت تک برابر لڑتے رہے جب تک کہ ان میں کا ایک متنفس زندہ رہا۔ اس کے بعد مغلوں نے شہر میں گھس کر نہ سوداگروں کے پائنزوں کی پروا کی اور نہ عورتوں بچوں کے آہ و زاری کی بلکہ قتل عام کر دیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

لاہور کی مصیبت کی اطلاع جب دہلی پہونچی تو تھوڑی دیر کے لئے اُمرائے دہلی کے اختلافات بھول گئے۔ قصر ابیض میں ایک عام جلسہ ہوا جس میں قاضی منہاج[2] الدین [illegible]

عہ۱۔ تیر اندازی کی طرح اس فن میں بھی مغلوں کو کمال حاصل تھا۔ قلعہ شکن توپ کی ایجاد سے پہلے منجنیق کی اہمیت کو وہ بخوبی سمجھتے تھے۔ چنگیز خاں کے لشکر میں دس ہزار سپاہی صرف منجنیق چلانے پر مقرر تھے (مؤلف)

عہ۲۔ ہندوستان آنے سے پہلے خراسان و ہرات کے علاقوں میں چنگیزی طوفان کی تباہ کاریاں منہاج الدین سراج نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں بلکہ بعض لڑائیوں میں وہ شریک بھی رہ چکا تھا لہٰذا اس جلسہ میں تقریر کرنے کے لئے اُسی کو منتخب کیا گیا۔ (مؤلف)

طبقات ناصری نے نہایت معرکہ آرا تقریر کی۔ جوش کے عالم میں لوگوں نے از سر نو بادشاہ کی
اطاعت کا حلف اُٹھایا اور مغلوں کے مقابلہ کے لئے بہت جلد ایک بڑا لشکر فراہم ہو گیا۔
لیکن امدادی افواج ابھی دریائے بیاس کے کنارے قصبۂ سلطان پور تک پہونچ پائی تھیں
کہ مغلوں نے ۲۲ر دسمبر ۱۲۴۱ء کو لاہور تباہ و برباد کر کے غزنی کا راستہ لیا۔ ان میں اب اتنا دم
خم باقی نہیں رہا تھا کہ مسلمانوں کی تازہ دم امدادی افواج کا مقابلہ کرتے کیونکہ طبقات ناصری[1]
کی روایت کے بموجب مجاہدین کی وجہ سے اُن کا کوئی سپاہی ایسا نہ تھا جو بالکل زخمی نہ ہوا
ہو۔ ان کے تیس چالیس ہزار سپاہی مارے گئے اور اُن کا سردار بھی کام آ چکا تھا۔
مغل گو لاہور سے آگے نہ بڑھ سکے لیکن اسی ایک حملے نے تمام شمالی ہند کو چونکا دیا۔
سلاطین دہلی کے منصوبۂ کشور کشائی پر اتنا اثر پڑا کہ آئندہ نصف صدی تک اُنھیں اپنی
حدود حکومت کو جنوب میں نربدا سے آگے بڑھانے کی جرأت یا فرصت نہ ہوئی اور اس طرح
تمام برّ اعظم ہندوستان کا ایک مرکزی حکومت کے ماتحت سیاسی اتحاد بہت دنوں کے
لئے ملتوی ہو گیا۔ تسخیر لاہور کا ایک اور اہم نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کو پنجاب کی ملکیت کا دعویٰ
پیدا ہو گیا اور وہ بار بار اِس ملک پر حملے کرتے رہے جن کا ذکر اپنی جگہ پر کیا جائے گا۔
امیر تیمور کے حملے نے اس حق کی تجدید و توثیق کی اور اسی کو بابر نے اپنے حملہ کا حیلہ بنایا
اور آخر کار ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ گویا ساتویں صدی ہجری
میں طائر مغل کو جو آرزو لاہور لائی تھی وہ دسویں صدی ہجری میں پوری ہو گئی۔

(۷) سلطان علاء الدین مسعود بن رکن الدین فیروز شاہ ۱۰ مئی ۱۲۴۲ء تا ۱۰ جون ۱۲۴۶ء	بہرام شاہ کی معزولی میں اعز الدین بلبن

جو تاریخ میں کشلو خاں کے نام سے مشہور ہے پیش پیش تھا۔ پہلے اسی کی بادشاہی کا اعلان
ہو گیا تھا لیکن باقی اُمرا نے شمس الدین کے مقبرہ میں جمع ہو کر فیصلہ کیا کہ جہاں تک ممکن

[1] طبقات ناصری ص ۳۹۳، ص ۳۹۴

ہو گیا جہاں وہ بحیثیت گورنر ۹ مارچ ۱۲۴۷ء کو انتقال کر گیا۔

(۴) نومبر ۱۲۴۵ء میں مغلوں نے منکوخاں کی سرکردگی میں ملتان پر حملہ کیا۔ مغلوں کا ہندوستان پر شمال کی طرف سے یہ دوسرا حملہ تھا اس مرتبہ وہ سیستان سے آئے اور افغانستان کے جنوب سے نکل کر سیدھے سندھ میں داخل ہو گئے تھے۔ کبیر خاں ایاز کی وفات (۶۳۹ھ / ۱۲۴۱ء) کے بعد یہاں کا حاکم حسن کرلغ[1] تھا۔ مغلوں نے ملتان سے حسن کرلغ کو نکال کر اُچھ کا محاصرہ کیا۔ اس مرتبہ دہلی کا بادشاہ مقابلہ کے لئے تیار تھا کیونکہ اس نے تخت نشین ہو کر فوج کی از سر نو تنظیم کی تھی اور اس کے حکم سے نئے حاجب غیاث الدین بلبن نے جس کو الغ خاں بھی کہتے ہیں پہلی مرتبہ وہ لشکر جرار تیار کیا تھا جس کی مستعدی و قواعد دانی کچھ عرصہ بعد دور دور کے ملکوں میں مشہور ہو گئی۔ چنانچہ دہلی کی فوج جب اُچھ کے قریب پہونچی اور اس نے چاہا کہ شمال کی طرف سے بڑھ کر مغلوں کو گھیرے میں لے لے تو مغل سپہ سالار منکوخاں جو چنگیز خاں کے خاص رفیقوں میں سے تھا اس چال کو سمجھ گیا اور بروقت اپنی فوج کو مرعوب ہو کر ہٹا لے گیا۔ دہلی کی امدادی فوجوں کے قریب پہونچنے سے پہلے شہر اوچھ کی مدافعت محمد صالح کوتوال نے بڑی جوانمردی سے کی اور کئی ہفتے مغلوں کو لڑائی میں الجھائے رکھا۔

مغلوں کے مقابلہ میں بادشاہ کو یہ کامیابی راس نہیں آئی کیونکہ صعوبات سفر کی تلافی اس نے عیش و عشرت کے ایسے مشاغل سے کرنا چاہی جو اکثر انسان کی عقل و اخلاق کو بگاڑ دیتے ہیں۔ عیاش بادشاہ عام طور پر بد مزاج، شکی اور ظالم ہو جایا کرتے ہیں مسعود نے بھی بعض فرومایہ مصاحبوں کی کشش سے احمقانہ حرکات شروع کیں۔

---

[1] کرلغ ترک افغانستان پر قابض تھے یہاں سے جب انھیں مغلوں نے خارج کیا تو سندھ میں آئے اور موقع ملتے ہی ملتان کے حاکم بن بیٹھے۔ (مولف)

[2] اُوچھ کے گورنر تاج الدین ابوبکر بن ملک کبیر خاں ایاز کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی

(باقی صفحہ ۲۶۳ پر)

اُمراء کو بلاوجہ گرفتار یا قتل کرنا اُس کی عادت میں داخل ہوگیا اس کے علاوہ بیہودہ مشاغل اور شکار کی طرف اس درجہ میلان ہوا کہ ملکی کاروبار میں ابتری اور سلطنت میں خرابی پیدا ہونے لگی یہاں تک کہ امیروں نے بالاتفاق اُسے معزول و محبوس کرکے خاندان شمسی کے ایک اور شہزادے ناصر الدین محمود کو بادشاہی کے لئے منتخب کرلیا۔ مسعود کی مدت حکومت ۴ سال ایک ماہ ہے۔ ○

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۲ ۔ جگہ اُس کے باپ کا ایک غلام خواجہ مخلص الدین وہاں کا حاکم تھا۔ (طبقات ناصری ص ۱۲۸ از راورٹی) چونکہ غالباً اپنے مستقر پر موجود نہ تھا اس لئے مدافعت کے فرائض کوتوال شہر کو انجام دینا پڑے۔ (مؤلف)

باب پنجم۔ استحکام سلطنت

فصل اوّل (۸) سلطان ناصر الدین محمود بن التتمش

۱۰ جون ۱۲۴۶ء تا ۱۸ فروری ۱۲۶۶ء

تخت نشینی سلطان مسعود نے تخت نشین ہوکر پہلا کام یہ کیا تھا کہ اپنے دونوں چچاؤں کو قید خانہ سے نکال کر جلال الدین کو قنوج کا اور ناصر الدین کو بہرائچ کا حاکم بنا دیا تھا۔ ناصر الدین محمود کو جس وقت تخت حکومت پیش کیا گیا تو وہ بہرائچ کا حاکم تھا۔ ناصر الدین محمود طبعاً نہایت مرنجان ومرنج اور متقی وپرہیزگار بادشاہ تھا۔ اس کی شرافت وفیاضی اور عدل ورعایا پروری میں کسی کو کلام نہیں۔ اس کے ایثار وکسر نفسی نے ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا اس کی ہر دلعزیزی کی بدولت اس کی تخت نشینی کی رسم بڑے تزک واحتشام کے ساتھ ۲۳ محرم ۶۴۴ھ کو دہلی میں منائی گئی۔ سلطان کی خدمت میں منہاج سراج نے ۲۸ اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ پیش کیا جس کا پہلا شعر یہ ہے۔ ؎

آں شہنشاہے کہ حاتم بذل ورستم کوشش ہست ۔۔۔ ناصر دنیا ودیں محمود بن التتمش است [1]

خوش قسمتی سے اس کو وزیر نہایت ہوشمند، مدبر اور یکتائے روزگار ملا اس لئے اس کے عہد حکومت کی تاریخ محض اس کے وزیر الغ خاں (غیاث الدین بلبن) کے کارناموں کی سرگذشت ہے اور اسی لئے الغ خاں کی وفاداری اور اپنی ماتحتی پر قناعت زیادہ ستائش کی مستحق ہے۔ بلبن کا طرز عمل خواہ مصلحت اندیشی پر مبنی ہو یا فرض شناسی پر

۱: - پورے قصیدہ کے لئے ملاحظہ ہو طبقات ناصری صہ ۲۰۲ تا صہ ۲۱۵۔

اس میں کلام نہیں کہ اس سے بلبن کی نیکنامی میں چار چاند لگ گئے۔ وہ رشتے میں ناصرالدین کا خسر تھا۔

حکومت کی مشکلات

اُس کے سامنے اس وقت دو مرحلے درپیش تھے ایک تو ملک کو مغلوں کے حملوں سے بچانا اور دوسرے اندرونِ ملک امن و امان قائم رکھنا۔ ملک کے اندرونی امن کو تباہ کرنے والے دراصل دو گروہ تھے ایک اُمرا رِ چہلگان کی جماعت دوسرے شورش پسند ہندو رؤسا و اُمرا۔ اس لئے بادشاہ اور اُس کے وزیر کی مشکلات کو سمجھنے کے لئے ان چالیس غلاموں اور ہندو سرداروں کی حیثیت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئیے۔ اور وہ یوں ہے کہ محمد غوری اور اُس کے جانشینوں نے ملک پر فوجی قبضہ تو کر لیا تھا لیکن اُن کے پاس اتنے تربیت یافتہ افسر اور سپاہی نہ تھے کہ وہ مفتوحہ علاقوں کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیتے لہٰذا انھوں نے ملک کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے اُن قلعوں اور گڑھیوں پر جہاں سے پورے صوبہ کی نگرانی ہو سکتی تھی خاص اپنے معتبر آدمی متعین کر دئیے۔ ان افسروں کے ساتھ ایک مستقل فوج رہتی تھی ان کا کام مال گذاری کا وصول کرنا تھا۔ ہندوؤں کا پُرانا دیہاتی اور پنچائتی نظام بدستور باقی رکھا گیا اسی طرح ہندو رئیسوں اور راجاؤں کی مملکت کا نظم و نسق انھیں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا۔ اس طرح رعایا اور بادشاہ کے درمیان مسلمان افسروں اور ہندو اُمراء کی جماعت حائل تھی۔

التتمش کے چالیس خرید کردہ غلاموں نے ایک جماعت "خوانین شمسی" کے نام سے بنالی تھی جن کو اُمراءِ چہلگان بھی کہتے ہیں۔ بلبن بھی انھیں میں سے ایک تھا ان کی سازشوں کا حال پچھلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے۔ انھیں بلبن کی ترقی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی ان کی بغاوتوں اور ریشہ دوانیوں سے بہت شورش پھیل گئی۔

ہندو رؤسا نے بھی بدنظمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود مختار بننے کی کوششیں کیں۔ ان سب کو گردوپیش کے حالات سے بھی مدد ملی۔ اس زمانہ میں جنگلات کثرت سے تھے جن میں ہو کر مختلف صوبوں کو راستے جاتے تھے لہذا بادشاہ سے سرکشی کر بیٹھنا اور راستہ میں شاہی فوجوں کو روک لینا نہایت آسان تھا۔ یہ آسانی اسلئے اور بھی تھی کہ جن ہتھیاروں سے شاہی فوجیں مسلح ہوتی تھیں وہی ہتھیار عوام الناس کے پاس بھی ہوتے تھے۔ غرضکہ اندرونی ہنگامہ آرائی سے مغلوں کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔ اور انھوں نے بار بار شمالی و مغربی سرحد پر تاخت شروع کر دی۔ آئندہ سطور میں مغلوں کی روک تھام اور اندرونِ ملک امن کے قیام کے لئے جو کچھ کیا گیا مذکور ہوگا:-

باغیوں کے خلاف مہمات

(۱) ۱۲ نومبر سنہ ۱۲۴۶ء کو بادشاہ بلبن کو ساتھ لیکر پنجاب کے باغیوں کو مطیع کرنے کے لئے نکلا۔ سنہ ۱۲۴۱ء میں جب مغلوں نے لاہور کو تاراج کیا تو گکھروں و نیز دیگر پہاڑی قوموں نے مغلوں کی ہر طرح سے مدد کی تھی۔ دہلی میں طوائف الملوکی کی وجہ سے ان باغیوں کی اب تک تادیب نہیں کی جا سکی تھی۔ ناصر الدین نے خود بمقام سوہدرہ کنار راوی قیام کیا اور بلبن کو فوج دیکر آگے بڑھایا۔ بلبن نے گکھروں نیز کوہ نمک کے علاقے کے راجہ جسپال کی سرکوبی کی۔ وہ جہلم کے کنارے تک سب کو مطیع و منقاد بنا کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا جو اس وقت دریائے چناب کے کنارے خیمہ زن تھا۔ واپسی میں عید الضحیٰ کی نماز جالندھر میں پڑھی اور محرم سنہ ۶۴۵ھ مطابق جون سنہ ۱۲۴۷ء میں دہلی واپس لوٹ آیا۔ چار مہینے دہلی میں قیام کرنے کے بعد پھر باغیوں کی تادیب کے لئے نکلا۔

(۲) دہلی سے پہلے پانی پت آیا پھر وہیں سے دوآبہ میں قنوج کی بغاوت کا حال سن کر بلبن ترا قنوج کے قریب ایک قلعہ میں باغیوں نے محصور ہو کر بڑا سخت مقابلہ کیا لیکن آخرکار مغلوب ہو گئے فروری سنہ ۱۲۴۸ء تک

آخر میں ہانسی اور پھر ناگور کا گورنر مقرر کیا اور اُس کی جگہ قلمدان وزارت عماد الدین ریحانی کے سپرد کیا گیا۔ بادشاہ کا یہ طرزِ عمل بلبن کے بہی خواہوں کو بہت برا لگا انھوں نے بلبن کو مشورہ دیا کہ وہ بغاوت کرکے خود بادشاہ بن جائے لیکن اُس نے انتہائی ضبط و تحمل اور فرماں برداری کا ثبوت دیا یعنی یہ کہ بادشاہ کے احکامات کی بے چون و چرا تعمیل کی جو لائقِ صد ستائش ہے۔

(۸) ۱۲۵۰ء میں مغلوں نے ہندوستان پر چھاپہ مارا لیکن ملتان کے گورنر شیر خاں سنقار نے اُن کو شکست دیکر بھگا دیا اور غزنی تک اُن کا تعاقب جاری رکھا۔ مغلوں کے بار بار حملوں کو روکنے اور اُن کو ذلت آمیز شکستیں دینے کی وجہ سے شیر خاں کا شمار بہت بڑے آدمیوں میں ہے۔

(۹) ۱۲۵۴ء واقعات کے لحاظ سے بہت اہم ہے اسی سال بلبن نے ناگور سے نکل کر بوندی اور رن تھمبور پر حملہ کیا اور راجپوت باغیوں کو شکست دی۔ ادھر بادشاہ نے کٹھیر کی بغاوت کو فرو کیا۔ وہ بروز پنجشنبہ ۱۳ ماہ محرم ۶۵۲ھ مطابق فروری ۱۲۵۴ء کو میاں پور کے گھاٹ پر دریائے گنگا کو عبور کرکے پہاڑ کے دامن میں سفر کرتا ہوا دریائے رام گنگا کے کنارے پہونچا پھر بذریعہ دریا سفر کرکے کٹھیر یا کانٹھ[۱] کے مقام پر باغیوں سے صف آرا ہوا اور انھیں ۱۶ ماہ صفر ۶۵۲ھ کو شکست دی۔ ۱۹ ماہ صفر کو لشکر شاہی بدایوں پہونچا۔ یہاں ۹ روز قیام کرنے کے بعد براہ کول (علی گڑھ) ۲۶ ماہ ربیع الاول ۶۵۲ھ مطابق ماہ مئی ۱۲۵۴ء دہلی واپس پہونچ گیا۔

ماہ اکتوبر ۱۲۵۴ء میں بادشاہ کو معلوم ہوا کہ اُس کا بھائی جلال الدین اور بلبن کا چچازاد بھائی شیر خاں سنقار[۲] ترکستان سے مدد گار فوجیں لیکر نواح لاہور تک آپہونچے ہیں۔ دہلی

(۱) کانٹھ بہت بڑا قصبہ ہے۔ یہ شہر شاہجہانپور سے ۸ میل جانب جنوب و مغرب واقع ہے۔

(۲) شیر خاں سنقار بلبن کے برطرف ہونے اور عماد الدین ریحانی کے بیجا تشدد سے ناراض ہوکر

(باقی صفحہ ۲۷۱ پر)

لیکن بادشاہ کو بروقت سازش کا علم ہوگیا اُس نے اپنی ماں اور قتلغ خاں کو اودھ کی صوبیداری پر بھیج دیا اور اِدھر ریحانی کو بدایوں سے ہٹا کر بہرائچ کا حاکم بنا دیا۔ ریحانی اور قتلغ خاں نے بادشاہ کے خلاف سازش کی۔ سب سے پہلے عمادالدین ریحانی سے سرکشی کے آثار نمایاں ہوئے اُس کی سرکوبی کے لئے بادشاہ نے سنجار چشت کو بھیجا جس کو راستہ میں قتلغ خاں نے نظر بند کر لیا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح قید سے نکل بھاگا اور بہرائچ پہونچ کر ریحانی کو شکست دے کر قتل کر دیا۔ بادشاہ قتلغ خاں کو سزا دینے کے لئے دہلی سے روانہ ہوا اِس عرصہ میں قتلغ خاں اودھ سے روانہ ہو کر بدایوں تک آ پہونچا تھا لیکن شاہی فوجوں کا دباؤ پڑنے سے پنجاب کی طرف اِس اُمید پر روانہ ہوگیا کہ اس کو جلال الدین کے دربار میں جگہ مل جائے گی۔ بادشاہ بھی ۱۵ مئی ۱۲۵۹ء تک دہلی واپس لوٹ آیا۔

(۱) قتلغ خاں نے اُس علاقہ پر قبضہ کر لیا جو آج کل ضلع دہرہ دون کے نام سے مشہور ہے۔ اُس نے پہاڑی ہندوؤں کو ملا کر سرمور میں سامان جنگ فراہم کیا اِس کام میں سرمور کے راجہ رن پال نے اُس کو بہت امداد دی۔ بادشاہ نے مارچ ۱۲۵۹ء میں باغیوں کو شکست دے کر سرمور پر قبضہ کر لیا لیکن قتلغ خاں بچ کر نکل گیا اور ہاتھ نہیں آیا۔ وہ کوہستان ہمالیہ سے نکل کر شمالی پنجاب کے کسی قلعہ میں [illegible] گیا۔

اِسی سال کشلو خاں حاکم ملتان نے بغاوت کی اور ناصرالدین محمود کو اپنا بادشاہ ماننے کی بجائے ہلاکو خاں مغل کو اپنا شہنشاہ تسلیم کیا۔ جب شاہی فوجیں سرمور کی مہم سے واپس آئیں تو بادشاہ انہیں لے کر کشلو خاں کے مقابلہ کو روانہ ہوا جو کہ بیاس ندی کے کنارے تک اپنی فوجیں لے کر آ پہونچا تھا اور جس کا مددگار قتلغ خاں بھی تھا۔ دونوں مخالف سرداروں کی فوجیں بادشاہ اور بلبن کو دھوکا دے کر دہلی تک آ گئیں انہیں اُمید تھی کہ دہلی والے اُن کی مدد کریں گے لیکن انہیں مایوسی ہوئی۔ ابھی

اثناء میں بلبن معہ بادشاہ کے باغیوں کا سُراغ لگاتا ہوا آپہونچا اس پر دونوں سردار شوالک
پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے جہاں سے ۲۲ جون ۱۲۵۷ء کو کشلو خاں اُوچھ کی طرف روانہ ہوگیا۔
دسمبر ۱۲۵۷ء میں کشلو خاں **مغل سپہ سالار نوعین سالین** کی ماتحتی میں کثیر التعداد
مغلوں کو لے کر ملتان کے راستہ سے ہندوستان پر حملہ آور ہوا مغل ستلج کے کنارے تک آپہونچے
اِس مرتبہ اتنا خوف وہراس پھیل گیا تھا کہ مسلمانوں میں جوش پیدا کرنے کے لئے شعراء کو قومی نظمیں
لکھنے پر مامور کیا گیا۔ بادشاہ نے تمام جاگیرداروں کو مدد کے لئے طلب کیا یہ بہت نازک موقع
تھا کیونکہ بعض جاگیرداروں نے (اودھ اور کڑا کے جاگیرداروں نے خاص طور پر) مدد دینے میں
تساہل برتا اور دوآبہ و میوات میں بغاوت کے آثار پائے جاتے تھے۔ بہر صورت ناصر الدین
جنوری ۱۲۵۸ء میں بلبن کو لے کر دشمن کے مقابلہ پر روانہ ہوگیا۔ دشمن سلطانی رعب میں آکر
بلا مقابلہ واپس لوٹ گیا۔ بادشاہ ستمبر ۱۲۵۸ء تک دہلی واپس لوٹ سکا۔ اسی سال ماہ فروری
میں ہلاکو خاں نے بغداد کو تہ و بالا کیا اور خلیفہ عباسی مستعصم باللہ کو شہید کر دیا۔

(۱۲) ۱۲۵۹ء میں ہندوؤں نے **گوالیار و بیانہ** کی طرف سر اُٹھایا۔ سلطان نے خود
جا کر اِس فتنہ کو فرو کیا اور اسی سال اس نے اودھ اور کڑا کے جاگیرداروں کو ان کی غفلت
وکاہلی کی سزا دے کر معاف کر دیا۔

(۱۳) ۱۲۶۰ء میں میوات کے میواتیوں کی سرکشی انتہا تک پہونچ چکی تھی۔ رہزنی، قتل،
ڈکیتی اور سرقہ کے یہ لوگ شدید ترین مجرم تھے ان کی جرأت اتنی بڑھ گئی تھی کہ دہلی کی فصیل
کے نیچے سے پانی بھرنے والی عورتوں تک کو اُٹھا لیجاتے تھے بلبن اُن کو سزا دینے کے لئے
۲۹ جنوری ۱۲۶۰ء کو روانہ ہوا اور اچانک ایک ہی منزل کر کے قلب میوات میں پہونچ گیا۔
کامل ۲۰ یوم دار و گیر کا سلسلہ گرم رہا۔ ہر میواتی کے سر کی قیمت ایک ٹنکہ اور زندہ کی دو ٹنکہ
مقرر کر رکھی تھی۔ اِس مہم سے ۹ مارچ کو بلبن واپس لوٹا اور اپنے ساتھ ۲۵۰ میواتی جن میں
اُن کے سرغنہ بھی شامل تھے ۱۴۲ گھوڑے اور ۲۱ لاکھ ٹنکہ دہلی کو لایا۔ میواتیوں کو قتل کرا دیا۔

اِسی سال جاسوسوں کی مدد سے میواتیوں پر دوبارہ چھاپہ مارا اور اس مرتبہ اس نے ۱۲ ہزار بدمعاشوں کو کیفر کردار کو پہونچایا۔

مغل سفیر کی آمد

اِسی سال ہلاکو خاں کا سفیر سلطان ناصر الدین محمود کی خدمت میں دہلی حاضر ہوا۔ اِس زمانہ میں سلطان نے پرانی دہلی کی سکونت چھوڑ کر جمنا کے کنارے کلوکھری کے محل میں آگیا تھا۔ سفارت اِسی جگہ باریاب ہوئی۔ سفیر کی آمد پر دہلی میں شان و شوکت کی نمائش و اظہار کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ خان اعظم الغ خاں پچاس ہزار سوار باساز و یراق اور دو لاکھ پیادے زرق برق لباس اور مجلی ہتھیاروں سے آراستہ و مسلح اور دو ہزار جنگی ہاتھی اور تین ہزار عرادۂ آتشبازی ہمراہ لے کر دہلی سے استقبال کے لئے نکلا شاہی محل کے دروازے تک دورویہ مسلح پیادے و سواروں کی بیس بیس صفیں ایستادہ کیں اُن کے عقب میں عماری دار ہاتھیوں کی قطاریں تھیں اِس جنگی ساز و سامان کے علاوہ محل کے دروازے پر چند قیدیوں کی لاشیں لٹک رہی تھیں۔ غرض سفیر اِس راستے سے گذر کر جب ایوان شاہی میں پہونچے تو وہاں اور بھی زائد مرعوب کن نظارہ دیکھا۔ تمام دربار سونے چاندی اور جواہرات کے نمائشی و آرائشی سامان سے جگمگا رہا تھا۔ معہ و نیک سلطان کے تخت کے ایک پہلو پر سادات و مشائخ عظام کی صف تھی۔ دوسری جانب اُن پچیس بادشاہوں اور شاہزادوں کی قطار تھی جو خراسان و ایران اور آذربائیجان وغیرہ ممالک سے مغلوں کے ڈر سے بھاگ کر ہندوستان میں بطور پناہ گزیں شاہی مہمان تھے۔ ایک قطار بڑے بڑے اُمرا، نامدار و عمال سلطنت کی تھی جن میں ہندو رانا، راجہ مہاراجہ اور رائے زادگان بھی شامل تھے۔ منہاج سراج نے اِس واقعہ کو نظم کیا ہے[1]۔

---

[1] منہاج الدین سراج کی نظم کے اشعار حسب ذیل ہیں:۔

(۱) زہے جشنے کزاں اطراف چوں خلد بریں گشتہ — خہے بزمے کز و اکناف عدل راستیں گفتہ

(باقی صفحہ ۲۷۵ پر)

ایک طرف شجاع و جفاکش تھا تو دوسری طرف عابد شب زندہ دار اور زاہد خوش اطوار بھی تھا۔ چھ مہینے میں ایک قرآن مجید اپنے ہاتھ سے لکھ لیتا تھا اور سال بھر میں دو۔ انھیں کے ہدیہ سے سال بھر تک اپنی گذر کرتا تھا۔ اس کے ایک ہی بیوی تھی اور وہی اُسے اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلاتی تھی۔ ملازمہ رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ اپنی کمائی میں اتنی گنجائش نہیں دیکھتا تھا کہ ایک ملازمہ کے اخراجات برداشت کر سکے۔ رہا خزانہ اُسے وہ رعایا کی امانت سمجھتا تھا اور اس میں سے ایک کوڑی بھی اپنی ذات پر صرف کرنا حرام سمجھتا تھا۔

اس کی نیک دلی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ اُس نے اپنے ہاتھ سے نقل کی ہوئی کتاب ایک امیر کو دکھائی۔ امیر نے اس میں بعض غلطیاں بتائیں جن کو بادشاہ نے درست کر دیا لیکن جب امیر چلا گیا تو بادشاہ نے انھیں ویسا ہی کر دیا جیسا کہ پہلے تھا۔ اس پر لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ مجھے معلوم تھا کتاب غلط نہیں ہے لیکن ایک خیر خواہ کا دل دکھانے کی بجائے میں نے اس کو مناسب سمجھا کہ حروف کو کاٹ دوں اور اُن کو دوبارہ صحیح بنا دینے کی محنت کو اپنے اوپر گوارا کر لوں۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۷۵ اولاً تو اس عہد کے نامور ادیب و مورخین مثلاً منہاج سراج، برنی، امیر خسرو وغیرہ خاموش ہیں اس کے علاوہ از روئے قیاس بلبن کو کیا ضرورت تھی کہ وہ ناصر الدین کو زہر دے۔ سلطان مسعود اور ناصر الدین دونوں اس کے داماد تھے اور ناصر الدین کی لڑکی اس کے بیٹے بغرا خاں کو منسوب تھی اس طرح شاہی گھرانے سے چند در چند تعلقات کی بنا پر وہ بادشاہت کا از خود مستحق تھا۔ علاوہ ازیں ناصر الدین نے اولاد ذکور نہ ہونے کی بنا پر بلبن کو اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو طبقات ناصری کا دیباچہ ص ۲۹ نیز متن ص ۱۱۹ اخلاط ورگی، فاؤنڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۵۲ از ڈاکٹر حبیب اللہ

ع ۱:- فرشتہ ص ۷۱، طبقات اکبری ص ۵۲ ،ع ۲:- طبقات اکبری ص ۵۳

مذہب کا وہ حد درجہ احترام کرتا اور عظمت نبوی کے خیال سے ہر وقت کانپتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے ایک ندیم محمد نامی کو تاج الدین کہہ کر پکارا۔ ندیم تین دن تک نہیں آیا تو سلطان نے اس کو طلب کر کے وجہ دریافت کی۔ اس نے کہا کہ سلطان ہمیشہ اس کا نام لیکر پکارا کرتا تھا اس دن خلاف معمول تاج الدین کہہ کر آواز دی۔ سمجھا کہ سلطان کچھ برہم ہیں اس لئے مضطرب ہو کر گھر چلا گیا۔ اس پر سلطان نے قسم کھا کر اس کو یقین دلایا کہ "میں تم سے مطلق ناراض نہیں ہوں اس دن تمہارا نام نہ لینے کی وجہ یہ تھی کہ میں باوضو نہ تھا اور بغیر طہارت کامل کے لفظ محمد میں اپنی زبان سے ادا نہ کرسکتا تھا۔"[1] ۵

فصل دوم

(۹) سلطان غیاث الدین بلبن فروری ۱۲۶۶ء تا جنوری ۱۲۸۷ء

تخت نشینی و ابتدائی حالات سلطان ناصر الدین محمود کی وفات کے بعد ناصر الدین یا التمش دونوں کی اولاد ذکور میں سے کوئی بھی ایسا نہ رہا جو بار حکومت کو اپنے کاندھوں پر اٹھا سکے۔ اس لئے سلطنت کو طوائف الملوکی سے بچانے نیز سلطان مرحوم کی وصیت کا لحاظ کر کے امرائے سلطنت نے بلبن کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ اس کو سلطان التمش کی لڑکی منسوب تھی۔ سلطان التمش نے ۴۰ غلام خریدے تھے ان میں سے بلبن بھی ایک تھے۔ بلبن سے پہلے اس کا ایک بھائی کشلی خاں سلطان کی ملازمت میں داخل تھا۔ بلبن نے سقہ گیری سے لیکر دارو غہ مطبخ میر شکار، حاجب، گورنر اور پھر ناصر الدین کے عہد میں وزارت

---

[1] تاریخ فرشتہ ۔

[2] بلبن کا باپ البری قبیلہ کا ایک رکن تھا اور دس ہزار گھروں کا سردار تھا ۔ ۔ ۔ سوار ۔ ۔ ۔ مغلوں کے حملہ کی وجہ سے خاندان تباہ ہو گیا اور بلبن کو انقلاب روزگار کی وجہ سے غلام بننا پڑا (طبقات ناصری ص ۲۸۱ وغیرہ)

عظمیٰ کے جلیل القدر منصب پر فائز ہوا۔ لیکن سلطان مرحوم کی زندگی تک بلبن سلطنت کے
نظم و نسق میں وہ ضبط و باقاعدگی پیدا نہ کر سکا جو اُس کے عہد بادشاہی کی خصوصیت ہے
اُس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ وہ تمام اختیارات رکھنے کے باوجود بادشاہ وقت کا ماتحت
عہدہ دار تھا دوسرے سلطنت کے مختلف اقطاع پر اُن "ملوک شمسی" کا تسلط تھا۔ جو
بلبن کے ہم قوم و ہم چشم تھے اور جو التتمش کے بعد اس درجہ سرکش ہو گئے تھے کہ انھیں
مرکزی سلطنت کا باجگزار رکھنا اور خود مختار بادشاہ نہ ہونے دینا ہی بلبن کا بڑا کارنامہ ہے
اِن چالیس ترک غلاموں میں جو چہلگانِ شمسی کہلاتے ہیں بعض غلام عمر و اقتدار
کے لحاظ سے بلبن سے بھی بڑے تھے[۱]۔ اور حرف "انا ولاغیری" (یعنی جو میں ہوں وہ
دوسرا نہیں) تو ہر ایک کی زبان پر تھا[۲]۔ انھیں غلاموں نے طاقتور ہو کر اُن آزاد امراء
و شاہزادوں کو بھی اُمور سلطنت سے بیدخل کر دیا جو چنگیز خانی سیلاب سے بچ کر
دہلی چلے آئے تھے اور جن کی وجہ سے درگاہ سلطان شمس الدین درگاہ محمودی و سنجری
معلوم ہوتی تھی[۳]۔

بلبن کے اصول حکومت

اِس میں شبہ نہیں کہ بلبن نے مرکزی حکومت میں دخل پاتے ہی اپنی قوت اِس قدر بڑھالی
کہ کسی کو بھی دربارِ دہلی سے انحراف کرنے کی بمشکل جرأت ہو سکتی تھی پھر بھی ملوک شمسی
کی انانیت اور مقامی ہندو روسا کی باغیانہ اسپرٹ کو دبانے کے لئے تاکہ ملک میں
بدامنی نہ پیدا ہونے پائے، اُس کو مجبوراً بعض عجمی شعائر پر عمل کرنا پڑا جس کو بعض
مورخین نے اُس کے اصول حکومت میں داخل کر کے اُس کو بدنام کرنے کی کوشش

عل۔ اعز الدین کشلو خاں وغیرہ کا حال پیچھے لکھا جا چکا ہے تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو طبقات ناصری طبقہ
ع۲۔ ضیائے برنی ص۲۸ ع۳۔ ضیائے برنی ص۲۷، فرشتہ جلد اول ص[illegible] ع۴۔ عجمی شعائر
میں جاہ و حشمت کی نمود و نمائش اور عدم مساوات شامل ہیں (مولف)

کی ہے حالانکہ بلبن ایرانی اکاسرہ کی تقلید میں خود پرستی و عظمت نمائی کے طور و طریق[۱] کو اسلامی تعلیمات کے نہ صرف منافی بلکہ تبرک سمجھتا تھا۔ اور اپنے افعال کے جواز

ع۱ :۔ بلبن نے اپنی بادشاہی کے لئے عجمی شعائر عظمت و جلال کو بلا سوچے سمجھے یا محض خود پسندی کی بنا پر اختیار نہیں کیا تھا بلکہ اسلئے کہ لوگوں کے دلوں پر بادشاہ کا رعب و دبدبہ مستولی ہو جائے تاکہ مفسدوں کو فتنہ و فساد کی اور ظالموں کو کمزوروں کو ستانے کی ہمت و جرأت نہ ہو سکے (ملاحظہ ہو برنی ص۳۱، ص۳۲) وہ بارہا کہتا تھا کہ "رعایا در عصر بادشاہی بے حرمت و حشمت و ہول و ہیبت زندہ بار کار دو تمرد و طغیان رو نماید ہند و ان سر تابی کنند و مسلمانان از کثرت فسق و فجور و بسیاری زنا و لواطت و شراب خوردن و ناکردنی ہائے دیگر بدبخت شوند" (ضیاء برنی ص۳۴) یعنی وہ بادشاہ جو رعب و داب اور شان و شوکت نہیں رکھتا اس کی رعایا میں الحاد و سرکشی بڑھتی ہے۔ ہندو بغاوت کرتے ہیں اور مسلمان فسق و فجور و دیگر افعال شنیعہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ شاہانہ تزک و احتشام کا خاص طور سے لحاظ رکھتا تھا۔

اس کے شاہانہ رکھ رکھاؤ کی ضیائے برنی نے نہایت دلکش تصویر کھینچی ہے۔ لکھتا ہے کہ "جس وقت اس کا دربار آراستہ ہوتا یا سواری چلتی تو صدہا نقیب و چاؤش، پیادہ و سوار، امراء و فوجی سردار اس کے گرد و پیش ہوتے تھے۔ ملک سیستان کے دیو ہیکل نوجوانوں کو بیش قرار تنخواہیں دیکر خاص طور سے اس کام کے لئے نوکر رکھا گیا تھا کہ وہ ننگی تلواریں کندھوں پر رکھے بادشاہ کی خواصی میں رہیں۔ اور جب اس شان و شکوہ اور شوکت و سنجری کے ساتھ بادشاہ برآمد ہوتا یا سوار ہو کر چلتا تو نقیب و چاؤش قدم قدم پر صدائے بسم اللہ اس زور سے بلند کرتے کہ بازار و جنگل گونج جاتے تھے اور آواز دو دو کوس تک سنائی دیتی تھی۔ اس نظارہ سے تماشائیوں کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں اور حاضرین کے قلوب دہل جاتے تھے جو سو سوار، دو دو سو کوس سے چل کر محض یہ تماشا دیکھنے کے لئے دہلی آتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات

(باقی مضمون صفحہ ۲۸۰ پر)

میں یہ حجت پیش کرتا تھا کہ "اگر بادشاہ کا اعتقاد صحیح اور نیت درست ہو اور اس قسم کے
افعال سے اس کا مدعا محض حق کی حمایت اور عدل و امن کا قیام ہو تو وہ عند اللہ مؤاخذہ

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۷۹ ۔ نئے آدمی جو حضور میں باریاب ہوتے تھے خواہ وہ کہیں کے سفیر ہوں یا
ہندوستان ہی کی کسی ریاست کے راجہ یا راجکمار تو وہ "خاک بوسی" یعنی سلام کے وقت خوف سے گر پڑتے
یا بیہوش ہو جاتے تھے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۳۳ – ۳۱ از ضیائے برنی)

بلبن نے وقار بادشاہی و داب و آداب پادشاہی کی مبالغہ کی حد تک محافظت کی۔ برنی کا کہنا
ہے کہ "۲۰ سالہ دور حکومت میں بلبن کے محل سرا کے خادموں و ملازموں نے بھی اس کو کبھی بغیر
ٹوپی و موزے کے نہ دیکھا۔ اس مدت میں اگر ۲۰ سال عہد وزارت کے بھی شامل کر لئے جائیں تو ۴۰ سال
کے عرصہ میں اس نے کسی رئیس و بازاری و مطرب و سفلہ و مسخرہ کو شرف ہمکلامی نہیں بخشا اور اپنی
حرکات و سکنات نیز قول و فعل سے کوئی ایسی بات ظاہر ہونے دی جو شاہی وقار کو کم کرتی۔ اس
نے بادشاہی کے زمانہ میں نہ کسی سے مزاح کیا اور نہ کسی کو مزاح کی اجازت دی اسی طرح دربار
میں نہ وہ کبھی قہقہہ مار کر ہنسا اور نہ کسی کو جرأت تھی کہ اس کے سامنے ہنسے۔ اس زمانہ کا ایک
مشہور و معروف رئیس فخر باونی کو اس امر کی ہمیشہ تمنا رہی کہ بادشاہ سے بالمشافہ گفتگو کرنے
کا اسے موقع مل جائے اس کے لئے اس نے بادشاہ کے مصاحبین و مقربین کی خدمت میں نذرانے
پیش کئے تاکہ وہ بادشاہ سے سفارش کر کے گفتگو کا موقع بہم پہنچائیں لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ بادشاہ
نے ملک علاء الدین کشلی خاں "باربک" کے ذریعہ منع کر دیا اور انکار کے وجوہ بیان کئے جو اس
زمانہ کی اخلاقی و سیاسی فضا کو دیکھتے ہوئے بالکل صحیح ہیں۔

(ملاحظہ ہوں صفحات ۳۳ تا ۳۵ از برنی، صاحب طبقات اکبری نے رئیس کا نام فخر ابانی
تحریر کیا ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۹۵ جلد اول)

بلبن کے زمانہ میں قریباً ۱۵ بادشاہ اور شاہزادے دہلی کے اندر پناہ گزین تھے۔ یہ سب مغلوں

(باقی مضمون صفحہ ۲۸۱ پر)

ان پانچوں اعلیٰ عہدہ داروں کو بلا کر متنبہ کیا کہ "این زماں مولا نزادہ کم اصلی و کم بضاعتی گزیند"
اس لئے اگر آئندہ اس قسم کے کارداروں کا تم نے میرے سامنے ذکر بھی کیا تو میں تمہیں ایسی سزا دوں گا جو دوسروں کے لئے باعثِ عبرت ہو۔ اس کے بعد ایک مجلس میں عادل خاں اور تمر خاں سے مخاطب ہو کر بلبن نے کہا کہ تمہیں میرے آقا سلطان شہید شمس الدین التمش، کا وہ واقعہ یاد ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ اقطاعِ قنوج کی حکومت اپنے پسرِ کلاں شہزادہ ناصر الدین کو دی اور خواجگی قنوج کے عہدہ پر جمال الدین مرزوق کو نامزد کیا لیکن جمال الدین کے بارے میں جب یہ معلوم ہوا کہ یہ کم اصل ہے تو سلطان مرحوم نے نہ صرف جمال الدین کو بلکہ تفحص کر کے ۳۳ اور کم اصلوں کو اُن کے عہدوں سے معزول کر دیا۔ ان میں کوئی خواجہ و متصرف تھا تو کوئی مشرف و برید کے ذمہ دار عہدوں پر سرفراز تھا۔[1]

بلبن و التمش کا یہ طریقِ عمل جو بظاہر اسلامی عدل و مساوات کے منافی معلوم ہوتا ہے اُن حضرات کے لئے خاص طور سے قابلِ غور ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اکثر ہندوؤں نے عہدوں کے لالچ میں آ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ نومسلم کا لفظ برنی نے عمومیت کے طور پر استعمال کیا ہے جس طرح دوسرے مقام پر لفظ ہندو۔ بلبن کے عہدِ حکومت میں نومسلم زیادہ تر جاہل اور نیچے طبقہ کے لوگ تھے جن کو ذمہ دار عہدے صرف اس بنا پر نہیں دئے جا سکتے تھے کہ انھوں نے اپنا مذہب تبدیل کر دیا تھا۔ ملازمت کے لئے اصل چیز ذاتی قابلیت و شرافت [illegible] یعنی اُن کی تربیت و خاندانی روایات عہدہ و منصب [illegible] بہر حال بعض سیاسی و معاشرتی وجوہ کی بنا پر سلطان التمش و بلبن نے [illegible] نومسلموں کو ذمہ دار عہدوں سے الگ رکھا ورنہ اسلام میں مسلم و نومسلم کی حیثیت مساوی [illegible] الفاظ میں نومسلموں کو یاد کیا ہے اُن سے دھوکا نہ کھانا چاہئے۔ اس نے بلبن کا حال کم و بیش ۷۵ سال بعد ۷۵۸ھ میں لکھا ہے جبکہ دہلی کے تخت پر حکومت [illegible]

[1] ضیائے برنی ص ۲۶ تا ۳۶

پائے گا، چنانچہ مظلوم کی دادرسی اور عدل کرنے کے وقت کسی دنیاوی مصلحت یا مروت
کی اُسے ذرہ برابر پرواہ نہ ہوتی تھی۔ آج بھی تاریخ کے صفحات اِس امر کی شہادت
دیتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتا تھا اُسی کے مطابق عمل بھی کرتا تھا۔ برنی نے اِس ضمن میں دو
نہایت نصیحت آمیز و عبرت خیز واقعات کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے پہلا یہ ہے کہ "ملک
بق بق پدر قیر ابیگ شاہی باڈی گارڈ کا افسر اعلیٰ (سر جانداراں) تھا اُسے حد درجہ
شاہی تقرب حاصل تھا۔ بادشاہ نے اُس کو اپنے عہد کے سب سے زیادہ وسیع صوبہ
بدایوں کا گورنر بنا دیا تھا اور اُس کو اجازت دیدی تھی کہ وہ ذاتی طور پر چار ہزار
سواروں کا دستہ ملازم رکھ سکے اس لئے وہ ایک نہایت عالیجاہ امیر بھی تھا۔
اُس نے ایک مرتبہ غصہ کی حالت میں اپنے ایک فراش کو تازیانہ سے اتنا پٹوایا کہ وہ ہلاک
ہوگیا کچھ عرصہ کے بعد بلبن غالباً دورہ کے سلسلے میں بدایوں گیا اُس وقت فراش کی
بیوی نے حضور میں نالش کی بلبن کو جب واقعہ کی تصدیق ہوگئی تو اُس نے حکم دیا
کہ اِس عورت کے سامنے کھڑا کر کے مجرم صوبیدار کے اتنے دُرّے مارے جائیں
کہ وہ ہلاک ہو جائے۔ اِس حکم کی تعمیل ہوئی اور ساتھ ہی بدایوں کا برید یعنی ڈاک کا
عہدیدار بھی جس نے اِس واقعہ کی اطلاع نہیں کی تھی سولی پر لٹکا دیا گیا۔ اسی طرح
ملک ہیبت خاں حاکم اودھ نے ایک شخص کو بیجا طور پر قتل کرا دیا تھا۔ مقتول کی بیوی
نے بادشاہ سے دادرسی چاہی۔ بلبن نے اپنے سامنے ہیبت خاں کے پانسو دُرّے
(کوڑے) لگوائے اور [illegible] سے کہا کہ (ایں قاتل بندہ من بود من تو
بخشیدہ ام ایں را بزخم کارد بدست خود بکش" یعنی یہ قاتل آج تک میرا غلام تھا اب
یہ تیرا غلام ہے اس کو تو اپنے ہاتھ سے قتل کردے ہیبت خاں نے منت و سماجت

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۵: ۔ طاہاں بر تیغ از ند" وغیرہ وغیرہ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں ص۱۴۱ تا
ص۱۴۸ از برنی) ۔ تاریخ فیروز شاہی ص۱۴۲ از برنی۔

کرکے لوگوں کو اپنا سفارشی بنایا اور اُس عورت کو بیس ہزار تنکہ (بطور خوں بہا) دیکر اس کی غلامی سے آزادی حاصل کی اور پھر گوشہ نشین ہو کر اپنی بقیہ زندگی گذار دی۔[1]

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بلبن کس مزاج اور کس قماش کا آدمی تھا۔ راجہ شیو پرشاد صاحب نے اپنی تاریخ میں بلبن کی بابت کتنا موزوں فقرہ لکھا ہے کہ "وہ اپنا نام اور کام دونوں اپنی یادگار چھوڑ گیا"[2] جس طرح بچوں پر ماں باپ کی شفقت و محبت ہوتی ہے۔ اسی طرح مظلوموں و عاجزوں کے لئے اُس کی محبت و شفقت مشہور ہے۔ برنی لکھتا ہے کہ "درباب مظلومان و عاجزاں پدری و مادری کردے و ازاں کہ پسراں و مقربان و خواصاں و کارداراں و والیاں و مقطعاں، اورا از مزاج انصاف ستانی و داد دہی سلطان بلبن روشن بود، زہرہ نبود کہ ایشاں با غلام و کنیزک و سوار و پیادہ خود زیادتی کنند"[3] یعنی اُس کے عدل و انصاف کی وجہ سے کسی کی اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے ماتحتوں پر ذرا سی بھی زیادتی کر سکے۔ حضرت امیر خسروؒ بھی برنی کے بیان کی تائید کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

ز بہر عون مظلومانِ دل تنگ	غیاث الدین و دنیا شد برا و رنگ
شہے بود او کہ از بخشائش و زور	خرام پیل نپسندید بر مور[4]

اُس نے اپنے عمال حکومت کی نگرانی [illegible] کی عام حالت سے باخبر رہنے کے لئے معتبر بریدوں کی ایک جماعت کو مملکت کے ہر چھوٹے بڑے شہر و قصبہ میں متعین کر رکھا تھا۔ یہ ایک طرح کا محکمۂ جاسوسی تھا۔ یہ محکمہ صوبجاتی حکومتوں کے اثر و اقتدار سے باہر تھا۔ اس محکمہ کے افراد براہ راست شہنشاہ کو جوابدہ تھے۔ ان

---

[1] برنی صفحہ ۴۸ و ۴۹ [2] تاریخ آئینہ نما صفحہ ۷۸ و نیز حقیقت نما صفحہ ۲۸۶ [3] تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی [4] ملاحظہ ہو مثنوی دو رانی قلمی در کتب خانہ حبیب گنج ضلع علی گڑھ

[5] آج کل دنیا کی تمام متمدن حکومتوں میں جاسوسی کا محکمہ قائم ہے اور اُس سے طرح طرح کے

(باقی مضمون صفحہ ۲۸۷)

[illegible]

بادشاہت کا درجہ ہے جو ایک بڑی جسیم و عظیم نعمت ہے۔ وہ شہزادہ محمدؒ کو وصیت کرتے وقت آگاہ کرتا ہے کہ "دیکھو" الناس علیٰ دین ملوکھم" کی حقیقت کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا اگر بادشاہ اور اُس کے اعوان و انصار و ولات و عمال وغیرہ دیندار و خدا ترس ہوں گے تو اس کے تمام ملک میں خرد و بزرگ، مرد و زن، پیر و جوان عدل احسان، خیرات و حسنات، طاعت و عبادت، امانت و دیانت اور راستی و راستکاری کو اپنا شعار بنائیں گے ورنہ بصورت دیگر سب کے سب فاسق و فاجر بن جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان کے اعمال کی تمام تر ذمہ داری بادشاہ پر عائد ہوگی جن کا آسے روز قیامت جواب دینا ہوگا اور وہ بڑا سخت دن ہوگا" اس کے بعد ہدایت کرتا ہے کہ "خلیفہ دوم سیدنا عمرؓ اور (خلیفہ بنو امیہ) عمر ابن عبدالعزیز کی زندگی کو اپنے لئے نمونۂ عمل بناؤ"[1]۔ اسی طرح شہزادۂ بغرا خاں کو صوبہ بنگال کی حکومت تفویض کرتے وقت نیک اعمال کی طرف یہ کہہ کر توجہ دلائی کہ "سب سے مشکل کام آخرت کا ہے وہاں جو تمھیں جواب دہی کرنا پڑیگی اُس سے غافل نہ رہنا"[2] وغیرہ وغیرہ

اُس نے اپنے دونوں بیٹوں کو وقتاً فوقتاً جو کچھ بھی وصیتیں نصیحتیں کیں وہ اُن پر خود بھی کاربند تھا اُس کو اوباش و بدچلن نیز فاسق و فاجر سے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان بڑی سخت نفرت تھی چنانچہ ایک مرتبہ شہزادۂ بغرا خاں کو جو اوائل عمر میں شراب کا عادی تھا بہت سخت پکڑا اور پھر اسی پر بس نہیں کیا بلکہ تنبیہ کے بعد "برایں پسر بریداں گماشت و در کار تتبع بسیار کرد او ہم راست ایستاد و لا یعنیہا ترک داد"[3] یعنی اُس کی دیکھ بھال کے لئے جاسوس مقرر کئے یہاں تک کہ وہ راہ راست پر آگیا اور بیہودہ مشاغل کو ترک کر دیا۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۷۶، ۷۷ از ضیائے برنی

[2] " " صفحہ ۹۲، ۹۳ " " "

[3] ضیائے برنی صفحہ ۸۱

کا کچھ حال عمدہ الفاظ میں لکھا ہے۔[1]

مُلکی خدمات

(۱) اُمرائے چہلگانی و اقطاعداران شمسی

ملبن کے اُصول سلطنت کو سمجھ لینے کے بعد اب ہمیں اُس کے اُن احسانات کا ذکر کرنا ہے جو اُس نے مُلکی خدمات کے سلسلہ میں انجام دیئے۔ پچھلے سطور میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ بلبن جو تخت و تاج کا مالک ہونے سے پہلے بھی امارت و سرداری کے مرتبہ پر فائز اور مختلف صوبوں کی حکومت پر قریباً ۲۰ سال مامور رہ چکا تھا بیحد عقلمند، ذی ہوش اور باریک بین شخص تھا اُس کو یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ سلطان ایلتمش کی وفات کے بعد ملوک شمسی نے با اقتدار ہو کر کس طرح بغاوتیں کی ہیں وہ ان بغاوتوں میں اپنے ماتحت ہندو راجاؤں کو بھی شریک کر لیتے تھے جیسا کہ قتلغ خاں نے سرمور کے راجہ دیپال سنگھ کو بغاوت میں اپنا شریک کر لیا تھا۔ چنانچہ اُس نے ۶۶۴ھ میں تخت نشین ہوتے ہی سب سے پہلے اپنی توجہ اِن اُمرائے چہلگانی کا اثر و اقتدار مٹانے میں صرف کی تاکہ اُن سے حکومت کو جو خطرات لاحق ہیں وہ باقی نہ رہیں۔ اِس کے لئے اُس نے مشروع و نامشروع دونوں طریقوں سے کام لیا۔ بعضوں کو تلوار کے ذریعہ سے اور بعضوں کو زہر کی مدد سے موت کی نیند سُلا دیا اور جو باقی رہے وہ بے دست و پا ہو کر رہے۔ "ملوک شمسی" کی طرح ایک اور جماعت بھی تھی جو "اقطاعداران شمسی[2]" پر مشتمل تھی۔

---

[1] Epigraphia Indo-Moslemica 1913-14 PP 35-45 Palam inscription.

بحوالہ ایڈمنسٹریشن آف سلطنت آف دہلی از قریشی ص ۲۲۴ تا ص ۲۱۲

[2] شمس الدین التمش نے قریباً دو ہزار فوجی جوانوں کو دہلی کے اطراف میں زمینیں تقسیم کر دی (باقی مضمون صفحہ ۲۹۳ پر)

اُن کے اُس نے تین حصے کئے (۱) وہ لوگ جن کے پاس جاگیر تھی لیکن بڈھے ہونے کی وجہ سے فوجی خدمت انجام نہیں دے سکتے تھے اُن کی بابتہ دیوان عرض کو حکم دیا کہ ان کی جاگیریں ضبط کر کے خالصہ میں شامل کر لی جاویں اور اُس کی بجائے ۴۰ یا پچاس تنکہ اُن کے گذارے کے لئے مقرر کر دئے جائیں۔ (۲) دوسرے وہ لوگ جو ادھیڑ عمر کے ہیں اُن کی تنخواہیں اُن کے حسب استعداد مقرر کر دی جائیں۔ گانوں انھیں کے پاس رہنے دئے جائیں لیکن خرچ کے بعد جو رقوم بچیں وہ سرکاری خزانہ میں داخل کی جائیں۔ (۳) وہ اقطاعدار جو فوت ہو چکے تھے اور اُن کی جاگیر پر اُن کی نابالغ اولاد یا اُن کی بیوائیں قابض تھیں اُن کے بارے میں حکم ہوا کہ جائداد اُن سے لیلی جاوے اور اُن کے گذارے کے بقدر تنخواہ مقرر کر دی جاوے۔

بلبن کے اِن احکامات سے اقطاعداروں میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی سب نے مل کر بلبن کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی اور ملک الامرا فخر الدین کوتوال کو اپنا سفارشی بنایا اس پر بلبن نے رحم کھا کر اپنے احکامات واپس لے لئے لیکن اقطاعداروں کو آئندہ کے لئے نصیحت ہوگئی اور وہ برابر جلال الدین خلجی کے عہد حکومت تک فوجی خدمت کرتے رہے۔ ○

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۹۲ یقین ظاہر ہو کر یہ اقطاع فوجی خدمت کے لئے دئے گئے تھے۔ التمش کے بعد یا اقطاعدار جاگیروں کو اپنی ملکیت سمجھنے لگے اور فوجی خدمت [illegible] کرنے لگے بلبن نے تخت [illegible] ہو کر [illegible] کی طرف جاتے وقت ان کی خدمات طلب کیں لیکن چونکہ یہ لوگ دیوان عرض [illegible] ہوئے [illegible] کو رشوت وغیرہ دیکر بچ گئے۔ بلبن نے واپس آ کر ان اقطاعداروں کے لئے وہ احکامات نافذ کرنا چاہے جو اوپر [illegible] امرا فخر الدین کو ایسا معلوم ہوا کہ سلطان فطرتاً رحیم تھا [illegible] رحم کے موقعوں پر [illegible] اس پر [illegible] آنسو [illegible] اس کا دل بھر آتا تھا اور وہ معاف کر دیا کرتا تھا چنانچہ [illegible] ہوا اور وہ [illegible] اور حکم دیا کہ ان لوگوں کی تنخواہ [illegible] دستور سابق باقی رہے اور کچھ [illegible] لیا جائے (طبقات اکبری صفحہ ۵۹)

(۲) امن وامان قائم رکھنے کے بعض طریقے

(۱) سلطانی ارادے

مولانا ضیاء الدین برنی نے بڑی تفصیل کے ساتھ بلبن کی سرحدی پالیسی کا تذکرہ کیا ہے اِس سلسلہ میں سب سے پہلے سلطانی ارادوں پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھا ہے کہ اُس کے وفادار اُمراء[۱] نے بار بار تقاضہ کیا کہ مالوہ اور گجرات کے اُن علاقوں پر دوبارہ چڑھائی کیجئے جو شاہان سلف کی کمزوری سے سلطنت دہلی کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ اس پر بلبن نے ہمیشہ انکار کیا اور کہا اگر میں دوسرے ملکوں پر چڑھائی کروں تو اُس سے دو عظیم خطرات کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اول یہ کہ میری غیر حاضری سے منگول دہلی پر قابض ہو جائیں گے اور ہندوستان کی سلطنتِ اسلامیہ کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اگر میں نئے صوبجات کو فتح کر کے دہلی سلطنت میں شامل کروں تو ہر صوبہ کے انتظام کے لئے کم از کم ۱۲ ہزار فوج ایک نہایت متدین وعاقل صوبیدار کے زیر تحت وہاں رکھوں اور تم دیکھتے ہو کہ لائق وتجربہ کار اشخاص کی اس وقت کمی ہے۔ ۱۲ ہزار فوج کے متعلقین، ملازم اور شاگرد پیشہ ... کم وبیش ایک لاکھ کے قریب ہوتے ہیں۔ ان سب کو اگر میں اپنے ... کر کے نئے مقبوضہ کے انتظام کے لئے باہر بھیج دوں تو اس سے دو خرابیوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اوّل یہ کہ ایک لاکھ آدمیوں کے نکل جانے سے اجتماعی قوت کمزور ہو جائے گی جس کے مضبوط رکھنے کی اس وقت جبکہ سرحد پر منگولوں کی فوجیں منڈلا رہی ہیں اشد ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ ان ایک لاکھ وفاداروں کی جماعت مرکز سے دور دراز فاصلہ پر پہونچ جانے کے بعد

---

[۱] :- وفادار اُمراء میں عادل خاں اور تمر خاں کا نام برنی نے بتایا ہے یہ دونوں عالی جاہ امیر اُمراء چہلگانی میں سے تھے۔ (برنی صفحہ ۵۰ تا ۵۱)

ممکن ہے کہ خودسری کا خیال اپنے دماغ میں لائے اور پھر اُن کی تادیب کے لئے
مجھے اُن پر فوج کشی کرنا پڑے تو اس طرح مسلمانوں کا جو خون ناحق بہے گا وہ
میری گردن پر ہوگا اور اس سے خود اپنی طاقت بھی کمزور ہو جائے گی اس طرح
دوہرا نقصان ہے۔ رہا فتوحات کا سوال تو تم جانتے ہو کہ آج جبکہ دنیا کا کوئی بادشاہ
دہلی کی حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو پھر ہندوستان کے رانا و راجہ کس شمار و
قطار میں ہیں۔ میرے چھ سات ہزار جوان اُن کی ایک لاکھ تعداد کے لئے کافی
ہیں۔ اس موقع پر برنی کے الفاظ یہ ہیں "من نیکو میدانم کہ پیش لشکر دہلی ہیچ بادشاہے
دست استادن نتواند کرد تکلیف رایان و رائگان ہندوان وآنکہ غیر ایشان یک
لک پایک و دھانک بود کجا تاب لشکر من توانند آورد واز برائے نہب و تاراج
ایشان شش ہفت ہزار سوار دہلی کافیست" [1]

دورِ استحکام

ان تمام وجوہ کی بنا پر میں اپنے دائرہ حکومت کو وسیع کرنے کے
بجائے اس میں ہر قسم کی انتظامی خوبیاں پیدا کرنا اور نقائص کو
دور کرنے میں مصروف رہنا زیادہ اچھا سمجھتا ہوں اس مقصد کے حصول کے لئے اُس
نے سب سے پہلے اپنی فوجی قوت کو مضبوط کیا اور اس کے لئے اُس نے عمدہ عمدہ گھوڑے [2]
اور ہاتھی فراہم کئے۔ جو اس کو آسانی سے مل گئے۔ فوج کو مضبوط کرنے کے بعد ضرورت

---

[1] ضیائے برنی ص ۵۲ یہ بلبن کا یہ اندازہ ایک تاریخی حقیقت بن گیا جبکہ علاء الدین خلجی نے قلیل فوج لے کر
دولت گری پر چھاپہ مارا اور کامیابی حاصل کی (مؤلف)

[2] عربی النسل گھوڑوں کے لئے بہروچ (واقعہ سندھ) اور گجرات کے علاقے اور ہندی النسل گھوڑوں
کے لئے بھٹنڈہ، سامانہ اور دامن کوہ شوالک کے علاقے مشہور تھے اور یہ سب بلبن کی مملکت میں داخل
تھے۔ اسی طرح بنگال کے ہاتھی مشہور تھے جو بنگال کے گورنر اس کو فراہم کیا کرتے تھے۔ اہمیت کے لحاظ

(باقی مضمون صفحہ ۲۹۶ پر)

اس امر کی تھی کہ اس کو ہر وقت کیل کانٹے سے درست اور چست و چالاک رکھا جائے اور اس کے لئے سیر و شکار سے بہتر کوئی صورت نہیں تھی۔ بلبن کا یہ معمول تھا کہ موسم سرما میں کوشک لعل سے آخر شب میں رخصت ہو کر ریواڑی تک، اور بعض دفعہ اس سے بھی آگے شکار کھیلنے کے لئے نکل جاتا اور بعد نماز عشاء دہلی واپس آتا۔ دہلی کے اردگرد چالیس کوس تک شاہی شکارگاہیں اور جنگلات تھے۔ شکار میں کئی ہزار فوج بھی شامل ہوتی تھی۔ [1] اس شکار اور سفر سے صرف یہ منشا تھا کہ فوج اور گھوڑے جفاکش رہیں اور ضرورت کے وقت میدان جنگ میں کام آسکیں۔ مغلوں کے بادشاہ ہلاکو خاں کو بلبن کے جب شوق صید افگنی کی خبر پہنچی تو وہ چلا اٹھا "شکار کے دھوکے میں نہ رہنا۔ بلبن بڑا کارآزمودہ سپاہی ہے۔ اس کا شکار محض سیر و تفریح کی غرض سے نہیں بلکہ کچھ زیادہ پر معنی مشغلہ ہے" اور حقیقت بھی یہی تھی ابھی بہت دن نہ گذرے تھے کہ اس پرمعنی مشغلہ کے اظہار کا موقع پیش آگیا اگرچہ اس کا پہلا نشانہ مغل نہیں تھے بلکہ میوات و دوآبہ گنگ و جمن کے ڈاکو تھے۔

(ج) فوجی نظام

بلبنی انتظامات کے سلسلہ میں برنی نے فوجی تنظیم و ترتیب کا ذکر نہیں کیا لیکن آگے چل کر کیقباد کا حال لکھتے وقت ادھر اشارہ کیا ہے[2]۔ اس کے پاس باقاعدہ تنخواہ دار فوج تھی جو ہر وقت کیل کانٹے سے تیار رہتی تھی۔ فوج کی تعداد میں اختلاف ہے لیکن یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پایۂ تخت میں اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ سپاہ ہر وقت موجود رہتی تھی۔ جاگیرداروں، گورنروں اور

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۹۵ — ۵۰۰ گھوڑے ایک ہاتھی کے برابر سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب بنگال کے حاکم تترخاں نے اس کو ۶۳ ہاتھی ہدیتاً پیش کئے تو بلبن نے ان کی خوشی میں ایک دربار منعقد کیا (نفس)

۱: دہلی سے ۵۰ میل کے فاصلہ پر اجمیر کی سمت میں بی بی اینڈ سی آئی آر کا مشہور جنکشن ہے۔

۲: ضیائے برنی ص ۱۴۵ ملاحظہ ہو۔

ماتحت ہندو رؤسا کی امدادی فوجیں اس کے علاوہ تھیں۔ ہر فوجی سپاہی کو ۲ ماہ کے بعد میعادی رخصت دیجاتی تھی تنظیم و ترتیب کے لحاظ سے، ۱۰ سپاہیوں کا افسر سرخیل ہوتا تھا۔ اور دس سرخیل کا ایک امیر لشکر یا سپہ سالار اور دس امیر لشکر پر ایک ملک یا امیر ہوتا تھا۔ دس ملک پر ایک خان حاکم ہوتا تھا۔ اس طرح ایک خان دس ہزار سپاہیوں کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔" ان عہدہ جات کے علاوہ اور بھی عہدے تھے مثلاً خان خاناں اور خاقان وغیرہ۔

باقاعدہ فوجوں کے علاوہ اُس زمانہ میں ہر مسلمان فوجی سپاہی ہوتا تھا جس پر حکومت کی مدد کرنا ضروری ہوتا تھا اس طرح اندرونی و بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے وقت ضرورت پر ایک کثیر التعداد فوج جمع ہو جاتی تھی۔ یہی وہ فوجی نظام و انتظامات تھے جن کی وجہ سے ہندوستان ایک عرصہ تک امن و امان کی زندگی گذارتا رہا۔

(۳) میوات و دوآبہ سے رہزنی کا استیصال

یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہندوؤں کے آخری زمانہ میں ملک کے اندر بڑا انتشار پھیلا ہوا تھا جس کی وجہ سے قومیں کی قومیں رہزنی و قزاقی کو اپنی جائز وجہ معاش سمجھنے لگی تھیں۔ مسلمانوں کی فتح نے جب اس طوائف الملوکی کا خاتمہ کیا تو اسی کے ساتھ رہزنی میں بھی کمی ہوگئی لیکن پورے طور سے اس کا استیصال نہ ہو سکا گھنے جنگلوں اور دشوار گذار پہاڑی علاقوں میں وحشی قبائل کے بہت سے گروہ آباد تھے جن کا پیشہ رہزنی تھا۔ اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو آج بھی جبکہ انتظام حکومت میں بہت سی آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں ہندوستان سے رہزنی کا کلی استیصال نہیں ہوا ہے اور کم آباد حصوں میں بعض اوقات بڑے بڑے ڈاکوؤں کی خبریں سننے میں آتی ہیں۔ اس لئے اُن دنوں میں جبکہ شمالی ہند کی آبادی کم تھی اور بہت سے علاقوں میں بڑے بڑے جنگل اور خوفناک بن کھڑے تھے، یہاں کے موروثی قزاقوں کا سد باب کرنا کچھ آسان بات

وغیرہ میں امن و امان قائم ہوگیا اور اس طرح ہندوستان خاص کو ڈاکوؤں رہزنوں اور مفسدوں سے بالکل پاک وصاف کردیا گیا۔ ضیائے برنی شہادت دیتا ہے کہ "ڈاکوؤں کا شر اور رہزنوں کی بلا ہندوستان کے راستوں سے دور ہوگئی اور ہمارے زمانہ تک کہ بلبنی قلعوں کی تعمیر اور تھانوں کے استحکام کو تین پشتیں گذر چکی ہیں ہندوستان کے راستے جاری ہیں اور رہزنی کلیتاً موقوف ہوگئی ہے"۔[۱]

۴۔ شمالی و مغربی سرحدات کا انتظام

(۱) دفاعی مشکلات

ڈکیتی و رہزنی کا یہ استیصال جس کے بغیر کوئی حکومت اندرونی انتظامات کے لحاظ سے قابل تعریف نہیں کہلائی جا سکتی بلبن کا (اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے) ایک بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن اس کے تدبر اور حسن انتظام کا سب سے اچھا ثبوت وہ انتظامات ہیں جو اس نے ہندوستان کو مغلوں کی بلا سے محفوظ رکھنے کے لئے ترتیب دئے۔ دفاعی مشکلات کو سمجھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس زمانہ میں دہلی کی حکومت آج کی طرح کوہستان سلیمان کی قدرتی فصیل سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی کیونکہ دریائے جہلم کے پار مغرب میں جو پہاڑی علاقہ ہے وہ اس زمانہ میں بہت کم آباد اور ناقابل زراعت تھا اور سامان رسد کی قلت کی وجہ سے وہاں کسی بڑی چھاؤنی کا بننا ایک امر محال تھا۔[۲] دوسرے اس علاقے کے نیم متمدن اور جنگجو قبائل جو باعتبار قومیت "کھوکھر" کہلاتے تھے ہندوستان کی دشمنی پر ہمیشہ تلے رہتے تھے اور جو کوئی حملہ آور دریائے سندھ

---

[۱] برنی نے اکثر جگہ بلبن کے انتظامات کو سراہا ہے۔ رہزنی کے دفعیہ کے لئے ملاحظہ ہوں صفحات ۵۵ تا ۵۹ تاریخ فیروز شاہی۔

[۲] آج کل ریل تیز رو دیگر ذرائع کی وجہ سے یہ دشواری باقی نہیں ہے (مولف)

[illegible]

کو مغلوں کے ناگہانی حملوں سے بچانا محال ہوگیا تھا اور چناب کے پار تمام علاقے کو پامال کر دینے سے مغلوں کا مقصد بھی یہی تھا کہ سلطنت دہلی اِس حصہ میں کوئی بڑا جنگی مرکز قائم نہ کرنے پائے۔ اِس مقصد میں کھوکھروں کی غارت گر قوم بلا منت اُن کی حلیف ہوگئی۔ اور جب تک بلبن نے اِن غداروں کو سخت سزائیں نہ دیں لاہور کا علاقہ ویران دیے چراغ رہا اور سرحد کا سب سے بڑا دفاعی مرکز بہت دور جنوب میں ہٹ کر دیپالپور میں قائم کرنا پڑا۔ اِس سے دیپالپور کی رونق و منزلت تو ضرور بڑھ گئی لیکن لاہور کو خراب حالت میں چھوڑے رکھنے کے معنی یہ تھے کہ گویا سلطنت دہلی شمالی و مغربی پنجاب کی حفاظت کا ذمہ لینے سے ہچکچاتی ہے۔

الغرض ۱۲۷۰ء میں شیر خاں سنقر کے مرنے کے بعد جس نے ۱۳ سال تک سدِ سکندری بن کر مغلوں کے بار بار حملوں کو روکا تھا اور جس کے نام سے منگول لرزتے تھے بلبن نے لاہور کی طرف توجہ کی۔ اِس عرصہ میں وہ میوات و دوآبہ کی مہمات سے فارغ ہوچکا تھا۔ اُس نے پہلے جہلم و چناب کے دوآبہ میں بسنے والی سرکش قوموں کی سرکوبی کی۔ بعدہٗ دو برس کے بعد لاہور جا کر شہر و قلعہ کی از سرِ نو تعمیر کی۔ اُس نے سلطنت کی طرف سے بہت سے معمار اِس کام پر مقرر کر دئے کہ وہ نواحِ لاہور کے دیہات میں رعایا کے مکانات بنائیں پھر غالباً یہاں کے قدیم باشندوں کو جو متفرق اور نہایت شکستہ حال ہوگئے تھے لا لا کر بسایا اور ان اضلاع میں نئے سرے سے زندگی پیدا کی کیونکہ گذشتہ تیس سال تک ویران رہنے کی وجہ سے یہاں کے دیہات میں رہنے کے گھر تو درکنار پانی پینے کے لئے کنوئیں تک باقی نہیں رہے تھے۔ اُس نے سرحد پر نئے قلعے بنوائے اور پرانوں کو مرمت کرا کر مضبوط کر دیا اور ان میں قابل افسروں کے ماتحت مستقل تربیت یافتہ فوجیں تعینات کیں۔

(ج) **سندھ و ملتان کا انتظام**:۔ اقطاع لاہور کو آباد کرنے کے ساتھ ساتھ

بلبن نے ممالک سندھ وملتان پر خاص توجہ کی جو حقیقت میں ملک پنجاب کا بازو تھے۔ ان صوبجات پر اُس نے سلطنت کے بہترین اشخاص کو حاکم مقرر کیا اور اُن کا صدر صوبہ دار اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمدؐ کو بنایا جو اس سے پہلے کول (علی گڑھ) کا حاکم تھا۔ دریائے جہلم سے لے کر ساحلِ بحر تک تمام علاقہ شہزادہ محمد کی نگرانی میں تھا اور اس کا مستقر ملتان تھا۔ اس شہزادہ کی علم دوستی[1] اور اعلیٰ اخلاق کی مدح وثنا میں مورخین اور ہمعصر شعراء[2] نے ورق کے ورق تحریر کئے ہیں۔ لیکن اس کی انتظامی وجنگی قابلیت کی شاید بہترین سند یہ ہے کہ بلبن جیسا سخت گیر و نکتہ چین بادشاہ بھی دل سے اُس کی خوبیوں کا معترف تھا اور اسی لئے اس کو "قاآن ملک" کا خطاب عطا فرمایا تھا۔

شہزادہ محمدؐ نے بارہ تیرہ سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ سرحدات کی حفاظت

---

[1] :۔ شہزادہ محمد نہایت قابل، صاحب علم اور علماء کا قدردان تھا۔ شیخ سعدیؒ کو اپنے دربار میں لانے کے لئے دو مرتبہ سفیر روانہ کئے لیکن شیخ موصوف اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے ارادہ کرکے رہ گئے اور معذرت چاہ لی۔ شہزادہ کی تہذیب ومتانت کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی کبھی دن کا دن گذر جاتا تھا لیکن زانو نہیں بدلتا تھا اس کی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ، دیوان خاقانی، انوری اور خمسہ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے اُس نے ایک بیاض تیار کی تھی جس میں اپنے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کرکے درج کئے تھے۔ ان انتخا کے انتخاب پر حسن دہلوی اور امیر خسرو بھی داد دیتے تھے۔ ارباب ذوق اس کی نقلیں لیتے تھے یہ بیاض ایسی نادر چیز تھی کہ جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین نے اپنے خاص دوات دار امیر علی کو دی۔ امیر علی کے بعد امیر خسرو کے ہاتھ آئی۔ (شعر العجم جلد ۲ صفحہ ۱۰۱)

[2] :۔ امیر خسرو اور حسن دہلوی شہزادہ کے دربار سے منسلک تھے جن کے انتخاب پر شیخ سعدیؒ نے اُس کو مبارک باد دی تھی۔ شہزادہ کے دربار میں ایسے ایسے اہل کمال جمع تھے جن کی وجہ سے بلبن کو بھی اُس کے دربار پر رشک ہوتا تھا۔

کی اس تمام مدت میں مغلوں کی کسی بڑی جماعت کو پنجاب کے عبور کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اگر انھوں نے سرحد کی طرف آنے کا ارادہ بھی کیا تو شہزادہ خود مقام مخدوش پر پہونچ جاتا تھا اور آخر کار اسی مدافعت کا حق ادا کرنے میں اس کی جان گئی اور وہ ۶۸۴ھ/۱۲۸۵ء میں شہید ہوگیا۔ مغل اپنے پچھلے نقصانات کا انتقام لینے کے لئے بڑے سازوسامان کے ساتھ ہندوستان آئے ان کا سردار تیمور یا تمر خاں اپنے زمانہ کا بڑا مشہور اور آزمودہ کار سپہ سالار تھا لیکن بلبن کے دفاعی انتظامات کی بدولت اول تو مغل کسی بڑے شہر پر حملہ نہ کر سکے اور دوسرے کھلے میدان کی دونوں لڑائیوں میں انھیں ہندی افواج نے شکست دی اور یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ فتحمند شہزادہ کو قلیل جماعت کے ساتھ اپنے تعاقب میں آتے دیکھ کر انھوں نے اُسے گھیر لیا۔ موقع تھا کہ وہ میدان سے بچ کر نکل جاتا لیکن شہزادہ محمد نے شجاعت کے جوش میں احتیاط کو بزدلی جانا اور بے شبہہ وہ اپنی بہادری سے یہ لڑائی بھی جیت جاتا کہ ناگہاں ایک تیر نے اُس کا کام تمام کر دیا۔ اس طرح وہ خود شہید ہوا[1]

---

[1]۔ مغلوں کے سپہ سالار تیمور خاں کو شکست دینے کے بعد اُس کا تعاقب کیا چونکہ ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی اس لئے ایک تالاب کے کنارے اپنی مختصر سی جمعیت کے ساتھ جس میں صرف پانچسو آدمی شامل تھے نماز میں مشغول ہوگیا۔ مغلوں کو موقع مل گیا انھوں نے دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا سلطان محمد نے نماز سے فارغ ہو کر تاتاریوں کا مقابلہ کیا اور گو بار بار اُن کو شکستیں دیں لیکن اتفاق سے ایک تیر آکر لگا اور وہ زخم کھا کر شہید ہوگیا۔

امیر خسروؒ اور حسن دہلوی بھی اس معرکہ میں شریک تھے۔ دونوں گرفتار کر کے بلخ لیجائے گئے جہاں وہ دو برس تک قید رہے۔ امیر خسروؒ نے شہزادہ کی شہادت پر نہایت پُراثر دو مرثیے لکھے جن کو لوگ پڑھ کر اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے تھے ان میں ایک مرثیہ بہت بڑا ہے اس میں لڑائی کی تمام کیفیت لکھی ہے اخیر کے بند جہاں شہزادہ کی شہادت کا ذکر ہے نہایت پُراثر ہیں۔ مرثیہ کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

(باقی مضمون صفحہ ۳۱۰ پر)

ہوگیا اس کے ساتھیوں میں سے بعض مارے گئے اور کچھ مغلوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوگئے۔ انھیں اسیروں میں حضرت امیر خسرؔو بھی تھے جو اس شہزادے کے محبوب مصاحبوں میں تھے۔ یہ دو برس تک بلخ میں قید رہنے کے بعد بمشکل چھوٹ کر ہندوستان آئے۔

سلطان محمؔد کی شہادت کے بعد جس کو "خان شہید" بھی کہتے ہیں بلبن نے مولتان کا والسرائے اس کے بیٹے کیخسرو کو مقرر کیا جو اپنے باپ کی طرح علم دوست، شجاع و فیاض تھا۔

۴۔(د) مرکزیت کا استحکام اور طغرل کی بغاوت

اپنے پیشرو سلاطین قطب الدین و التتمش کی طرح بلبن کو بھی اس امر کا از حد خیال تھا کہ ہندوستان کو ایک مرکز پر متحد رکھا جائے اور دہلی کی مرکزیت

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۰۴)

واقعہ است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید ۔۔۔ آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید
راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ را ۔۔۔ رخنہ کامسال در ہندوستاں آمد پدید
مجلس یاراں پریشاں شد چو برگ گل ز باد ۔۔۔ برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید
بسکہ آب چشم خلقت شد رواں در چار سو ۔۔۔ پنج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید
تا چہ ساعت بد کہ شاہ مولتاں لشکر کشید ۔۔۔ تیغ کافر کش برائے کشتن کافر کشید
آنچہ حاضر بود لشکر، لشکر دیگر نہ جست ۔۔۔ زاں کہ رستم را نشاید منت لشکر کشید
او دریں تدبیر آگہ نے کہ تدبیر فلک ۔۔۔ صفحۂ تدبیر را خط مشیت در کشید
تا چہ ساعت بد کہ کافر بر سر لشکر کشید ۔۔۔ جوق جوق از آب بگزشتند ناگہ در رسید

بند نہم میں شہزادہ محمؔد کی جواں مرگی اور اہل ملتان کے رنج و غم کا اس طرح ذکر کیا ہے ؎

مہر و مہ بر روئے آں فرخ لقا بگریستند ۔۔۔ روز و شب بر سال آں اندک بقا بگریستند
خلق ملتاں، مرد و زن مویہ کناں و نوحہ کناں ۔۔۔ کو بکو و سو بسو و جا بجا بگریستند
از خروش گریہ و بانگ اہل شب کس نخفت ۔۔۔ بس کہ در ہر خانۂ اہل عزا بگریستند

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو منتخب التواریخ جلد اول صفحہ [illegible] تا ۱۵۱)

کو مستحکم کیا جاوے اس کا تحریری ثبوت اس کی وہ تصنیفیں ہیں جو بنگالے کی بغاوت کو فرو کرنے کے بعد اپنے چھوٹے بیٹے بغرا خاں کو وہاں کا صوبیدار بناتے وقت کی تھیں۔

بغاوت کے اسباب کو برنی[1] نے تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے اس میں فرشتہ نے اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ ۶۷۸ھ ۱۲۷۹ء میں بادشاہ اس قدر علیل ہوا کہ مہینہ بھر تک محل سے باہر نہ آسکا اور دور کے شہروں میں اس کی وفات کی خبر مشہور ہوگئی[2]۔ لکھنوتی میں ان دنوں بلبن کا ایک غلام ملک طغرل صوبہ دار تھا جس کی انتظامی قابلیت اور شجاعت و سخاوت مسلم تھی۔ اسی زمانہ میں ریاست جاج نگر[3] کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی جس میں اس کو بیشمار مال غنیمت ہاتھ لگا۔

غرض کچھ تو فتحیابی کے غرور اور کچھ لکھنوتی کے بغاوت پسند مصاحبوں کے اغوا سے طغرل بغاوت پر آمادہ ہوگیا۔ بظاہر اُسے یہ بھی اطمینان تھا کہ بوڑھے بادشاہ کو رہزنوں کے استیصال اور مغلوں کے حملے روکنے کے لئے پنجاب کے دفاعی انتظامات میں اتنا انہماک ہے کہ وہ بنگالے پر فوج کشی نہیں کرسکے گا۔ بہرحال بلبن کو جب بنگالے کے سلطنت دہلی سے انقطاع تعلق کرنے کی اطلاع ملی تو بلبن پر رنج و غضب

---

[1] ضیائے برنی ص ۸۲ تا ص ۸۳ [2] فرشتہ ص ۷۹

[3] الفنسٹن اور بعد کے اکثر یورپی مورخین نے جاج نگر کے متعلق دھوکا کھایا ہے وہ اسے لکھنوتی کے مشرق میں موجودہ آسام کے قریب کا علاقہ سمجھ کر طرح طرح کی غلطیاں کرتے ہیں۔ حال میں ڈاکٹر ٹپلاح اور مجیسمر اور ٹی نے تحقیق کرکے اس قدیم ریاست کی حدود متعین کی ہیں۔ اس ریاست میں مہاندی سے کر گوداوری تک کا علاقہ شامل تھا جو بعد میں جنوبی گونڈوانہ کہلایا اور اب صوبجات متوسط کا مشرقی حصہ ہے۔ اس کے اور مسلمانوں کے مشرقی صوبوں کے درمیان ”گڈھ کٹنگہ“ نامی علاقہ حائل تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کہیں ریاست جاج نگر کی حدیں مہاندی کے پار شمال تک پھیلی ہوئی تھیں اور اس قرب کی وجہ سے لکھنوتی کے صوبیداروں سے اس ریاست کی اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ (ملاحظہ ہو طبقات ناصری نوٹ ص ۵۸۶ تا ص ۵۹۲ از راورٹی)

کی وجہ سے کھانا پینا حرام ہوگیا اور اس کے غصّہ کو اس واقعہ نے اور بھی بڑھا دیا کہ وہ طغرل جو اب مغیث الدین کے لقب سے اپنی خود مختار بادشاہت کا اعلان کر رہا تھا خود بلبن کا دست پروردہ اور معتمد علیہ غلام تھا۔

طغرل کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے بلبن نے امیگین موئے دراز کو جس کو امین خاں بھی کہتے ہیں نامزد کیا۔ امین خاں مدّت سے اودھ کا صوبیدار تھا اور نہایت کار آزمودہ سپاہی تھا اُس کی مدد کیلئے دہلی سے تمر خاں شمسی اور ملک تاج الدین پسر قتلغ خاں شمسی کو فوجیں دے کر روانہ کیا لیکن ان سب کو طغرل کے مقابلہ پر شکست ہوئی۔ کچھ فوج کو رشوت دے کر دشمن نے اپنی طرف ملا لیا باقی فوج کو واپسی کے وقت راستے میں ہندو رؤساء نے ٹھکانے لگا لیا۔ بلبن کو اِس ہزیمت کا اتنا ملال تھا کہ درباری اس کے غم و غصّہ کی وجہ سے اس سے بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ امین خاں کو اُس نے پھانسی دے کر اودھیا دروازہ پر لٹکا دیا۔

دوسری مہم ملک ترغی کے ماتحت روانہ کی گئی لیکن اُس کا حشر بھی امین خاں کی طرح ہوا۔ اِس شکست نے بادشاہ کی آتشِ غضب کو گویا جہالت کا تیل چھڑک کر اور بھی بھڑکا دیا اور ستر سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود اس مرتبہ فوج کی سپہ سالاری اُس نے خود اپنے ہاتھ میں لی۔ اُس نے نہ درازی سفر کی پرواہ کی اور نہ موسم کی خرابی کو خاطر میں لایا بلکہ دہلی سے جو نکلا تو فیض آباد (اودھیا) تک منزل بمنزل برابر کوچ کرتا چلا گیا۔ اور پھر یہاں چند روز ٹھہر کر جو روانہ ہوا تو سخت بارشوں کو بھی خاطر میں نہ لایا اور صرف

ع۱:۔ دہلی سے پہلے بلبن سامانہ و سنام کی طرف گیا اور یہاں سے بغرا خاں کو اپنے ساتھ لیا۔ سامانہ و سنام کا حاکم ملک سونیج کو مقرر کیا اور اس کو ہدایت کی شہزادہ محمّد کی نگرانی میں کام کرے۔ یہیں سے ایک فرمانِ نیابت ملک الامراء فخر الدین کوتوال دہلی کو بھیجا اور مرکز کے تمام اُمور کا اُس کو مختار کل بنا دیا (برنی ص۸۵)۔

فاصلہ پر ایک تالاب کے متصل پڑاؤ ڈالے پڑا ہوا تھا۔ دونوں سرداروں نے اپنے
افسر اعلیٰ ہیکترس کو اطلاع دی لیکن شاہی لشکر کے وہاں پہونچنے تک طغرل کے بھاگ
جانے کا اندیشہ تھا اس لئے یہی چھوٹا سا گروہ جان پر کھیل کر طغرل کی لشکرگاہ میں گھس
گیا اور طغرل طغرل پکارتا ہوا اس کے شاہی خیمہ تک پہونچ گیا۔ یہ ناگہانی شور و غوغا
سن کر طغرل کے اوسان جاتے رہے اور وہ کمال بدحواسی کے عالم میں گھوڑے کی ننگی
پیٹھ پر سوار ہو کر بھاگ نکلا لیکن ملک محمد تیرانداز نے اس کو اپنے تیر کا نشانہ بنا لیا اور
ملک مقدر نے پھرتی سے اس کا سر کاٹ کر اپنے دامن میں چھپا لیا اور وہیں تالاب کے
کنارے بیٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگا تاکہ طغرل کے سپاہیوں کو اس کی اطلاع نہ ہو۔
پیچھے سے طغرل کے باڈی گارڈ اس کو ڈھونڈھتے اور "خداوند عالم، خداوند عالم" پکارتے
ہوئے آپہنچے لیکن اسی اثناء میں شاہی ہراول کی فوج نے آکر طغرل کے تمام ساتھیوں کو
گھیر لیا۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو فرار ہو سکے یا لڑائی میں کام آئے ورنہ سب کے سب
گرفتار کر لئے گئے۔ بلبن انھیں لیکر لکھنوتی واپس آیا یہاں پہونچ کر دہلی کے وہ سردار یا
سپاہی جو پچھلی لڑائیوں میں طغرل کے ساتھ مل گئے تھے علیحدہ کر دئے گئے کہ انھیں دہلی
پہونچ کر سزا دی جاوے گی۔ لیکن اہل بنگال میں سے جس شخص نے طغرل کے اعلان
خودمختاری کے بعد خفیف سی بھی رفاقت ظاہر کی تھی انھیں بادشاہ نے چن چن کر
گرفتار کیا اور سر عام سولی پر لٹکوا دیا۔ مورخ برنی جس کا دادا سپہ سالار حسام الدین
جو لکھنوتی کا کوتوال تھا اس مہم میں بادشاہ کے ہمرکاب تھا بیان کرتا ہے کہ لکھنوتی کے
بڑے بازار میں جو کم و بیش ایک میل لمبا تھا دو رویہ سولیاں نصب کر دی گئی تھیں اور آٹھ
پہر دو تین دن تک صبا آدمی رونا نہ بڑھا۔ [illegible] جا تے تھے یہاں تک کہ ایک قلندر
"سلطان درویش" نامی کو بھی نہیں چھوڑا اس کا طغرل سے صرف اتنا تعلق تھا کہ
ایک مرتبہ اسے طغرل نے تین من سونا اس لئے دیا تھا کہ وہ قلندروں کی جماعت کے

بجائے لوہے کے سونے کے آلات تیار کرا دے!![1]

بلبن کی اِس سخت تادیب وسیاست کے سلسلہ میں جو بات یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اُس نے اپنے چھوٹے بیٹے بغرا خاں (محمود) سے جسے وہ آئندہ لکھنوتی کا وائسرائے بنانا چاہتا تھا دریافت کیا کہ اے محمود تو نے بھی میری سزا دیکھی؟ جب اُس نے عرض کیا کہ دیکھی تو بادشاہ نے فرمایا کہ "یاد رکھو ہند و سندھ، گجرات و مالوہ یا لکھنوتی و سنارگانوں کا کوئی حاکم جب کبھی بادشاہ دہلی سے بغاوت کرے گا تو اس کی اور اُس کے عزیز و اقربا اور اعوان و انصار کی یہی سزا ہوگی جو آج طغرل اور اس کے رفقا کی ہوئی ہے"[2] اس کے علاوہ دہلی روانہ ہوتے وقت جو چند ہدایتیں[3] بطور دستور العمل تحریر کرا کے بیٹے کے حوالہ کیں ان میں پہلی ہدایت یہ تھی کہ "چوں اقلیم لکھنوتی بدو مفوض شد فرمانبردار بادشاہ دہلی باشد و با او مکابرہ نکند و یکبار نگسلد خواہ بادشاہ دہلی خویش و برادر او باشد و خواہ بیگانہ وغیرہ ...... زیراکہ لکھنوتی با آنکہ ملکی دور و دراز است از مضافات دہلی است"[4] یعنی جب اقلیم لکھنوتی اُسے ملے تو وہ ہمیشہ بادشاہ دہلی کا فرماں بردار رہے اور اس سے روگردانی نہ کرے خواہ بادشاہ دہلی کوئی بیگانہ آدمی ہو یا اُس کا کوئی خویش و برادر .... کیونکہ لکھنوتی کا ملک کتنے ہی بعید فاصلے پر سہی مضافات دہلی میں داخل ہے۔

بنگال سے واپسی

غرضکہ بہت سے پند و نصائح کے بعد بغرا خاں کو پیار کیا اور روتے ہوئے اس کو رخصت کیا۔ بغرا خاں لکھنوتی کی جانب چلا گیا

---

[1] ضیائے برنی ص ۹۲ و ۹۱

[2] ضیائے برنی ص ۹۳

[3] پند و نصائح کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از ضیائے برنی ص ۹۵ تا ص ۱۰۶

[4] ضیائے برنی ص ۹۵

اور خود کوچ در کوچ دہلی کی طرف چلا آیا۔ دریائے سرجو کے کنارے پہونچکر چند روز قیام کیا۔ وہ جہاں جہاں سے گذرا راستہ میں لوگوں نے اس کا بڑا شاندار استقبال کیا اور خوشیاں منائیں اور جب وہ بدایوں سے گذر کر گنور[1] کے نواح میں داخل ہوا تو شہر دہلی کے جملہ اکابر و خوانین دریائے گنگا کے کنارے اُس کے استقبال کو موجود تھے۔ سب نے حسب حیثیت نذرانے پیش کئے اور انعام میں خلعت[2] پائے۔ دہلی پہونچکر ہر گھر میں خوشی منائی گئی کیونکہ اہالیان شہر اپنے اپنے اُن عزیزوں سے جو بادشاہ کے ہمراہ مہم پر بنگالہ گئے تھے اور جن کے واپسی سے وہ ناامید ہو چکے تھے اب ۳ سال کے بعد انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس طرح یہ مہم ۱۲۸۳ء میں جا کر ختم ہوئی۔

بادشاہ نے پایۂ تخت میں مراجعت کے بعد قیدیوں کو قید سے آزاد کیا۔ بقایا گان کی معافی کا عام اعلان کرایا اور بہت کچھ صدقات غرباء میں تقسیم کرائے۔ علماء و مشائخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُس نے ہر ایک کو تحائف پیش کئے اور کئی روز تک بھوکوں کو کھانا کھلایا۔ جشن کے مراسم سے فراغت پا چکنے کے بعد اُس نے فرمان جاری کیا کہ بدایوں دروازے سے لیکر تالپت تک دورویہ سولیاں گڑوا دیجائیں تاکہ اُن قیدیوں کو جن کو وہ اپنے ساتھ لکھنوتی سے لایا تھا لوگوں کو عبرت دلانے کے لئے پھانسی دلوائے۔ ان قیدیوں میں سے اکثر صاحب اہل و عیال تھے اور اکثر کے بال بچے دہلی ہی میں تھے انھوں نے جا کر قاضی لشکر کو اپنا شفیع بنایا۔ قاضی

---

[1]: گنور ضلع بدایوں کا ایک مشہور قصبہ ہے اور آج کل تحصیل گنور کا صدر مقام ہے۔ بدایوں سے بجانب گوشہ شمال و مغرب ۴۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

[2]: چونکہ امیر الامراء فخر الدین کوتوال شہر نے نیابت کے فرائض نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دئے تھے اس لئے بادشاہ نے اپنا پیراہن خاص اس کو عنایت فرمایا اور لکھنوتی ہی سے فرمان جاری کیا کہ آئندہ مراسلات میں اس کو برادر ملک الامراء تحریر کیا جائے۔ یہ وہ عزت افزائی تھی کہ جس پر ہر ایک کو رشک ہوتا تھا (مؤلف)۔

لشکر نے جو نہایت شریف اور پاک باطن بزرگ تھے سلطان کے سامنے جاکر ملزموں کی موثر الفاظ میں وکالت کی۔ قاضی موصوف کی باتوں سے بادشاہ بہت متاثر ہوا اور پھانسی کی سزا کو دوسری نرم سزاؤں سے بدل دیا۔ ملزموں میں سے اکثر کو معاف کردیا جو ذرا کچھ اہمیت رکھتے تھے ان کو ایک مدت معینہ کے لئے قریب کے قصبات میں جلا وطن کردیا۔ جو ملزم شہر دہلی کے با اثر لوگوں میں تھے اُن کو کچھ عرصہ کے لئے قید کردیا۔ بقیہ بڑے بڑے باغی عمال و عہدیداروں کو بھینسوں پر چڑھا کر شہر میں تشہیر کرایا۔

آخری ایام حکومت و موت

فتح کی تہنیت کے لئے جیسے جیسے طغرل پر کامیابی کی خبر مشتہر ہوتی گئی دور و نزدیک سے لوگ بادشاہ کی خدمت میں آتے رہے چنانچہ ملتان سے شہزادہ محمد بھی جس کو سلطان جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا دہلی حاضر ہوا اور گذشتہ سو سال کا جمع کردہ مال و اسباب شاہی کار خانجات میں داخل کیا۔ بادشاہ نے کچھ عرصہ اس کو اپنی خدمت میں رکھا اس کے بعد بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ ملتان رخصت کیا۔ وہاں پہونچکر تھوڑے ہی دنوں کے بعد اُسے وہ حادثہ پیش آیا جس کا پچھلے صفحات میں ذکر کیا جاچکا ہے۔

شہزادہ محمد کی شہادت ایک ایسا حادثہ جانکاہ تھا جس کا ہر جگہ سوگ منایا گیا سلطان پر اس کا سب سے زیادہ اثر ہوا۔ ولیعہد سلطنت کی موت نے اس کو از خود رفتہ بنادیا لیکن دربار کے اوقات میں اُس کا صبر و استقلال اُس کے غم کے جذبات کو ابھرنے نہیں دیتا تھا وہ لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ اس پر شہزادہ کی غیر متوقع موت کا کچھ بھی اثر نہیں مگر محل کے اندر پہونچکر کپڑے پھاڑنا، سر پر خاک ڈالنا اور فرط غم سے بیہوش ہو جانا اس کے لئے ایک معمولی سی بات ہو کر رہ گئی۔ اس پر امیر خسرو کے مرثیہ نے اور اضافہ کردیا۔ مغلوں کی قید سے رہائی پانے کے بعد جب پہلی مرتبہ مرثیہ کو دربار میں سنایا تو کوئی درباری ایسا نہ تھا جو زار و قطار روتا نہ ہو بادشاہ روتے روتے

بیدم ہوگیا۔ آخر کار اسی غم نے اس کی صحتِ جسمانی کو اندر سے گھلا گھلا کر نہایت ابتر کر دیا۔
جب بادشاہ کی صحت جواب دینے لگی تو اس نے بنگال سے بغرا خاں کو طلب کیا اور
اس کو دربار میں رہنے کا حکم دیا وہ دو تین مہینے بادشاہ کی خدمت میں رہا اس عرصہ
میں بادشاہ کی طبیعت بھی کچھ سنبھل گئی۔ یہ دیکھ کر کہ اب اس کے دربار میں حاضر رہنے کی
چنداں ضرورت نہیں۔ اور پھر ادھر بنگال کی یاد آئی اس لئے ایک دن بادشاہ کی بلا اجازت
شکار کے بہانے سے بنگال کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بادشاہ پھر بیمار پڑ گیا۔
اور جب مرض میں شدت پیدا ہوئی تو اس نے انتقال سے تین دن پہلے ملک الامراء کوتوال
دہلی اور وزیر اعظم حضرت خواجہ حسین بصری نیز دیگر مقربِ درگاہ ارکین سلطنت کو مجتمع کر کے
وصیت کی کہ شہزادہ محمد کے بیٹے کیخسرو کو آئندہ تخت حکومت ملے مگر اس شہزادے سے
غالباً محل کے ملازمین خوش نہ تھے اور بنا بر انھیں کی مخالفت سے ارکین سلطنت نے
اسے اپنے باپ کی جگہ ملتان روانہ کر کے کیقباد کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔
سلطان بلبن کی موت ایک ایسا حادثہ تھا جسے لوگ ایک عرصہ تک نہیں بھلا سکے
اُمراء و ارکین سلطنت چالیس دن تک فرش پر سوئے اور امیر الامراء کوتوال دہلی جس
کو بلبن سے خصوصی تعلق تھا چھ مہینے تک فرش پر سویا۔ ایصالِ ثواب کی خاطر لوگوں نے
ایک عرصہ تک خیرات و صدقات کا سلسلہ جاری رکھا۔

بلبن کی اولادِ ذکور میں خان شہید اور بغرا خاں کا تذکرہ کیا جا چکا ہے ان کے
علاوہ اولادِ اناث میں ایک لڑکی موسومہ "بی بی ہزیرہ" تھیں جو حضرت خواجہ فرید الدین
گنج شکر ؒ کو منسوب تھیں ان سے چھ لڑکے اور ۳ لڑکیاں ہوئیں۔ خان شہید کے ایک
لڑکا کیخسرو تھا اور بغرا خاں کے تین لڑکے معز الدین کیقباد، کیکاؤس اور شمس الدین فیروز
تھے جن میں اوّل الذکر دہلی کا شہنشاہ ہوا اور آخر الذکر بنگالہ کا حاکم۔

ع۱ ۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۳۱۰

فصل سوم

(۱) سلطان معزالدین کیقباد جنوری ۱۲۸۷ء تا ۱۳ جون ۱۲۹۰ء

بلبن کے انتقال کے بعد کیقباد سریر آرائے سلطنت ہوا۔ یہ ۱۷۔ اٹھارہ سال کا نہایت خوش خلق و پاکیزہ جمال شہزادہ تھا۔ اپنے دادا کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت پائی تھی لوگوں کی اس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن نااہل مصاحبوں کی صحبت نے اسے خراب کر دیا۔ اور اخلاق و شرافت کے تمام آداب کو بالائے طاق رکھ کر خوب گل کھیلے اور رنگ رلیاں منائیں۔ اس کی عیاشی نے نہ صرف خود اس کی صحت اور حکومت برباد کر دی بلکہ پایۂ تخت دہلی میں عام بد اخلاقی پھیلا دی کیونکہ بادشاہ کا عیش و عشرت کی طرف میلان طبع دیکھکر ڈوم، ڈھاری اور آبرو باختہ طوائفیں، بھانڈ اور مسخرے ہزاروں کی تعداد میں دہلی پہونچ گئے اور الناس علیٰ دین ملوکھم کے بموجب خواص و عوام سب اسی رنگ میں رنگ گئے۔ غرضکہ شاہد و شراب کی کثرت نے سارے شہر کو خرابات بنا دیا۔ ان رنگ رلیوں میں جنکی برنی نے نہایت واضح تصویر کھینچی ہے کام کا ہوش نہ بادشاہ کو تھا اور نہ درباریوں کو۔ سلطنت کی باگ ملک نظام الدین کے ہاتھ میں آگئی تھی جو ظاہرا "دادبک" ورنہ درحقیقت "نائب ملک" یعنی مختار کار بن گیا تھا اور بادشاہ کی یہ غفلت و مدہوشی دیکھ کر خود تخت شاہی حاصل کرنے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔

نظام الدین نے بادشاہ کو بہکایا کہ کیخسرو اس کا شریک سلطنت ہے جب تک وہ زندہ ہے اس وقت تک اس کی حکومت و بادشاہت کو استحکام حاصل نہیں ہوسکتا چنانچہ ایک بہانہ سے اس کو ملتان سے بلایا گیا جب وہ رہتک تک آگیا تو حالت نشہ میں بادشاہ سے اس کے قتل کا فرمان حاصل کر کے وہیں قتل کرا دیا۔ شہزادہ کیخسرو کے

قتل سے تمام اُمرا یلبنی خالف ہو گئے اور انھوں نے سلطنت کے کاموں میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا۔ صرف ایک وزیر ممالک خواجہ خطیر کا اثر بادشاہ پر باقی تھا اور وہ اس کو کبھی کبھی زمانہ کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ اس کو بھی کسی بہانہ سے گدھے پر چڑھا کر سارے شہر میں تشہیر کرایا۔ اس طرح وہ بادشاہ پر روز بروز قابو پاتا چلا گیا۔ اندر حرم سرا میں نظام الدین کی بیوی جو ملک الامرا فخر الدین کوتوال شہر کی لڑکی تھی اور جس کو سلطان ماں کہہ کر پکارتا تھا تمام کارخانہ جات شاہی پر حاوی تھی اس طرح اندر و باہر ہر طرف نظام الدین کا طوطی بول رہا تھا۔

اب اُس نے ایک ایک کر کے اُمرا سلطنت کی خبر لینا شروع کی۔ سب سے پہلے نو مسلم مغل اُمرا کی جماعت کو جو باہم متحد و متفق تھے دعوت کے بہانہ کوشک شاہی میں بلا کر قتل کرایا۔ اس کے بعد ملتان کے عامل ملک شاہک اور برن کے حاکم ملک توزکی کو جو کہ عرضِ ممالک کا عہدہ رکھتا تھا بہانے تراش کر تہ تیغ کیا۔ جب نوبت یہاں تک پہونچی تو ملک الامرا فخر الدین کوتوال نے اس کو بُلا کر اُن خطرات سے آگاہ کیا جو ارکانِ دولت کے قتل سے پیدا ہو سکتے ہیں اور اس کو نصیحت کی کہ طلبِ ملک کے سودائے خام کو اپنے دماغ سے نکال دے اور اگر ایسا نہیں کرے گا تو پھر "حیات را خیر باد کن و خطیرہ خود را عمارت فرما"[1] یعنی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو لے اور اپنا مقبرہ اپنے ہاتھ سے تعمیر کرے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اُس پر اپنے شفیق و مہربان خسر کی نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اپنے کام میں برابر لگا رہا۔ بغرا خاں کو اپنے بیٹے کی بے راہ روی کی تمام خبریں پہونچ رہی تھیں اُس نے سلطان ناصر الدین کا لقب اختیار کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور خطبہ و سکّہ اپنے نام کا جاری کیا۔ اپنے بیٹے کو راہ راست پر لانے کے لئے پند و نصائح سے لبریز مکتوبات تحریر کئے لیکن کیقباد کو چونکہ مستی جوانی، مستی پادشاہی، مستی ہوا پرستی، اور مستی

---

[1] ضیائے برنی ص ۱۳۸

ہوا شاہی تخت کے قریب پہونچا تو کیقباد سے باپ کی ذلت دیکھی نہیں جاسکی۔ وہ فوراً تخت سے اُتر کر باپ کے قدموں پر جا کر گر گیا۔ باپ نے اس کو اُٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور اس کے آنکھوں اور رخساروں کو بوسہ دیا۔ یہ منظر نہایت جانگداز تھا ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو جاری تھے اور سب زار و قطار رو رہے تھے۔ کچھ عرصہ تک مجمع پر خاموشی طاری رہی اس کے بعد دونوں پر سیم و زر و جواہرات نچھاور کئے گئے اور شعرائ نے قصائد پڑھے۔ جب تک یہ کارروائی جاری رہی کیقباد نہایت مودبانہ طریقہ سے دو زانو ہو کر باپ کے سامنے تخت پر بیٹھا رہا۔ بغرا خاں کی نشست کیقباد کے دائیں جانب تھی اس کے بعد دونوں اُٹھ کر خاص کمرہ میں چلے گئے جہاں بہت دیر تک دونوں میں گفتگو ہوتی رہی۔ اس طرح باپ بیٹوں میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔

ٹ۱:۔ حضرت امیر خسرو نے باپ بیٹے کے اتحاد و مصالحت پر ایک قصیدہ لکھا ہے جس کے چند شعر یہ ہیں۔

زہے ملک خوش چو دو سلطاں یکے شد	زہے عہد خوش چوں دو پیماں یکے شد
پسر بادشاہے، پدر نیز سلطاں	کنوں ملک بیں چوں دو سلطاں یکے شد
زہے جہانداری و پادشاہی	جہاں را دو شاہِ جہاناں یکے شد
یکے ناصر عہدِ محمود سلطاں	کہ فرمانش در چار ارکاں یکے شد
دگر شہ معز جہاں کیقباد ے	کہ در ضبطش ایران توراں یکے شد

بعد کو کیقباد کی خواہش سے حضرت امیر نے چھ مہینہ کے مدت میں "قران السعدین" لکھی جس میں باپ بیٹے کی مراسلت و ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے اُس وقت امیر خسرو کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور سنہ ہجری ۶۸۸ تھا اس لحاظ سے ملاقات ۶۸۰ ہجری کے شروع میں ہوئی ہوگی۔ اپنی عمر اور مثنوی کے سنہ تحریر کے بارے میں لکھا ہے ؎

ساختہ گشت از روش خامہ	از پس شش ماہ چنیں نامہ
در رمضاں شد بسعادت تمام	یافت قران نامہ سعدین نام

(باقی مضمون صفحہ ۳۱۸ پر)

و پریشانی کے وقت رعایا کی مدد نہ کرسکے اور رعایا کو بھوک، پیاس سے ہلاک ہو جانے دے بلکہ از روئے انصاف بادشاہ وہ ہے کہ "ایک آدمی در پادشاہی او گرسنہ و برہنہ نخسپد" یعنی اُس کی مملکت میں کوئی شخص بھوکا اور ننگا نہ سونے پائے (نہ رہنے پائے)۔"

اس ملاقات کے بعد جب بغرا خاں اپنے قیام گاہ کو واپس آنے لگا تو کیقباد نے اس سے درخواست کی کہ دہلی میں چونکہ کوئی ایسا تجربہ کار و دانا وابستگان دولت میں نہیں ہے جو مجھ کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے پند و نصیحت کرے اس لئے اگر آپ از راہِ شفقت پدری چند نصیحتیں کہ جن میں دین و دنیا دونوں کی بھلائی مضمر ہو فرمائیں تو بہتر ہے۔ بغرا خاں نے کہا کہ لکھنوتی سے چل کر یہاں تک آنے کا میرا مقصد بھی یہی تھا کہ کچھ نصیحتیں کروں۔ اب آخری ملاقات کے وقت مجھے جو کچھ کہنا ہے تم سے کہوں گا۔ چنانچہ رخصتی ملاقات کے وقت سلطان ناصر الدین بغرا خاں نے نظام الدین و قوام الدین کی موجودگی میں کیقباد سے کہا "اے جان پدر! دنیا کے اندر کوئی باپ ایسا نہیں ملے گا جو یہ نہ چاہتا ہو کہ اس کا بیٹا اُس سے زیادہ لائق و فائق نہ ہو۔ مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ ارا کین سلطنت نے تمھیں بادشاہ منتخب کیا ہے تو میں سمجھا کہ لکھنوتی کے ساتھ ساتھ دہلی کی حکومت بھی میرے قبضہ میں آگئی اسلئے تیری قوت پادشاہی کے بھروسہ پر بنگالہ کے اندر اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا۔"

"لیکن دو سال سے برابر تمھارے عیش و عشرت اور غفلت و بے خبری کی اطلاعات نے مجھے حیران کر دیا۔ افسوس کہ تم نے پادشاہت کی قدر نہ جانی اگر اس کی حقیقت و قدر

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۱۹: دس سوار دں کا مالک سرخیل کہلاتا ہے اور دس سرخیل کا حاکم سپہ سالار ہوتا ہے دس سپہ سالار ایک امیر کے ماتحت ہوتے ہیں۔ دس امیر ایک ملک کے اور دس ملک کا حاکم اعلیٰ خان ہوتا ہے۔ اس طرح ایک خان کے ماتحت ایک لاکھ کی جمعیت ہوئی۔

ع ۱۔ ضیائے برنی ص ۱۴۷۔

رعیت سے واقف ہوتے تو اتنی غفلت نہ برتتے۔ اے فرزند من! تمہارے دادا مرحوم و مغفور مجھ سے کہا کرتے تھے کہ جہانداری کے لئے پانچ چیزوں کی ضرورت ہے اوّل عدل و احسان دوم رعیت کی پرورش اور جاہ و حشم کا استقامت۔ سوم خزانوں کا جمع کرنا۔ چہارم وابستگانِ دولت کے حقوق کی نگہداشت اور اُن کی پرورش۔ پنجم دور و نزدیک کے تمام اہل مملکت سے باخبر رہنا لیکن ان پانچ چیزوں میں سے میں تم کو کسی ایک پر بھی عامل نہیں پاتا بلکہ ان دو سال کے اندر تم میں بعض بُری عادتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ ان کو ترک کرکے اُمورِ سلطنت کی طرف متوجہ ہو کیونکہ آئندہ تمام خوشیوں کا دار و مدار انھیں کی سرانجام دہی پر منحصر ہے۔ اب میں تم سے چند باتیں کہہ کر رخصت ہوتا ہوں جو سراسر تمہارے فائدے کے لئے ہیں۔ ان میں سے پہلی بات یہ کہنا ہے کہ بادشاہت کو عزیز رکھو لیکن اپنی جان کو بادشاہت سے بھی زائد عزیز جانو اس لئے اپنی جان کو سلامت رکھنے کے لئے عیش و طرب سے باز آؤ اور بُری عادتوں کو ترک کردو۔ دوسری بات یہ ہے کہ ملوک و اُمراء کے قتل سے احتراز کرو ورنہ لوگوں کے دلوں سے تمہارا اعتماد جاتا رہے گا۔ دشمنوں کو بھی اپنے احسان و کرم اور عقل و حکمت کے زور سے دوست بنانے کی کوشش کرو اور اپنائے سلطنت کے لئے ان دو[1] کے علاوہ دو اور تجربہ کار وزیر مقرر کرو اور انھیں الگ الگ کام[2] تفویض کرکے اُن پر اعتماد کرو۔ تیسری بات یہ ہے کہ جب تم چاروں ارکانِ سلطنت کا انتخاب کرلو تو ان میں سے کسی ایک کے ساتھ اتنی خصوصیت نہ برتو کہ بقیہ تین کو تم سے بدگمانی پیدا ہو اس لئے جو کام کرو وہ چاروں

---

[1] ان دو سے مراد نظام الدین و قوام الدین ہیں جو کہ اس مخصوص منصب پر موجود تھے۔

[2] چار وزیر اور اُن کے چار کام (۱) وزیر ممالک (۲) وزیر عمل و رسائل یعنی پیغامات (۳) دیوان عرض یا وزیر عرض ممالک (۴) وزیر انشاء یعنی پرائیویٹ سکریٹری۔ برنی کہتا ہے کہ ملک نظام الدین کے قتل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کیقباد نے عرض ممالک کا عہدہ خالی چھوڑ رکھا تھا ورنہ بغرا خاں مشورہ نہ دیتا۔

کی موجودگی میں اور اُن سب کے صلاح و مشورہ سے۔ چوتھی بات جو تم سے کہنا ہے وہ
یہ ہے کہ روزہ و نماز کی پابندی کرو بہت سی آفات سے نجات پا جاؤ گے۔ مجھے معلوم ہوا ہے
کہ تم نے نماز ترک کر دی ہے اور بعض بد دیانت دنیا دار علماء نے تمھیں ماہ رمضان میں
کھانے کی اجازت دیدی ہے۔ کیا تم بھول گئے تمھارے جد امجد جن کی تم خدمت میں
رہے ہو کتنے کبیر سن تھے لیکن اس کے باوجود انھیں روزہ و نماز اور فرض و نوافل میں
کس درجہ انہماک تھا۔ وہ اگر کہیں سن لیتے تھے کہ ہم دونوں بھائی (سلطان شہید اور بغرا خاں)
نماز کے وقت سوتے رہے اور نماز باجماعت ادا نہیں کی تو ایک ایک مہینہ تک ہم سے
ناراض رہتے تھے اور کلام نہیں کرتے تھے۔ میں نے بارہا بزرگوں کی زبان سے سنا ہے
کہ جو ماہ رمضان کے روزے نہیں رکھتا وہ جوان موت مرتا ہے اور جو نماز نہیں پڑھتا
اس کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھنا چاہیئے اس لئے بہر صورت تمھیں روزہ و نماز کی پابندی
کرنا چاہیئے اور اس کے لئے بہتر ہے کہ تم کسی دیندار، خدا طلب بزرگ کو اپنے پاس
رکھو تاکہ تمھیں اچھے کاموں کی طرف رغبت ہو" آخری بات الوداعی رخصت کے [illegible]
بیٹے کو گلے لگاتے وقت چپکے سے کہی کہ نظام الدین کو جلد از جلد اپنے سے دور کرو ورنہ
وہ موقع پاتے ہی تمھیں تخت سے اُتار دیگا۔

اس ملاقات کا اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ نوجوان بادشاہ نظام الدین سے بدگمان
ہو گیا ورنہ باپ کے سمجھانے سے زہد و تقویٰ اختیار کرنے کی جو قسمیں اس نے کھائی
تھیں وہ چند ہی روز بعد توڑ دیں اور پھر اپنی پرانی روش پر آ گیا اس نے دہلی آکر
نظام الدین کو ملتان کا گورنر بنایا لیکن نظام الدین کچھ نہ کچھ بہانہ کر کے اپنی روانگی [illegible]
رہا اس پر کیقباد نے اس کو زہر دیکر مروا ڈالا۔ برنی نے نظام الدین کی [illegible]
کے حصول کے لئے) حرص و آز پر مذمت کرتے ہوئے اس کی انتہائی [illegible]
ہے اور یہ صحیح بھی ہے کیونکہ اس کے مرتے ہی تمام معاملات میں ابتری پیدا [illegible]

(تاریخ [illegible] ٢٢٢)

شروع ہوگئی۔

نوجوان بادشاہ نے عہدہ جات کو از سر نو اُمراء میں تقسیم کیا۔ ملک ایتمر سرخہ کو وکیلدر کا عہدہ دیا اور ملک ایتمر کچھن کو "باربک" بنایا۔ یہ دونوں ترک نژاد بلبنی امیر تھے۔ قوام الدین کو غالباً بدستور دیوان انشاء کے عہدہ پر قائم رکھا۔ اور سامانہ سے ملک جلال الدین فیروز خلجی کو بلا کر اقطاع برن کا گورنر مقرر کیا اور "عرض ممالک" کا عہدہ اور سیاست خاں کا خطاب دیا۔

جلال الدین خلجی کا تقرر ترک امیروں کو برا معلوم ہوا کیونکہ وہ خلجی قبیلے کے زور پکڑنے سے گھبراتے تھے اور اُن کی قوت کو سلطنت کے لئے مخدوش سمجھتے تھے

اسی دوران میں بادشاہ پر کثرت شراب نوشی کی وجہ سے فالج کا دورہ پڑا اور وہ صاحب فراش ہوگیا اس پر ترک اُمراء نے مشورہ کر کے اس کو معزول کر کے کیلوکھڑی کے محل میں نظر بند کر دیا اور اُس کے شیر خوار بچے شمس الدین کیکاؤس کی بادشاہت کا ۶۸۹ھ / ۱۲۸۹ء میں اعلان کر دیا۔ اسی ضمن میں انھوں نے چاہا کہ ان عہدہ داروں کو بھی جو خالص ترک نہ تھے مناصب جلیلہ سے الگ کر دیا جائے۔ اس فہرست میں سب سے اوپر "عرض ممالک" جلال الدین خلجی کا نام تھا۔ اس سازش کی جلال الدین کو بروقت اطلاع مل گئی۔

جلال الدین نہایت آزمودہ کار [illegible] تھا اس کی تمام عمر مغلوں سے نبرد آزمائی میں گذری تھی اس کے بیٹوں کی شجاعت [illegible] مشہور تھی۔ شہر کے باہر بہار پور میں اس کے ماتحت پچاس ہزار سے زیادہ جنگجو سوار [illegible] آن کا ایک دستہ لیکر جلال الدین کے بیٹے ایک دن اچانک شہر میں گھس [illegible] کو چھین کر لے گئے۔ اُن کا تعاقب کرتے ہوئے ایتمر سرخہ مارا گیا اور دوسرے ترک [illegible] جلال الدین نے جبکہ وہ مصالحت کی فکر

فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۲۔ ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی [illegible] عرض یا عرض ممالک فوج کے مہیا اور مرتب کرنے والے عہدہ دار کو کہتے تھے۔ [illegible] حضرت امیر خسرو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے شمس الدین نے صرف ۳ ماہ حکومت کی۔ (باقی مضمون صفحہ ۳۲۳ پر)

سے آیا ہوا تھا قتل کرا دیا۔ ادھر خلجیوں کے اشارے سے ایک شخص نے جس کے باپ کو کیقباد نے قتل کرا دیا تھا محل میں گھس کر مفلوج و معزول بادشاہ کو جو بستر مرگ پر دم توڑ رہا تھا بچھونے میں دم گھوٹ کر اور لپیٹ کر لاش کو جمنا کی ریتی میں پھینک دیا۔ شہر کے لوگوں کو خلجیوں کی یہ زبردستی نہایت ناگوار گذری اور اُن کا بہت بڑا گروہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا لیکن کوتوال شہر نے بہ مشکل سمجھا بجھا کر بلوائیوں کو منتشر کر دیا۔ اکثریت سے عہدیداروں نے بہارپور کے پڑاؤ پر جا کر جلال الدین کی اطاعت قبول کر لی۔ اس طرح دہلی کی سلطنت ترکوں کے قبضہ سے نکل کر خلجیوں کے قبضہ میں آ گئی۔ خلجی بھی غلام سلاطین کی طرح ترکی النسل ہیں۔ لیکن ان کو افغانستان میں علاقہ گرمسیر میں ایک عرصہ تک رہنے کی وجہ سے بعض مورخین نے افغانی شمار کیا ہے۔ بلکہ انھیں افغانوں کی قوم غلزئی قرار دیا ہے۔ خلجی قبیلہ کے لوگ شہاب الدین غوری کے زمانے سے ہندوستان میں عزت کی نگاہ سے [illegible] دیکھے جاتے تھے۔ اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ان کی شجاعت و بسالت [illegible] سردار [illegible] قائل تھے۔ اس قبیلہ کے ایک شخص اختیار الدین بن بختیار نے بہار و بنگال فتح کر کے سلطنت دہلی کو وسیع کیا تھا۔ گو ۱۲۹۰ء تک بنگال میں اُن کی قوت و زور کا خاتمہ ہو چکا تھا لیکن خاص مرکز سلطنت یعنی دہلی میں اُن کا اب تک زور و اقتدار قائم تھا۔

فصل چہارم

(۱) سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی [illegible] ۱۲۹۰ء تا ۱۹ جولائی ۱۲۹۶ء

جلال الدین نے ۷۰ سال کی عمر میں تخت پر قدم رکھا۔ اپنی عمر کا بیشتر حصہ مغلوں کے

دو ماہیہ دادوزاں [illegible] خواب [illegible] شمس الدین [illegible]

(مثنوی دول رانی قلمی کتب خانہ حبیب گنج [illegible] شمس الدین کیکاؤس کی مدت

حکومت "سہ ماہ و چند روز" تحریر کی [illegible] جلد اول صفحہ ۱۶۶

([illegible])

[illegible] صفحہ ۲۲۲

روکنے میں گذارا۔ یہ نہایت بہادر، صاف طبیعت اور خدا ترس آدمی تھا۔ میدان جنگ میں لڑتا تو دشمن کے کشتوں کے پشتے لگا دیتا۔ لیکن ویسے کسی کے چھوٹے کو دیکھتا تو گھبرا جاتا۔ رحم اور عفو کا مادّہ اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ دشمنوں کو ان پر احسانات کرکے اپنا بنا لیا اور خطاکاروں کو ہمیشہ معاف کر دیا۔ خلاف شرع کام سے بچتا تھا اور مسجد میں عام نمازیوں کی طرح نماز باجماعت ادا کرتا تھا۔ رفیق القلب بے حد تھا۔ جب کیلوکھڑی سے پہلی مرتبہ دہلی گیا اور بلبن کے کوشک سلطانی کی طرف بڑھا تو محل کے دروازے ہی پر گھوڑے سے اتر پڑا۔ بلبن کو یاد کرکے بہت رویا اور بہت دیر تک افسوس کرتا رہا۔

مؤلف طبقات اکبری نے اس واقعہ کو ذرا تفصیل سے درج کیا ہے جس سے سلطان کے تقویٰ و دینداری پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھا ہے: "احمد چپ نے پوچھا کہ یہ (کوشک لعل) محل آپ کا ہے اس لئے گھوڑے ۔۔۔ سے کیوں اتر پڑے۔ اس پر بادشاہ نے جواب دیا کہ یہ محل میرے ولی نعمت کا ہے اس کا احترام مجھ پر فرض ہے اور چونکہ یہ محل سلطان بلبن نے بادشاہ ہونے سے پہلے تعمیر کرایا تھا اس لئے یہ ان کی اولاد کی ملک ہے۔ اس میں قیام نہیں کر سکتا۔ یہ سن کر احمد چپ نے کہا کہ امور ملکداری میں اس قدر تقویٰ کی گنجائش نہیں ہے۔ سلطان نے برمحل جواب دیا 'من از برائے مصلحت ملک چند روزہ چگونہ از قواعد اسلام بیروں آیم و بر خلاف نفس الامر کارے کنم' یعنی چند روزہ بادشاہت کی مصلحت کی خاطر میں قواعد اسلام سے کیوں روگردانی کروں اور حقیقت الامر کے خلاف کوئی کام کیوں کروں۔ سہ

کجا عقل یا شرع فتویٰ دہد ــــ کہ اہل خرد دین بدنیا دہد[1]

---

[1] فٹ نوٹ صفحہ ۳۲۳ ۔ سلطان جلال الدین بن یغرش خلجی کا اصل نام ملک فیروز اور شائستہ خاں یا شائستی خاں لقب تھا (ملاحظہ ہو البدایونی ج اصفحہ ۱۶۶ نیز فتوح السلاطین صفحہ ۱۹۹)

[1] طبقات اکبری ۔۔۔ فرشتہ نے بھی انہیں الفاظ میں اس واقعہ کو مختصراً درج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فرشتہ صفحہ ۸۹

عہدہ جات کی تقسیم فیروز کے دربار کی حالت سلاطین غلامان کے دربار سے بہت زیادہ مختلف تھی۔ کیونکہ امرائے شمسی کا زور بلبن نے کم کر دیا تھا۔ سلطنت پر ترکی امراء کے یک طرفہ حقوق کا استحقاق ختم ہو چکا تھا۔ جلال الدین کے تخت نشین ہونے کے بعد ترکی امراء کا اختلاف نسلی امتیاز کی بنا پر کچھ دنوں ضرور قائم رہا جس کی وجہ سے جلال الدین کو اپنا دربار کیلو کھری[1] میں کچھ دنوں کے لئے جمانا پڑا لیکن یہ اختلاف عارضی تھا۔ جلال الدین کی نرمی نے سب کو رام کر لیا۔ اس نے عہد بلبنی کے معززین کو ان کے عہدوں پر قائم رکھا۔ سلطان بلبن کے بھتیجے ملک چھجو المخاطب بہ کشلی خان[2] کو کڑہ کا صوبیدار بنایا۔ ناصر الدین بغرا خاں کو بنگال کی حکومت پر بدستور قابض رہنے دیا۔ ایک دوسرے بلبنی امیر حاتم خاں[3] کو اودھ کا گورنر بنایا۔

سلطان کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑا محمد خاں المخاطب خان خاناں، دوسرا ارکلی خاں اور تیسرا قدر خاں۔ ان تینوں میں ارکلی خاں نہایت شہ زور، بہادر، قابل سپہ سالار تھا

---

[1] کیلو کھری۔ کیقباد نے جمنا کے کنارے (موجودہ ہمایوں بادشاہ کے مقبرہ کے جانب جنوب ایک میل کے فاصلہ پر) ایک عالی شان قصر تیار کیا جس کے گرد وہ ایک نیا شہر بسانا چاہتا تھا اس محل کا نام کیلو کھری رکھا نام امیر خسرو کا تجویز کیا ہوا ہے بادشاہ نے امیر خسرو سے فرمائش کی کہ محل کا نام ایسا تجویز کیا جائے جس میں اس کی بادشاہی کا اور اس کا ذکر بھی ہو اور خدا کا نام بھی آ جائے وہ نام ایسا ہو جس کو ہندو رعایا بھی سمجھ سکے کیلو کھری نام میں یہ سب باتیں آ جاتی ہیں لفظ "کے" میں کیقباد کا ذکر تھا اور "لوک" میں بادشاہی کا۔ اور ہری خدا کا نام ہے (رفتار ناصری ص [illegible])

[2] مختلف تاریخوں میں اس کے مختلف نام جو پانچ نام راقم الحروف کی نظر سے گذرے ہیں یہ ہیں کتلو خاں، کشلیخاں، کشلو خاں، علاء الدین چھجو اور ملک چھجو یہ بلبن کے زمانہ میں "بار بک" کے عہدہ پر فائز تھا۔ اس کی لڑکی سلطان کیقباد کو منسوب تھی۔ [illegible] نہایت [illegible] دلیر اور اہل [illegible] کا قدردان امیر تھا۔

[3] اصلی نام امیر علی سرجاندار کی وجہ سے حاتم خاں مشہور ہو گیا نہایت معتمد علیہ غلام اور شاعر تھا۔

بادشاہ نے اپنے بھائی یغرش خاں کو افواج شاہی کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا اور اپنے دوسرے بھائی شہاب الدین مسعود خلجی کے دونوں بیٹوں علاء الدین اور الماس بیگ (الغ خاں) سے اپنی لڑکیوں کی شادی کی۔ سلطان کا ہمشیر زادہ ملک احمد حبیب خلجی (ملک احمد چپ) بڑا عقلمند اور تجربہ کار شخص تھا۔ بادشاہ نے اس کو وزارت و نائبی کا مرتبہ عطا کیا تھا۔

بادشاہ کا حلم و خدا ترسی

(۱) کڑا اور اودھ کے ہندو روسا بہت زیادہ چالاک [illegible] تھے۔ وہ وہاں کے صوبیداروں کے دربار میں زیادہ دخیل تھے۔ جب سلطان [illegible] سلطان کیقباد اس نواح میں آئے تو انھوں نے نذرانے و تحفے دے دے کر اپنا رسوخ اور بھی بڑھا لیا تھا۔ اب جبکہ انقلاب سلطنت ہوا اور سلطان بلبن کے بھتیجا [illegible] اس نواح کے صوبیدار مقرر ہوئے تو اظہار وفاداری کے طور پر ملک چھجو کو غالباً انھوں نے بار بار توجہ دلائی کہ سلطنت دہلی کے اصلی وارث آپ ہیں۔ یہ باتیں ملک چھجو کو بالطبع اچھی معلوم ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کڑا اور اودھ کے دونوں صوبیدار مل گئے۔ ملک چھجو نے سلطان مغیث الدین کا لقب اختیار کر کے کڑہ میں تاج شاہی سر پر رکھا اور اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا۔ اپنے ساتھ ہندو سرداروں کا ایک ہجوم بے پناہ لے کر دہلی کی طرف [illegible] ہوا۔ جلال الدین بھی دہلی سے آگے بڑھا۔ بدایوں سے آگے دس بارہ کوس کے فصل پر ارکلی خاں کا ملک چھجو کے لشکر سے مقابلہ ہوا اس موقعہ پر برنی کے الفاظ یہ [illegible]

"ارکلی خاں [illegible] مقدمہ [illegible] لشکر ملک چھجو پیشتر آمد و در لشکر ملک چھجو راوتان و پائکان ہندستانی مانند مور و ملخ گرد آمدہ بود"(۱)

اس عبارت سے چھجو کی فوج کا اندازہ ہو سکتا ہے لیکن پہلے ہی حملے میں پوری فوج منتشر ہو کر بھاگ گئی۔ چھجو نے ایک ہندو مقدم کے ہاں پناہ لی جس نے اسے دو دن کے بعد

(۱) ضیاء الدین برنی صفحہ ۱۸۲ [illegible]

جلال الدین کے سپرد کر دیا۔ تمام قیدی بدایوں میں جلال الدین کے سامنے پیش کئے گئے جلال الدین انھیں دیکھ کر ملول ہوا۔ بجائے باغیوں کو سزا دینے کے انھیں سراہا اور تعریف کی کہ انھوں نے بہت اچھا کیا جو اپنے مالک (چھجو) کا حق نمک ادا کیا۔ پھر سب کو رہا کر دیا۔[1] البتہ ملک چھجو کو ملتان بھیج دیا کہ وہاں نظر بند رہے۔ بادشاہ کی اس نرمی پر ملک احمد حبیب نے ٹوکا بھی لیکن بادشاہ نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ سلطان نے ملک احمد کو مخاطب کر کے کہا کہ میں مرد مسلمان ہوں۔ اپنی زندگی کے ستر سال مسلمانوں میں رہ کر گذارے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کا خون میری گردن پر ہو اور پھر تم سیاست کرنے کے لئے ان امراء نامدار و عالی تبار پر اصرار کرتے ہو جن کے مقابلہ میں ابھی چند سال پیشتر تک میری کوئی حقیقت نہیں تھی۔ جب ہم (یعنی میں اور برادر کلاں شہاب الدین) بلبن کے دور حکومت میں شاہی دربار میں حاضری دینے کے لئے جایا کرتے تھے تو اس امر کے متمنی رہتے تھے کہ امیر علی سرجاندار "سلام مارا علیک گوید" اور بہت سے امراء جنھیں میں نے اس وقت معاف کر دیا ہے ایسے ہیں کہ جن کے ساتھ ہمارا مدتوں ساتھ رہا ہے اسلئے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ آج جبکہ خدائے برتر و بزرگ نے مجھے اپنے کرم سے بادشاہت کے مرتبہ پر فائز کیا ہے ان لوگوں کو بھول جاؤں اور ان پر بجائے احسان و کرم کے سیاست کو کام میں لاؤں۔[2]

(۲) ایک مرتبہ ایک ہزار کے قریب ڈاکو اور ٹھگ پکڑ کر دہلی لائے گئے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی سزا نہیں دی گئی۔ بلکہ سب کو کشتیوں میں سوار کرا کر دریا جمنا و گنگا کے ذریعہ بنگال میں لیجا کر چھوڑ دیا گیا۔

(۳) بادشاہ کی نرمی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ناراض امراء

---

[1] برنی صفحہ ۱۸۳، فرشتہ جلد اول صفحہ ۹۱، طبقات اکبری صفحہ ۶۵۔

[2] ضیائے برنی صفحہ ۱۸۴-۱۸۶

جلال الدین کے ساتھ یہ بھی مارا گیا۔ سلاطین دہلی ہندو رعایا کے قلوب کو کس طرح مسخر کیا کرتے تھے اس کے لئے یہ مثال قابل غور ہے۔

سیدی مولی کا قتل

ان تمام باتوں کے باوجود سیدی مولی کا خون سلطان کے سر پر ہے اور غالباً سختی و بیرحمی کا یہی ایک واقعہ ایسا ہے جو سلطان کی فطری شرافت و رحمدلی کے برخلاف سرزد ہوا۔ سیدی مولہ کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ ضیاء برنی انھیں حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کا مرید و خلیفہ بتاتا ہے اور آج کل کے بعض مورخین انھیں ملاحدہ کا نمایندہ تصور کرتے ہیں جس طرح بہت سے علماء و مشائخ اور صوفیاء کرام چنگیزی فتنے سے محفوظ رہنے کے لئے اسلامی ممالک سے ہندوستان کی طرف چلے آئے اسی طرح بہت سے حسن بن صباح کے پیرو قلعۂ الموت کے تباہ ہونے پر صوفیاء کرام کے لباس میں ہندوستان میں آکر پناہ گزیں ہوگئے اور حضرت سیدی مولی ان میں سے ایک ہیں۔ بہرحال برنی سے جو روایت ہم تک پہونچی ہے وہ یہ ہے کہ سیدی مولی ایک درویش تھے جو سلطان بلبن کے عہد میں ولایت ملک بالا سے شہر دہلی میں آئے۔ اُن کے طریقے عجیب و غریب تھے۔ اگرچہ نماز پڑھتے تھے لیکن اسلاف کرام کی طرح نماز با جماعت ادا نہیں کرتے تھے اور نہ جمعہ کی نماز کے لئے مسجد میں آتے تھے۔ ویسے مجاہدہ و ریاضت بہت کرتے تھے۔ جامہ اور چادر پہنتے اور چاول کی روٹی معمولی سالن سے کھاتے تھے۔ اہل وعیال اور دنیا داری کے جھگڑوں سے پاک تھے۔ نہ کسی سے کچھ طلب کرتے۔ اور اگر کوئی کچھ دیتا بھی تو اسے قبول نہ کرتے۔ لیکن اُن کے اخراجات اتنے تھے کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی اور ان کا خیال تھا کہ وہ علم کیمیا جانتے ہیں۔ انھوں نے ہزاروں روپیہ خرچ کرکے ایک خانقاہ بنوائی تھی۔ اس خانقاہ میں بڑی مقدار میں کھانا پکتا تھا اور مسافروں کو دونوں وقت ملتا تھا۔ کھانا ایسا ہوتا تھا کہ اس زمانہ کے خوانین و ملوک کو بھی میسر نہ تھا۔

کھانے کی تیاری میں ہزاروں من میدہ روزانہ خرچ ہوتا تھا۔ پانچسو جانور ذبح کیے جاتے
تھے دو تین سو من شکر اور سو دو سو من نبات (مصری) خریدی جاتی تھی۔ خانقاہ کے سامنے
ہزاروں آدمیوں کا ہجوم رہتا تھا جس سے امیر و غریب مستفیض ہوتے تھے" خانقاہ کا
تبرک ایک مرتبہ برنی نے بھی کھایا تھا۔ "خرچ کے پورا کرنے کے لئے نہ بظاہر کوئی گانو
تھا اور نہ ان کو شاہی وظیفہ ملتا تھا اور نہ وہ کسی سے فتوح قبول کرتے تھے لیکن اس
کے ساتھ ہی کیفیت یہ تھی کہ جب کسی سے کوئی چیز خریدتے یا کسی کو کچھ رقم دینا چاہتے
تو کہتے کہ جاؤ فلاں پتھر یا اینٹ کے نیچے جا کر اتنے نقرئی ٹنکے لیلو۔ وہ جاتا تو واقعی اینٹ
یا پتھر کے نیچے یا طاق میں طلائی اور نقرئی سکے مل جاتے۔ یہ سکے ایسے ہوتے جیسے ٹکسال
سے بالکل نئے نکلے ہوں۔

خانقاہ کے اخراجات سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں اور بھی زائد بڑھ گئے
تھے سلطان کا بڑا لڑکا خان خاناں بھی ان کا معتقد ہو گیا تھا وہ اپنے کو سیدی مولہ کا بیٹا کہتا
تھا [illegible] امراء و حکام [illegible] آمد و رفت [illegible] ان کے پاس بڑھ گئی تھی۔ قاضی جلال کاشانی نے جو قاضی
القضاۃ تھا لیکن فتنہ انگیز تھا سیدی سے تعلقات پیدا کئے وہ دو دو تین تین راتیں خانقاہ
میں بسر کرتا اور وہاں کے لوگوں کی گفتگو میں شریک رہتا اس گفتگو میں بلبن کے عہد
کے موالی زادے جو امراء و ملوک کی اولاد سے تھے لیکن انقلاب سلطنت کی وجہ سے بر اقطاع
و بے ختم ہو گئے تھے شرکت کرتے ...... لوگ سمجھتے کہ ان اکابر کی آمد و رفت محض
حصول برکت کے لئے ہوتی ہے لیکن معلوم ہوا کہ قاضی جلال کاشانی، خان زادے ملک
زادے، برنج تن اور ہتھیا پایک [illegible] نے ارادہ کیا کہ جمعہ کے روز جب نماز کے
لئے سلطان کی سواری نکلے تو اس پر حملہ کر دیا جاوے اور سیدی کو خلیفہ بنا کر ان کا
نکاح سلطان ناصر الدین کی لڑکی سے کر دیا جاوے اور قاضی جلال کو قاضی خاں کا
عہدہ اور ملتان کا اقطاع عطا کر دیا جائے۔ اسی طرح اور اقطاعات آپس میں تقسیم

[illegible] وزرات کو سیدی کے پاس بیٹھ کر فتنہ انگیزی کا مشورہ کرتے تھے چنانچہ [illegible] ہتھیا پایک کے کوتوال

کر لئے جائیں۔ ان بیکار لوگوں میں سے ایک شخص جو مشورہ میں شریک تھا۔ اس نے ان سے منحرف ہو کر یہ تمام خبریں سلطان تک پہونچا دیں۔ سیدی اور ان کے ساتھی متّہم کر کے سلطان کے سامنے لائے گئے۔

سلطان نے واقعہ کی تفتیش کرنا چاہی تو سب نے انکار کر دیا۔ اس زمانہ میں یہ رواج نہ تھا کہ انکار کرنے والوں سے لات اور ڈنڈے کے ذریعہ اقرار کرایا جاتا چنانچہ دب کے لئے حکم جاری کیا گیا۔ سلطان اور دوسرے لوگوں کو سازش کا پورا یقین تھا لیکن سازش کرنے والے منکر تھے اور گواہ صرف ایک تھا اس کے علاوہ اور کوئی ثبوت نہ تھا لہذا اُن پر کوئی حکم نافذ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے بہار پور کے میدان میں آگ روشن کی گئی۔ سلطان ملوک اور خوانین کے ساتھ وہاں پہونچا ایک کوشک خاص نصب کیا گیا سلطان نے شہر کے تمام اکابر علماء و مشائخ کا محضر طلب کیا۔ اس میدان میں شہر کے خواص و عوام بھی جمع ہوئے۔ سلطان نے حکم دیا کہ سازش کرنے والوں کو آگ میں ڈال دیا جائے تاکہ جھوٹ اور سچ روشن ہو جائے لیکن متدیّن علماء نے منع کیا اور کہا کہ دب مشروع ہے اس لئے آگ کے ذریعہ جھوٹ و سچ کی تمیز نہیں کی جا سکتی اور شہادت ایک شخص کی ہے جو ناقابل سماعت ہے اس لئے سلطان نے دب کا ارادہ ترک کر دیا۔ پھر بھی سلطان نے انتظاماً قاضی جلال کو جو فتنہ کا سرغنہ تھا دہلی سے ہٹا کر بدایوں کا قاضی بنا دیا۔ خانزادوں اور ملک زادوں کو جلا وطن کر دیا اور اُن کی املاک ضبط کر لیں۔ [illegible] اور ہتھیا پایک کے کوتوال کو سزا دی۔ اس کے بعد سیدی مولٰی کو باندھ کر سلطان کے کوشک کے پاس لایا گیا۔ سلطان نے اُن سے خود مباحثہ کیا۔ اس [illegible] ابوبکر طوسی حیدری بھی اپنی حیدری جماعت کے ساتھ موجود تھے۔ سلطان نے اُن سے خطاب کر کے کہا "اے درویشاں! انصاف من ازیں مولٰی بستانید" اس پر بحری نامی ایک حیدری نے بڑھ کر سیدی کو استرے سے زخمی کر دیا۔ ارکلی خاں نے کوشک کے اوپر سے

فیل بانوں کو اشارہ کیا۔ ایک ہاتھی سیدی مولی کی طرف دوڑا اور اُن کو پاؤں تلے مسل ڈالا جس روز سیدی مولی کا قتل ہوا ایک سیاہ آندھی آئی اور ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ اس قتل کے بعد ملک میں طرح طرح کے فتور پیدا ہو گئے۔ اس سال دہلی میں بارش نہیں ہوئی۔ قحط پڑ گیا۔ غلہ ایک جیتل میں ایک سیر ملنے لگا۔ کوہ شوالک کی طرف کے لوگ قحط کے سبب مع عورتوں و بچوں کے دہلی چلے آئے۔ بیس بیس تیس تیس آدمی ایک جگہ رہتے اور بھوک سے بیتاب ہو کر اپنے کو جمنا میں غرق کر دیتے تھے۔ ادنیٰ لوگ سلطان اور امراء کے صدقات پر زندگی بسر کرتے تھے[1]۔ سیدی مذکور شہادت سے ایک ماہ قبل مندرجۂ ذیل دو اشعار اکثر پڑھا کرتے تھے اور ہنستے تھے ؎

در مطبخ عشق جز نکو را نکشند — لاغر صفتان زشت خو را نکشند
گر عاشق صادقی ز کشتن مگریز — مردار بود ہر آنچہ او را نکشند[2]

فتوحات

راجپوتانہ — ملک چھجو کی بغاوت سے فارغ ہونے کے بعد ۶۸۹ھ میں بادشاہ نے راجپوتانہ و مالوہ کی طرف توجہ کی جہاں کے راجپوتوں نے سلطان کیقباد کی عیاشی سے فائدہ اٹھا کر منڈاور و رنتھنبور پر قبضہ کر لیا تھا۔ منڈاور راجپوتانہ میں مسلمانوں کی مغربی سرحد کی جنگی چوکی تھی۔ اجمیر پر مسلمانوں کا مستقل قبضہ ہونے کے بعد راجپوتانہ کے دوسرے مقامات کی جنگی اہمیت گھٹ گئی لیکن رنتھنبور کا معاملہ دوسرا تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں نے اس کو بار بار فتح کیا۔ جلال الدین نے مشرقی راجپوتانہ اور شمالی مالوہ کا دورہ کیا اور بڑے بڑے سرکشوں کو سزا دیتا ہوا رنتھنبور پہونچ گیا جہاں شاہی فوجوں نے باغیوں کو

---

[1] ضیائے برنی ص۲۰۷ تا ص۲۱۲، فتوح السلاطین ص۲۱۷

[2] منتخب التواریخ جلد اول ص۱۷۱

پہلے ہی سے گھیر رکھا تھا۔ ساباط اور گرگج بن چکے تھے۔ منجنیقیں نصب ہو چکی تھیں لیکن
جلال الدین کو اس وسیع و مستحکم قلعہ کا معائنہ کرنے کے بعد تردد پیدا ہو گیا کہ قلعہ کی تسخیر میں
نہ معلوم کتنے مسلمانوں کی جانیں جائیں گی۔ وہ بالطبع نہایت حلیم و نیک دل تھا اور بادشاہ
ہونے کے بعد باغیوں اور خونیوں تک کے قتل سے احتراز کرنے لگا تھا اس موقع پر بھی جذبہ
خداترسی غالب آگیا اور محاصرہ اٹھانے کا حکم دے دیا بعض امرا نے اس فیصلہ کی مخالفت
کی اور ہر چند عرض کیا کہ ایسی رعایت کرنے سے نتیجہ خراب ہوگا اور آئندہ سرکشوں کی
جرأت بڑھ جائیگی۔ اس پر بادشاہ نے اسلام کی تعلیم اور کشت و خون سے تا امکان
بچنے کی تعریف میں ایک لمبی چوڑی تقریر کی اور فوج کو واپس لے کر دہلی چلا آیا۔[1]

مغلوں کا حملہ

اسلامی جہاد کو سلطان دفاعی جنگ سمجھتا تھا اس کا بھی موقع
بہت جلد آ گیا سنہ ۶۹۱ھ میں ۱½ لاکھ فوج لیکر ہلاکو خاں کے پوتے
یا نواسے عبداللہ خاں اور الغو خاں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور سنام تک بڑھ آئے
جہاں افواج دہلی نے اُن کا مقابلہ کیا اور کئی دن کی لڑائیوں میں اپنی جنگی برتری ثابت
کر دی۔ یہ لوگ اب پہلے کی طرح کافر و بت پرست نہ تھے بلکہ بہت کچھ دین اسلام سے بھی
واقف ہو چلے تھے اور بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔ لہذا جلال الدین اپنی یقینی
کامیابی کے باوجود اُن سے مصالحت پر آمادہ ہو گیا اور الغو خاں کو مسلمان کر کے اس کے
ساتھ اپنی بیٹی بیاہ دی۔ الغو خاں معہ چند بڑے بڑے مغل سرداروں کے بادشاہ
کی خدمت میں رہ گیا۔ نو مسلم مغلوں کی یہ جماعت کیلو کھڑی، غیاث پور اور اندرپت میں
آباد ہو گئی۔ بادشاہ نے اُن کے روزینے مقرر کر دئے۔ دو سال کے بعد بہت سے مغل
آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے اپنے وطن کو لوٹ گئے جو باقی رہ گئے آن کی یہیں
شادی بیاہ ہونے لگے لوگ ان کو نو مسلم کہہ کر پکارتے تھے۔

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ضیائے برنی صفحہ ۲۱۳ تا ۲۱۸

مالوہ و راجپوتانہ

اِسی سال منڈور اور جھاین کے سرکش ہندوؤں کی گوشمالی کی گئی۔ جبکہ سلطان منڈور گیا ہوا تھا۔ اُس کے بھتیجے علاء الدین حاکم کڑہ نے سلطان سے بھیلسہ پر فوج کشی کی اجازت مانگی۔

علاء الدین دراصل اپنی بیوی اور خوشدامن ملکۂ جہاں کے تسلّط سے سخت عاجز تھا[1]۔ اور اپنی مجبوری و بیکسی کا حال کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ سلطان سے بھی شکایت نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا وہ اسی فکر میں رہتا تھا کہ دہلی کی حدود سلطنت سے دور جاکر رہے۔ اُس کے لئے سب سے زیادہ آسان بات بنگال کا بغرا خاں سے چھین لینا تھا۔ مگر اس کے مشیروں نے اس کی توجہ کو بھیلسہ اور دکن کی طرف پھیر دیا۔ اُس کو دہلی کی فتح کے سبز باغ دکھائے جس کے لئے بیش از بیش روپیہ کی ضرورت تھی چنانچہ حصولِ زر کے لئے پہلے بھیلسہ کو منتخب کیا گیا۔ برنی کے الفاظ یہ ہیں:۔

"وہمدراں سال کہ علاء الدین مقطع کڑہ شدہ و آنجا رفت بسے کارداران و مقربان ملک چھجو کہ مایۂ آن فتنہ شدہ بودند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در دماغ سلطان علاء الدین ساندند کہ در کڑہ لشکر بسیار مستعد و مرتب میتواں کرد و ممکن است کہ از کڑہ دہلی بدست آید۔ زر می باید۔ کہ اگر بر ملک چھجو زر می بودے ملک دہلی بدست او آمدے"[2]۔

بھیلسہ پر چڑھائی کرنے والی فوج میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے بھیلسہ نہایت آسانی سے فتح ہو گیا۔ اور بہت کافی مال غنیمت ہاتھ لگا۔ یہیں پر اُس کو دیوگیر کی دولت کا پتہ چلا اور بتانے والے بھیلسہ ہی کے باشندے تھے۔ تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے۔

"درانچہ علاء الدین در بھیلسہ رفت خبر بسیارے مال و پیل دیوگیر در سمع او افتادہ

---

[1] فتوح السلاطین صفحہ ۲۲۱، بدایونی صفحہ ۱۷۳ جلد ا

[2] ضیاء برنی صفحہ ۱۸۱

رفتن دیوگیر از آنجا میاں پر سید و در خاطر کرد [1]

بھیلسہ کی تسخیر سے سلطان بہت مسرور ہوا اور خوش ہو کر علاء الدین کو اودھ بطور جاگیر دیدیا۔ سلطان کو اپنے اوپر مہربان دیکھ کر علاء الدین نے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو دو ایک سال اودھ و کڑا کا خراج نہ بھیجوں اور اس روپیہ سے جنگی قوت بڑھا کر چندیری پر حملہ کروں۔ چندیری پر حملہ کی اجازت مانگنا اور اس کے لئے تیاری کرنا صرف ایک بہانہ تھا۔ فرشتہ و برنی کے الفاظ اس جگہ قابل غور ہیں۔ دونوں کے الفاظ الگ الگ ہیں لیکن مفہوم ایک ہے یعنی یہ کہ وہ (سلطان علاء الدین) ملکۂ جہاں اور اپنی بیوی کے دائرۂ ظلم و ستم سے دور رہنے کے لئے ایک ایسی جگہ کا متلاشی تھا جہاں وہ مقیم رہ سکے۔ برنی کے الفاظ یہ ہیں۔

"و میخواہد کہ از جفائے ملکۂ جہاں و حرم خود دور دست رود و اقلیمے و یا دیارے فروگیرد و ہمانجا باشد و بیش دریں جانب و دریں دیار نیاید" [2]

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ علاء الدین کو بھیلسہ سے اتنی رقم ہاتھ نہیں لگ سکی جو وہ اپنے مشیران کار کے مشورے کے مطابق حصول تخت دہلی کے لئے کافی سمجھتا اسی لئے اس نے دہلی کے حدود سلطنت سے باہر چلا جانا ہی مناسب سمجھا کیونکہ اس میں دو فائدے تھے اول یہ کہ دور رہنے سے ملکۂ جہاں کے ظلم و ستم سے بچا رہے گا۔ اور دوسرے یہ کہ بھیلسہ کے مفتوحین کے بتلانے کے بموجب دکن سے اگر روپیہ کافی ہاتھ آگیا تو پھر اسے ایک موقع دہلی کے تخت کے حاصل کرنے کے لئے کڑا رہتے ہوئے مل سکے گا۔ چنانچہ ۱۲۹۴ء میں کڑا مانکپور سے آٹھ ہزار منتخب سواروں کو لیکر اور اپنی جگہ برنی کے چچا علاء الملک کو اپنا قائم مقام بنا کر دیوگری کی طرف چل پڑا لیکن شہرت

[1] ضیاء برنی صفحہ ۲۲۲

[2] ضیاء برنی صفحہ ۲۲۱

یہ دی کہ وہ چندیری پر حملہ کرنے جا رہا ہے۔ نو سو میل کا راستہ دو مہینے میں طے کر کے ملک
مرہٹ میں داخل ہوا۔ راستہ میں جو رجواڑے پڑے اُن میں یہ مشہور کرتا گیا کہ
وہ بادشاہ دہلی کا ایک سردار ہے۔ اس کے خوف سے دہلی کو چھوڑ کر کے جنوبی تلنگانہ
(راج مندری) کے راجہ کے یہاں ملازمت کی غرض سے جا رہا ہے۔ اس لئے کسی
نے اُس کو راستہ میں ذرا بھی نہیں روکا۔ ایلچ پور پہونچکر اس نے دو دن قیام کیا اور
پھر دیوگری کی طرف روانہ ہو گیا۔ دیوگری کے راجہ رامچندر (رام دیو) نے شہر سے ۲ میل
کے فاصلہ پر لاسورا نامی مقام پر صرف تین ہزار آدمیوں کو لے کر جو نہایت عجلت میں
فراہم کئے گئے تھے مقابلہ کیا ریاست کی اصلی فوج اس کے لڑکے شنکر دیو اور اس
کی بیوی کی ہمراہ کسی تیرتھ کے لئے گئی ہوئی تھی۔ راجہ کو لڑائی میں شکست ہوئی
اور وہ دیوگری میں محصور ہو گیا۔ محاصرہ سخت تھا۔ محاصرہ کے دوران میں محصورین
کو یہ معلوم کر کے نہایت افسوس ہوا کہ جو بوریاں سامان رسد کی فراہمی کے لئے
لاسورا سے واپسی کے وقت قافلے والوں سے جلدی میں چھین کر رکھ لی گئی تھیں۔
ان میں بجائے غلہ کے نمک ہے اس لئے راجہ نے علاء الدین سے صلح کر لی علاء الدین
کو مال غنیمت میں اب تک ۶۰۰ من سونا ۴ من ہاتھی۔ کئی ہزار گھوڑے ... من سونا۔ چاندی
وغیرہ ہاتھ لگ چکے تھے۔ یہ سب سامان اپنے ساتھ لے جانے کی راجہ نے اجازت
دیدی۔ دیوگری آنے سے پندرھویں دن بعد علاء الدین روانہ ہی ہونے والا
تھا کہ شنکر دیو تیرتھ سے واپس آ گیا۔ اور لڑائی نئے سرے سے چھڑ گئی کیونکہ لڑکے
نے باپ کی شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا۔ علاء الدین نے ایک ہزار فوج قلعہ والوں
کو مصروف جنگ رکھنے کے لئے الگ کر کے بقیہ فوج سے شنکر دیو پر شہر سے تین
میل کے فاصلہ پر حملہ کیا اور بالآخر اُس پر فتح پائی اب علاء الدین نے اپنی شرائط
جو دوبارہ پیش کیں وہ زیادہ سخت تھیں۔ نئی صلح کے بموجب راجہ نے سلطان

علاء الدین کو چھ سو من سونا۔ ایک ہزار من چاندی۔ سات من موتی دو من جواہرات اور

چار ہزار ریشمین کپڑے نذر کئے اور اس مال و دولت کے علاوہ ایلچپور کا علاقہ علاء الدین کو دینا منظور کیا۔ اِس چھوٹے سے علاقہ کو علاء الدین نے اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اتنے دور دراز علاقہ میں ہندو ریاستوں کے درمیان اپنی آزادی کو قائم رکھنے کی اپنے اندر اہلیت سمجھتا تھا۔ علاء الدین کو دکن سے جو دولت حاصل ہوئی وہ محمد بن قاسم کے زمانہ سے لیکر غوری کے عہد تک کی مجموعی مال غنیمت سے بدرجہا زائد تھی۔ لیکن یہ دولت[1] بھی بجز اِس کے کہ جنوبی ہند سے شمالی ہند میں آگئی ہندوستان کے حدود سے باہر ہرگز نہیں گئی۔

جلال الدین کا قتل ۱۲۹۵ء کے اواخر میں جلال الدین بسلسلۂ سیر و شکار گوالیار میں مقیم تھا کہ اُس کو اپنے بھتیجے کے کڑا پہونچنے کی اطلاع ملی۔ درباریوں نے اور خاص کر ملک احمد حبیب نے بادشاہ کو سمجھایا کہ آگے بڑھ کر فوراً علاء الدین کے مال و دولت پر قبضہ کر لینا چاہئیے ورنہ نتیجہ خراب نکلے گا۔ بادشاہ علاء الدین کے کڑا سے اتنے عرصہ غیر حاضر رہنے کی وجہ سے ناراض بھی تھا۔ لیکن علاء الدین کے بھائی الغ خاں نے جو سلطان کا داماد تھا اور "آخور بک" کے عہدہ پر سرفراز تھا۔ علاء الدین کی غیبت میں بادشاہ کو بہت کچھ ہموار کر لیا تھا۔ علاء الدین کی فرماں برداری کا یقین دلایا۔ اور بادشاہ کو یہ بھی باور کرا دیا کہ وہ حضور کے ڈر کی وجہ سے اور اپنی حماقت پر متأسف ہونے کی وجہ سے دربار میں حاضر ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر اس کو حاضری

---

[1] ابن بطوطہ جو حملہ دیوگیر سے چالیس سال بعد ہندوستان آیا ہے۔ اِس دولت کے حاصل ہونے کا یہ سبب بتلاتا ہے کہ علاء الدین کے گھوڑے نے دوران سفر میں جنگل کے اندر ایک مقام پر ٹھوکر کھائی اور گھوڑے کے سم سے ایک زنجیر جو دبی ہوئی تھی برآمد ہوئی۔ کھودنے پر اس مقام سے خزانہ برآمد ہوا جو علاء الدین کے ہاتھ لگا۔ واللہ اعلم

کے لئے مجبور کیا گیا۔ تو وہ یا تو زہر کھالے گا یا کسی دوسرے ملک کو چلا جائے گا۔ اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ جہاں پناہ اگر خود بنفس نفیس کڑہ تشریف لے چلیں تو نہایت مناسب ہوگا بادشاہ درباریوں کے منع کرنے کے باوجود اپنے وفادار سپہ سالار ملک احمد حبیب کو لیکر کڑا کی طرف چل پڑا۔ یہ سفر ڈبائی واقع ضلع بلند شہر سے گنگا میں بذریعہ کشتیوں کے کیا گیا شاہی بارجہ جب کڑا اور مانکپور کے درمیان پہونچا جہاں علاء الدین استقبال کے لئے آیا ہوا تھا۔ تو علاء الدین نے استقبال کے لئے اپنے بھائی الغ خاں[1] کو بھیجا۔ خود نہیں آیا۔ بادشاہ کو اس پر اعتراض بھی ہوا لیکن اس سے الغ خاں نے یہ بہانہ کر دیا کہ وہ حضور کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہے اس لئے غیر حاضر ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی گوش گذار کر دیا کہ حضور چند مخصوص خدام کو لیکر دریا پار تشریف لے چلیں، علاء الدین حضور سے بہت خائف ہے اگر اس نے ساتھ میں زیادہ بھیڑ بھاڑ دیکھی تو اس کی پریشانی اور خوف میں اضافہ ہو جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا بادشاہ کی فوج دریا کے اسی طرف رہ گئی۔ بادشاہ چند خدام کو لیکر علاء الدین سے دریا پار جا کر ملا۔ علاء الدین قدموں پر گر پڑا بادشاہ نے بہت محبت آمیز لہجہ میں علاء الدین کو سرزنش کی[2] اور پھر علاء الدین کو لیکر اپنی کشتی کی طرف شفقت آمیز باتیں کرتا ہوا چلا۔ علاء الدین نے قتل کا اشارہ کیا۔ فوراً اس کے ایک ساتھی محمد سلیم نے تلوار کے دو ہاتھ مارے اور بادشاہ کو زخمی کر دیا۔ بادشاہ اپنی کشتی کی طرف بھاگا۔ لیکن دوسرے قاتل اختیار الدین نے پیچھے سے مسلسل کئی وار کئے اور بادشاہ کا خاتمہ کر دیا۔ یہ واقعہ ارمضان

---

[1] الغ خاں نے دہلی میں بادشاہ کو علاء الدین کا ایک مکتوب دکھایا جو اس کے پاس کڑہ سے آیا تھا اس میں لکھا تھا کہ اگر بادشاہ نے شاہی لشکر کے ساتھ دہلی سے کڑہ کا رخ کیا تو وہ مع مال و اسباب و خزانہ کسی دوسرے ملک کی طرف چلا جائیگا چونکہ بادشاہ کا ارادہ کڑہ جانے کا ہو چکا تھا اسلئے الغ خاں کو کچھ دن پہلے کڑہ بھیج دیا کہ وہ وہاں جا کر علاء الدین کو سمجھائے اور باہر جانے کے ارادے سے باز رکھے اس کے بعد خود جریدہ کڑہ کی طرف

(باقی صفحہ ۳۲۹ پر)

۶۹۵ھ مطابق ۲۹ جولائی ۱۲۹۶ء بروز جمعرات بوقت ظہر کا ہے اسی دن علاء الدین نے نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ملک احمد حبیب اپنی فوج کے ہمراہ جو براہ خشکی سفر کرتی ہوئی کڑہ پہونچی تھی یہ حالت دیکھ کر دہلی واپس لوٹ آیا۔

جلال الدین پر ایک نظر

سلطان جلال الدین بڑے عظمت و اقتدار اور جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ اُس کے ساتھ ہی ساتھ نہایت صاحبِ مذاق، رنگین طبع اور خوش صحبت تھا۔ شعر بھی کہتا تھا۔ بدایونی نے اِس کے دو شعر[1] نقل کئے ہیں جن سے اُس کی رنگینی طبع کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کے احباب اور شریک صحبت بھی جس قدر تھے سب قابل، اہل فن اور موزوں طبع و رنگیں مزاج تھے

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۳۸ ؎ روانہ ہوا اس لئے الغ خاں کڑہ میں پہلے سے موجود تھا۔ (مولف) ؎ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ضیائے برنی ص۲۳۴ ۔ ؎ ۔ صاحب طبقات اکبری اور فرشتہ نے سلطان جلال الدین کے واقعہ قتل کو اس عہد کے ایک مجذوب فقیر شیخ کرک کے ارشاد گرامی پر محمول کر کے اس انداز سے لکھا ہے جس سے دھوکا ہوتا ہے کہ سلطان مرحوم علاء الدین کے درپئے آزار تھا۔ حالانکہ ضیائے برنی کی تشریحات سے جو زائد قابلِ اعتماد ہیں یہ صاف ظاہر ہے کہ سلطان مرحوم کی بزرگانہ محبت و شفقت علاء الدین کے حال پر آخر تک باقی رہی۔ مجذوب فقیر کی طرف جو روایت منسوب کی جاتی ہے وہ یہ ہے "کڑہ میں جلال الدین کی آمد کے وقت علاء الدین (عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین پریشان ہے حالانکہ بظاہر پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی) ایک مجذوب فقیر شیخ کرک کے پاس حاضر ہوا۔ شیخ نے حالتِ جذب میں سر کو اوپر اٹھا کر کہا "ہر کس کہ بکند با تو جنگ + سر در کشتی تن در گنگ" (طبقات اکبری ص۱۳۶، فرشتہ ص۱۰۰) قابلِ غور امر یہ ہے کہ کیا جلال الدین جنگ کے ارادے سے کڑہ آیا تھا؟

[1] ؎ ۔ آں زلف پریشانت ژولیدہ نمی خواہم ۔ واں روئے چو گلنارت تفسیدہ نمی خواہم
بے پیرہنت خواہم یک شب بکنار آئی ۔ ہاں بانگ بلند است ایں پوشیدہ نمی خواہم
(منتخب التواریخ جلد ا ص۱۸۲ از بدایونی)

مثلاً تاج الدین کوچی، ملک فخر الدین، ملک اعزالدین، ملک نصرت، ملک حبیب، ملک کمال الدین، ملک سعدالدین وغیرہم انیس اور ہم صحبت تھے۔

اسی طرح اکثر بڑے بڑے اہل کمال ندیمی کے لئے انتخاب کئے تھے چنانچہ تاج الدین عراقی، حسن دہلوی، امیر خسرو، موید جاجرمی، اختیار الدین وغیرہ ندماء خاص تھے۔ ان کے علاوہ ساقی، مغنی اور مطرب بھی وہ لوگ تھے جو زمانہ میں انتخاب تھے مثلاً امیر خاصہ، حمید، نظام محمد شاہ، بہروز وغیرہ۔

ان تمام مختلف المذاق صاحب کمال لوگوں کی فہرست دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جلال الدین کا دربار ہر لحاظ سے نہایت آراستہ و پیراستہ تھا جس کو اگر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بظاہر کئی باتیں قابل اعتراض معلوم ہوتی ہیں مثلاً دربار میں مغنی و مطرب کی موجودگی اور جام شراب[۱] کا دور۔ لیکن جلال الدین کی درباری زندگی کو نظر انداز کرکے جب ہم اس کی پرائیویٹ زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک دوسری کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ وہ مطلق العنان بادشاہ ہونے کے باوجود معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اپنے اعمال و افعال کا کسی بڑی طاقت کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے اسلئے اپنے ہر کام میں نہایت احتیاط برتتا ہے مثلاً ایک مرتبہ اس کے دل میں آیا کہ اسے خطبہ میں المجاہد فی سبیل اللہ کے لقب سے یاد کیا جاوے جس کا وہ ہر طرح سے مستحق ہے کیونکہ اس کی پوری زندگی مغلوں کے خلاف غزوات میں گذری ہے لہذا وہ بے شمار لڑائیاں ان سے لڑ چکا ہے۔ اس کا اظہار اس نے ملکۂ جہاں کے سامنے کیا۔ ملکۂ جہاں نے بادشاہ کی خواہش کو علماء و مشائخ نیز اراکین سلطنت کے سامنے پیش کیا جبکہ وہ شہزادہ قدر خاں[۲] کی شادی کے سلسلہ میں

---

[۱] "شراب" عربی لفظ ہے جو خمر اور غیر خمر دونوں کیلئے نام ہے۔ خمر کو بھی شراب کہتے ہیں اور نبیذ وغیرہ کو بھی شراب کہہ سکتے ہیں پس جو لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہو اس سے بلا قرینہ کوئی مخصوص معنی مراد نہیں لئے جاسکتے (مولف) [۲] جلال الدین کا تیسرا بیٹا قدر خاں تھا اسکی شادی سلطان کیقباد کی لڑکی کیساتھ ہوئی تھی۔

مبارک باد دینے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ بات چونکہ معقول تھی اسلئے سب نے اس کو پسند کیا کہ آئندہ جمعہ سے خطبہ کے اندر بادشاہ کو المجاہد فی سبیل اللہ کے لقب سے موسوم کیا جائے۔ بادشاہ کو جب اس فیصلہ کا علم ہوا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور خوانین شہر کو بلا کر فیصلہ مسترد کرا دیا اور اُن سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے بیشک ملکہ جہاں سے خواہش ظاہر کی تھی کہ مجھے المجاہد فی سبیل اللہ کے لقب سے یاد کیا جائے لیکن اس کے بعد تین چار روز تک جب میں نے اپنے دل کے گوشوں کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ یہ محض نفس کا فریب ہے مجھے یاد نہیں کہ اللہ کی راہ میں میں نے کبھی جہاد کیا ہو یا کوئی ایک تیر بھی جہاد کی نیت سے دشمن کی طرف پھینکا ہو۔ کفار سے لڑائیاں بیشک لڑا اور عمر بھر لڑتا رہا۔ لیکن اُن سب میں اپنی ناموری اور اپنے حاکمِ وقت کی خوشنودی کا خیال ہمیشہ مدِ نظر رہا اسلئے میں اِس قابل نہیں کہ مجھے "اللہ کا سپاہی" کہا جائے۔ صدورِ شہر نے بادشاہ کو راضی کرنے کے لئے بہت کچھ کہا سُنا لیکن وہ نہیں مانا اسلئے کہ دوسروں کی بہ نسبت وہ خود اپنے نفس کی کیفیات سے زائد واقف تھا[1]

اِس قسم کے اور بھی واقعات ہیں جن کی وجہ سے مورخین اُسے بالاتفاق منکسر المزاج مانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ منکسر المزاجی بغیر خوفِ خدا کے پیدا نہیں ہوتی جو ایک آمرِ مطلق العنان بادشاہ کے لئے ایک بڑی نعمت شمار کرنا چاہئے۔ انکسارِ نفس کے علاوہ جلال الدین کے اندر کئی ایک اور بھی ایسی خوبیاں ہیں جو اُسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں مثلاً اخلاق و مروّت یا صاحبِ حیثیت ہو کر اپنی گذشتہ فرومائیگی کو فراموش نہ کرنا۔ یہ خوبیاں ایک درویش با خدا کے اندر تو تلاش کی جا سکتی ہیں لیکن ایک دنیا دار یا سطوت شہنشاہ کے اندر ان کا پایا جانا لائقِ صد ستائش ہیں۔ ذرا غور کیجئے کٹرہ کے باغی جن کی گردنیں طوق و سلاسل سے گراں بار ہیں اُس کے سامنے

---

[1] ۔ ضیائے برنی ص۱۹۶

کھڑے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے جلیل القدر یعنی اُمراء و ملوک ہیں جو جلال الدین کے مقابلہ میں آج بیکس و بےبس ہیں۔ جرم یقیناً اِس نوعیت کا ہے کہ اُن کی گردنیں تلوار سے اُڑا دی جائیں لیکن کیا کیا جائے بادشاہ کی آنکھوں میں مروّت ہے اور اُسے اپنی پہلی زندگی یاد ہے جبکہ وہ سامانہ کا حاکم تھا۔ عہد گورنری میں جب وہ اپنے بڑے بھائی شہاب الدین کے ساتھ اِن جلیل القدر اُمراء سے دہلی میں ملا کرتا تھا تو اس امر کی تمنا کیا کرتا تھا کہ وہ اُس کے سلام کا جواب ہی دیدیں تو بڑی بات ہو۔ چنانچہ پچھلی زندگی کا یاد آنا تھا کہ "تعزمن تشاء وتذل من تشاء" کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ آبدیدہ ہو کر حکم دیتا ہے کہ باغی رہا کر دئے جائیں اور اُن کے شایانِ شان خاطر و مدارات کی جاوے۔

تاریخ میں مروّت و اخلاق کی ایسی قابلِ تعریف مثالیں شاید کم نظر سے گذریں گی۔ اسی طرح سازشی جماعتوں اور ٹھگوں و ڈاکوؤں کے گروہوں کو معاف کر دینے کی مثالیں بھی تاریخ میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی رحمدلی و خداترسی کو ایک طرح کی بزدلی پر محمول کیا جاوے اس لئے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ وہی جلال الدین ہے جو وحشی مغلوں کے مقابلہ میں صف آرا ہو کر انہیں بار بار زک دے چکا ہے بلکہ اخیر دفعہ جب وہ ڈیڑھ لاکھ کی تعداد میں ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تو ضعیف العمر ہونے کے باوجود اُس نے ان کا اس بےجگری سے مقابلہ کیا کہ مغلوں کو صلح کر لینے ہی میں اپنی عافیت نظر آئی۔ اسی طرح سازش کرنے والے اُمراء کو مخاطب کر کے جلال الدین کا یہ کہنا کہ دیکھوں تم میں ایسا کون سا بہادر ہے جو میرا مقابلہ کر سکتا ہے آئے اور تلوار اُٹھا کر دیکھ لے۔ ان الفاظ میں مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

گھریلو زندگی میں جلال الدین ایک شفیق باپ اور غمگسار چچا کی حیثیت سے دکھائی پڑتا ہے۔ بلکہ آخر میں اُس کی شفقت و محبت ہی نے اس کو شہادت کے درجہ

پرفائز کیا۔ بہرحال یہ تمام گوناگوں خوبیاں جن کا وہ حامل تھا غالباً اس لئے تھیں کہ اُس نے اپنے زمانہ کے صوفیاء کرام کی صحبت سے فیض اُٹھایا تھا۔ اس کو حضرت خواجہ بوعلی قلندرؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ اُن کے حلقۂ ارادت[1] میں بھی شامل ہوگیا تھا اسلئے یہ شاید انہیں کی صحبت کا اثر تھا کہ اس میں حلم، نرمی اور خدا ترسی کے اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے[2]۔

(۲) سلطان رکن الدین ابراہیم
جولائی ۱۲۹۶ء تا اکتوبر ۱۲۹۶ء

سلطان جلال الدین کی شہادت کے بعد ملکۂ جہاں نے جو ایک ناقص العقل عورت تھی اِس کا انتظار نہیں کیا کہ اس کا منجھلا لڑکا ارکلی خاں جو ہر طرح بادشاہی کے لائق تھا ملتان سے آکر حکومت کے انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے۔ اُس نے نہایت عجلت میں اپنے چھوٹے بیٹے رکن الدین ابراہیم کو دہلی کے تخت پر بٹھادیا۔ اس نے کیلوکھڑی کی رہائش ترک کرکے دہلی کے اندر کوشک سبز میں اپنی سکونت اختیار کی۔ وہ مشکل سے پانچ مہینہ حکومت کرسکا اس کے بعد علاء الدین نے اس کو شکست دیکر ملتان کی طرف بھگادیا اور خود دہلی کا شہنشاہ بن بیٹھا۔[1]

---

[1] ۔ خزینۃ الاصفیاء ج ۱ صک ۳۲۷

[2] ۔ ضیائے برنی صک ۲۰۷

باب ششم۔ عروج سلطنت

۱۲۹۶ء تا ۱۳۵۱ء

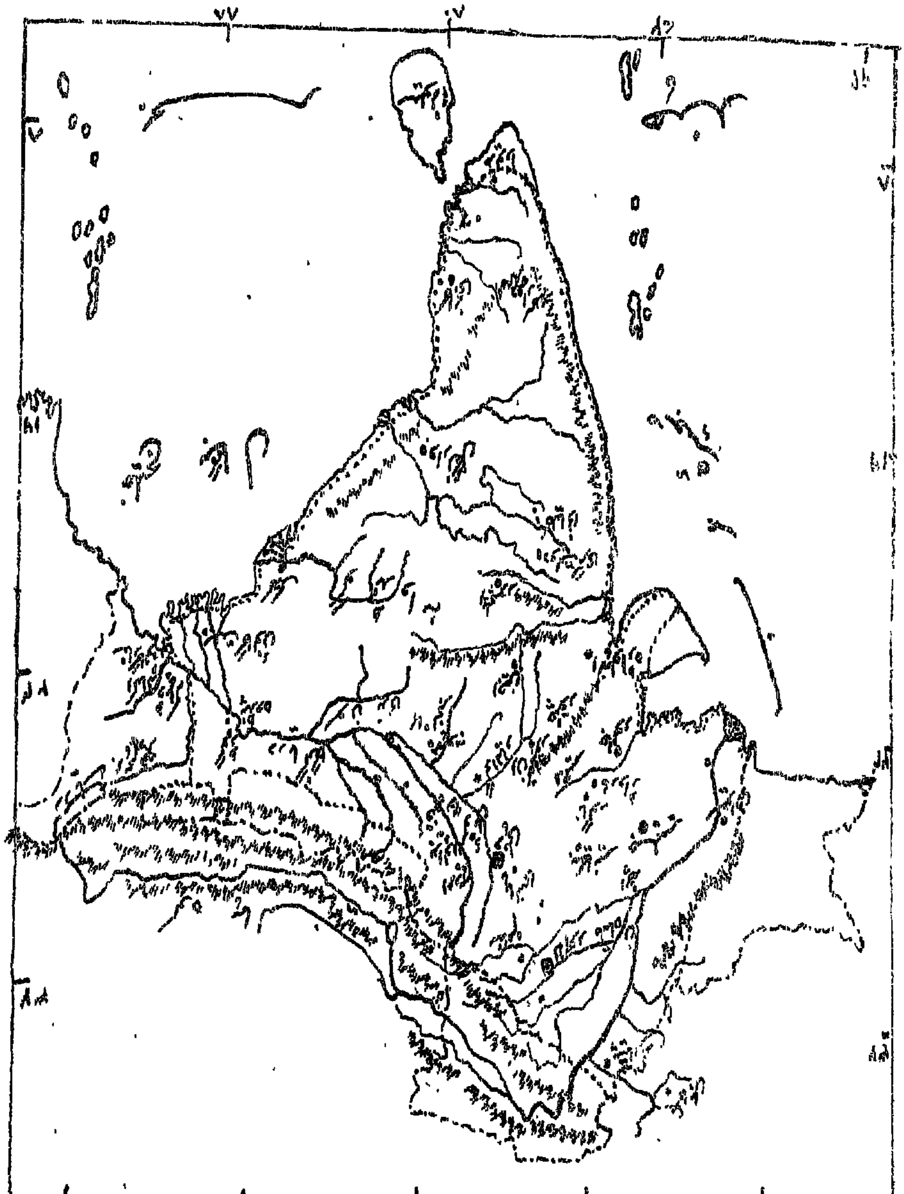
فصل اوّل (۲۳) سلطان علاء الدین خلجی بن شہاب الدین

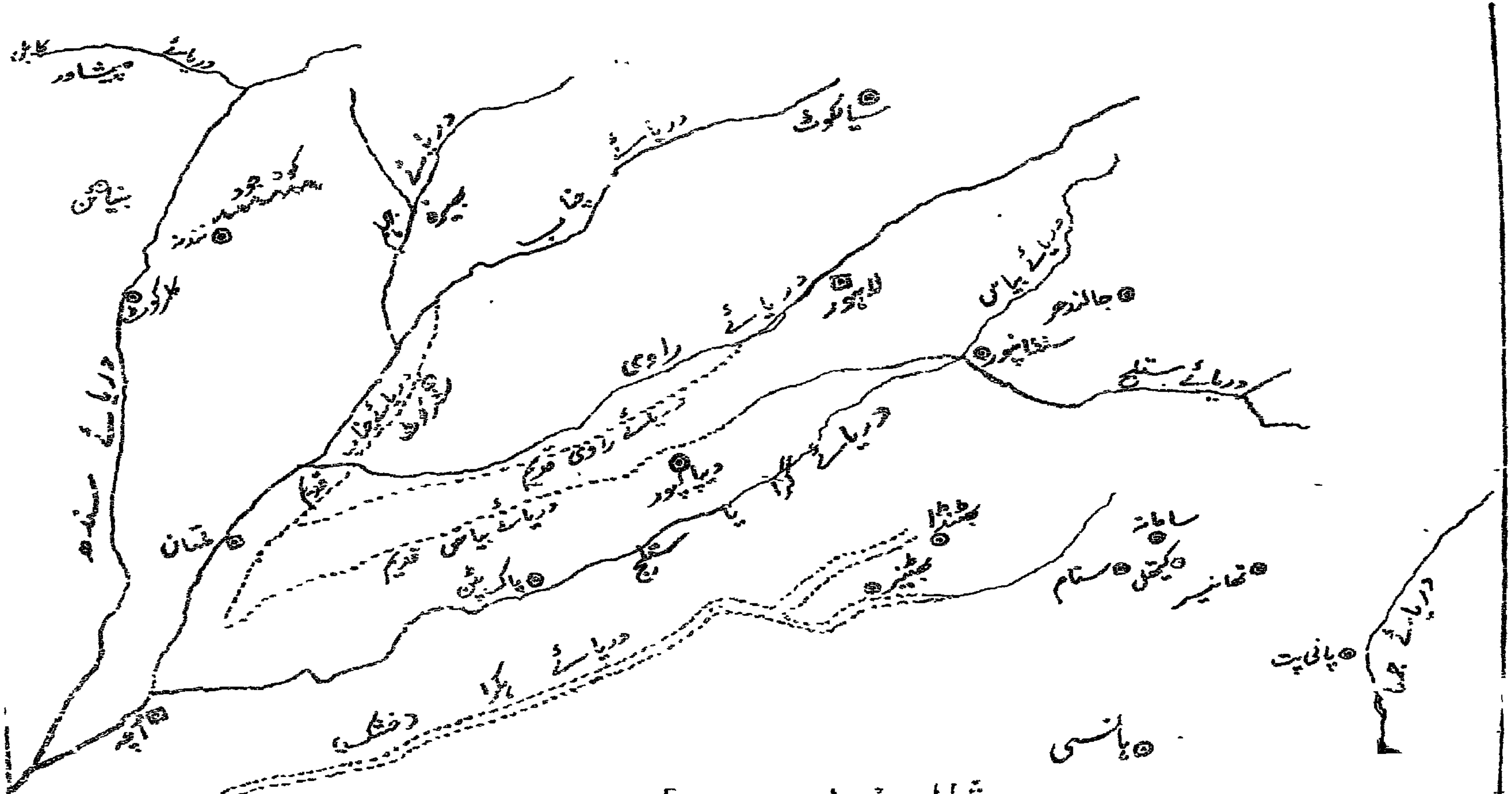
دسمبر ۱۲۹۶ء تا ۲ جنوری ۱۳۱۶ء

تخت نشینی ویسے تو علاء الدین نے اپنی خودمختاری کا اعلان جولائی ۱۲۹۶ء میں کر دیا تھا لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دہلی کی طرف بڑھ سکے کیونکہ ارکلی خاں میں حکومت کی پوری اہلیت و صلاحیت تھی نیز جلالی اُمراء اُس کی مدد پر تھے اس لئے علاء الدین نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کڑہ سے بنگال کی طرف چلا جائے لیکن اُس کی مشکل کو اس کی قدیم دشمن ملکۂ جہاں نے ابراہیم کو تخت نشین کر کے آسان کر دیا۔ علاء الدین کو جب یہ معلوم ہوا کہ ارکلی خاں ملتان سے دہلی نہیں آئیگا تو وہ بڑا خوش ہوا اور ماہ صفر ۶۹۶ھ مطابق نومبر ۱۲۹۶ء میں کڑہ سے دہلی کی جانب روانہ ہو گیا۔

جلال الدین کے واقعۂ شہادت نے عوام و خواص دونوں کو علاء الدین سے متنفر بنا دیا تھا۔ اُس نے اِس واقعہ کو لوگوں کے دلوں سے فراموش کرنے نیز اپنی طرف راغب کرنے کے لئے دکن کی دولت کو بیدریغ لٹانا شروع کر دیا۔ چنانچہ دہلی آتے وقت اُس نے ہر ہر منزل پر پانچ پانچ من سونے کے پھول ایک چھوٹی منجنیق کے ذریعہ بکھیرنا شروع کر دئیے اس کے علاوہ جو لوگ فوج میں آکر بھرتی ہوتے تھے انہیں صدہا روپیہ بطریق انعام دیا جاتا تھا۔ اس زرپاشی نے عوام النّاس ہی کو نہیں بلکہ عمائدین دہلی کو بھی رام کر لیا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

غرضکہ اس طرح جب وہ بدایوں تک پہونچا تو اس کے پاس ۵۶ ہزار سوار اور ۶۰ ہزار





شمالی ہند کے ... سنہ ۱۲۲۱ء تا ۱۲۹۰ء (مقابل صفحہ ۲۳۰)

پیادے فوج میں داخل ہو چکے تھے۔ علاء الدین نے یہاں کچھ دنوں قیام کیا اس کے بعد براہ گنور برن کی طرف بڑھا برن میں اس کی وہ فوج بھی آکر اُس سے مل گئی جو کڑہ سے ظفر خاں کی ماتحتی میں براہ کول سفر کر رہی تھی۔ رکن الدین ابراہیم نے جن اُمرا[1] کو لاؤ لشکر کے ساتھ علاء الدین کا مقابلہ کرنے کے لئے برن کی طرف بھیجا تھا۔ وہ سب روپیہ کے لالچ میں آکر اُس سے مل گئے۔ علاء الدین نے بعض اُمرا کو بیس اور تیس من اور بعض کو پچاس من تک سونا انعام میں دیا اسی طرح ہر ملک کو ۳ ہزار تنکہ نقد دئے گئے۔ ان حالات کی اطلاع ملکۂ جہاں نے اپنے منجھلے بیٹے ارکلی خاں کو دی اور اپنی غلطی پر اظہار تاسّف کرتے ہوئے اُسے ملتان سے دہلی آنے کی دعوت دی لیکن ارکلی خاں نے آنے سے انکار کر دیا اِس دوران میں علاء الدین برن سے چل کر دہلی کے مقابل دریائے جمنا کے کنارے تک پہونچ چکا تھا اور منتظر تھا کہ دریا کا سیلاب کم ہو تو دہلی پر حملہ کیا جائے۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ ارکلی خاں نے دہلی آنے سے انکار کر دیا ہے تو شادی کے باجے بجوائے۔ اور بڑی خوشی منائی۔ آخر کار دریا کا زور کم ہونے پر "گذرگاہ کاٹھ" سے جمنا کو عبور کر کے صحرا جودہ میں قیام کیا اور یہیں ابراہیم کے لشکر سے اُس کا مقابلہ ہوا۔ لیکن دست بدست جنگ کی نوبت نہیں آئی کیونکہ آدھی رات کیوقت ابراہیم کے لشکر کا بایاں بازو (میسرہ) علاء الدین سے جا کر مل گیا۔ اس پر ابراہیم خائف ہو کر بلا مقابلہ کئے ہوئے آخری شب میں دہلی واپس لوٹ آیا اور کچھ زر و جواہرات اور شاہی حرم کو لیکر ملتان کی طرف فرار ہو گیا۔ اُمرا میں ملک قطب الدین علوی اور ملک احمد حبیب نے اُس کا ساتھ دیا۔

دوسرے دن علاء الدین نے صحرا سیری میں آکر قیام کیا اور یہیں بروز دوشنبہ ماہ ذی الحجہ ۲۲ ۶۹۵ھ[2] کو رسم تخت نشینی بڑے دھوم دھام سے منائی۔ عیش و طرب کے جس قدر

---

[1] :- برنی نے کئی ملوک و اُمراء کے نام گنائے ہیں مثلاً تاج الدین کوچی، امیر علی دیوانہ، اماجی اخور بک، ملک عثمان امیر اخور، ملک امیر کلاں، ملک عمر سرخہ، اور ملک ہرن مارد (ص ۲۴۴) [2]:- ملاحظہ ہو خزائن الفتوح قلمی در کتبخانہ حبیب گنج علی گڑھ

سامان ممکن تھے کمال دریا دلی سے مُہیا کئے گئے۔ بادشاہ کی طرف سے وسیع پیمانے پر لوگوں کی مہمانی اور مدارات کا اہتمام ہوا۔ قدیم عمائد و اُمراء کے مناصب جاگیرات میں اضافے ہوئے۔ نئے عہدے تقسیم کئے گئے۔ مستحقین کو بہت سا روپیہ صدقہ وخیرات میں تقسیم ہوا اور ہر طبقے کے افراد کو حسب مراتب اتنا انعام ملا کہ محتاج فارغ البال اور فارغ البال مالا مال ہو گئے اور ان رنگ رلیوں میں انھیں یہ بات بھی یاد نہ رہی کہ جس شخص کی اطاعت گذاری کا آج حلف اُٹھا رہے ہیں اسی کو چند روز پہلے صلواتیں سُنایا کرتے تھے۔

تخت نشین ہونے کے بعد علاء الدین کے دل میں صرف ایک خلش باقی تھی اور وہ ارکلی خاں وغیرہ کی طرف سے تھی لیکن وہ بھی بہت جلد دفع ہو گئی اُس نے الغ خاں و ظفر خاں کو ملوک و اُمراء کے ساتھ تیس چالیس ہزار سوار دیکر ملتان کی مہم پر روانہ کیا۔ انھوں نے ملتان پہونچکر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اہالیان شہر نے دو ماہ کے بعد لڑنے سے انکار کر دیا اس پر سلطان مرحوم کے لڑکوں نے شیخ الاسلام حضرت شیخ رکن الدینؒ کو درمیان میں ڈال کر جان بخشی کے وعدہ پر اطاعت قبول کر لی۔ علاء الدین نے اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کی لیکن نصرت خاں کوتوال شہر کو دہلی سے بھیجکر ارکلی خاں، رکن الدین ابراہیم الغو خاں مغل کو راستہ میں اندھا کرا کے ہانسی کے قلعہ میں نظر بند کرا دیا اور ملک احمد حبیب کو اندھا کرا کے نیز ملکۂ جہاں کو مع شاہی مستورات کے دہلی لا کر قید کر دیا البتہ ارکلی خاں کے تمام لڑکے قتل کرا دئے گئے۔ یہ سب سنہ جلوس کے پہلے سال کے واقعات ہیں۔ دوسرے سال یعنی ۶۹۶ھ میں کثرہ سے مورخ برنی کے چچا علاء الملک کو بلا کر شہر دہلی کا کوتوال مقرر

علاء الدین نے خواجہ خطیر الدین کو وزارت کا عہدہ [illegible] عہدہ نصرت خاں کو تفویض ہوا۔ قاضی صدر الدین کو قاضی ممالک بنایا۔ عمدۃ الملک کو [illegible] کیا [illegible] کے دونوں لڑکے حمید الدین اور اعز الدین کو بھی ذمہ دار عہدوں پر مقرر کیا۔ نصرت خاں کو [illegible] شہر بنایا۔ امداد بگی ملک فخر الدین کوچی کو ملی اور ظفر خاں کو عارض ممالک کا عہدہ سپرد ہوا۔ اسی طرح اور اُمراء کو بھی اچھے اچھے عہدے دئے گئے۔ (باقی صفحہ ۳۵۰ پر)

کیا اور وزارت کا عہدہ نصرت خاں جلیسری کو دیا۔

مغلوں کا پہلا حملہ ۶۹۶ھ میں

بلبن کے حسن انتظام کی وجہ سے مغلوں کے حملوں میں کمی واقع ہوگئی تھی لیکن اس کے جانشین کیقباد کی غفلت اور فیروز خلجی کی نرم پالیسی نے حکومت کا ڈھچر بگاڑ دیا تھا اسلئے مغل ہندوستان کی سیاسی بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر پھر حملے کرنے لگے۔ پہلے حملے کے فوری اسباب کیا تھے اس کی کسی مورخ نے تصریح نہیں کی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے شہزادہ الغو خاں کے ساتھ برا برتاؤ کئے جانے کی وجہ سے علاء الدین پر حملہ کیا ہو۔ بہرحال ابھی علاء الدین کو تخت پر بیٹھے مشکل سے چند ماہ گذرے تھے کہ مغلوں نے پنجاب کو فتح کرنے کے ارادے سے حملہ کیا اور دریائے سندھ کو عبور کر کے پنجاب خاص میں گھس آئے علاء الدین نے حملہ آوروں کو روکنے کے لئے اپنے سب سے زیادہ بہادر اور معتمد علیہ سپہ سالار الغ خاں اور ظفر خاں روانہ کئے انھوں نے مغلوں کے ٹڈی دل کو جالندھر سے آگے بڑھ کر روکا۔ مغلوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب بیان کی گئی ہے اور غالباً ابھی تک اتنی بڑی تعداد سے اہل دہلی کھلے میدان میں نہیں لڑے تھے لیکن بلبن کے زمانہ کی ہیبت مغلوں کے دلوں پر ابھی تک چھائی ہوئی تھی جس نے بڑا کام کیا اور جنگ کے نتیجے سے بھی ثابت کر دیا کہ سرداروں کی قابلیت اور سپاہیوں کی جانبازی حریف سے کسی طرح کم نہ تھی چنانچہ فرشتہ کی روایت[۱] کے بموجب تقریباً ۱۲ ہزار مغل سپاہی مارے گئے اور انہیں سخت شکست ہوئی[۲]۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۴۶ برنی کے الفاظ یہ ہیں "خلق جہاں فریفتۂ زر گشت کہ نام قبح فعل سلطان علاء الدین وکفران نعمت او بزبان کسے نمیرفت واز ذوق گرفتن زرزر مرداں را پرداختی ہیچ کار سے نماندہ بود" (برنی صفحہ ۲۴۹)

[۲]۔ تاریخ فتحیابی از روئے خزائن الفتوح ۲۲ ربیع الآخر ۶۹۶ھ روز پنجشنبہ ہے۔

[۱]۔ فرشتہ صفحہ ۱۰۲

جلالی اُمراء پر عتاب

اِس کامیابی نے علاء الدین کی سطوت و شوکت کو دوبالا کردیا۔ اسے اب کسی کا ڈر باقی نہیں رہا تھا اسلئے اُن جلالی اُمراء کو سزا دینے کے لئے جنھوں نے سال گذشتہ اپنے آقا سے نمک حرامی کر کے علاء الدین کا ساتھ دیا تھا نصرت خاں کو مامور کیا تاکہ ان سے وہ روپیہ وصول کرے جو بطریق رشوت ان کو دیا گیا تھا۔ اس میں قدیم اُمراء پر بڑی بڑی سختیاں ہوئیں۔ طبقہ اعلیٰ کے بہت کم خاندان[1] ایسے تھے جو نصرت خاں وزیر کے جبر و تشدد سے محفوظ رہے ورنہ قدیم اُمراء کا تمام مال و اسباب ضبط کرلیا گیا۔ اُن کی جاگیریں چھین لی گئیں اور بعض نہایت سخت سزائیں دی گئیں۔ جس کی وجہ سے طبقہ اُمراء میں دوبارہ بیزاری کی لہر دوڑ گئی مگر بادشاہ نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اس کو فوجی تیاریوں کے لئے روپیہ کی سخت ضرورت تھی۔ نصرت خاں نے کم و بیش ایک کروڑ روپیہ کا مال اُمراء جلالی سے وصول کر کے شاہی خزانہ میں داخل کیا۔

گجرات پر حملہ[2]

اِس روپیہ سے ایک بڑی فوج تیار کر کے اُلغ خاں اور نصرت خاں کو سپہ سالار بنا کر گجرات کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ گجرات کا دار السلطنت انہلواڑہ قطب الدین ایبک کے عہد حکومت میں فتح ہوچکا تھا لیکن پورے جزیرہ نمائے گجرات پر مسلمانوں کا تسلط نہیں ہوا تھا اس لئے اِس اکیلے شہر پر بھی اسلامی حکومت

ع۱: ۔ برنی کی روایت کے بموجب صرف تین خاندان ایسے تھے جو بچ گئے ایک ملک قطب الدین علوی کا، دوسرا نصیر الدین شحنہ پیل اور تیسرا خاندان ملک امیر جمالی کا۔ یہ تینوں خاندان آخر تک جلال الدین کے لڑکوں کے مددگار رہے تھے اور نہ انھوں نے علاء الدین سے ایک حبہ رشوت کا لیا تھا (ضیائے برنی ص۲۵۱)۔ ملک قطب الدین علوی کے مزید حالات کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی ص۲۰۲ از ضیائے برنی۔

ع۲: ۔ گجرات پر حملہ کی تاریخ خزائن الفتوح میں نظر سے گذری حضرت امیر خسروؒ تحریر فرماتے ہیں ؎

یعنی کہ چہار شنبہ و زاول جمادی بیست　　　　تاریخ سال ششصد و ہشت و نود شدہ

۔۔۲۰ جمادی الاول ۶۹۸ھ بروز چہارشنبہ۔

غالباً زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رہ سکی کیونکہ گجرات کے شاداب علاقے سے قطع تعلق ہوتے ہی
اس کے ہر طرف راجپوتانہ کا ویران ریگستانی علاقہ رہ گیا اور حکومت دہلی کے لئے یہ بات
نہایت دشوار ہو گئی کہ وہاں کوئی بڑی چھاونی بنا کر اسے اپنے دوسرے مقبوضات سے کمک
پہونچانے کا انتظام کردیتی۔ گو یہ بات کہیں صراحت کے ساتھ تحریر نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے
کہ قطب الدین کے بعد ہی اسلامی فوجوں کو یہاں سے واپس بلانا پڑا اور اس شہر پر بھی گجرات
کے راجاؤں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا تھا۔

بہرحال علائی فوج جب گجرات پہونچی تو وہاں کا راجہ کرن تاب مقاومت نہ لا کر فرار
ہو گیا اور دیوگری کے راجہ رام چندر یارامدیو کے پاس جا کر پناہ گزیں ہو گیا۔ وہ اتنی بدحواسی
کے عالم میں بھاگا تھا کہ ساتھ میں نہ اپنی بیوی کنولادیوی کو اور نہ اپنے خزانے کو ہمراہ لیجا سکا
چنانچہ کنولادیوی کو دہلی بحفاظت تمام پہونچا دیا گیا جہاں سلطان علاء الدین نے اس کو
اپنے نکاح میں لے کر بانوئے سلطنت اور ملکۂ جہاں بنا دیا۔

انہلواڑہ پر (جس کو اب پٹن کہتے ہیں) قبضہ کرنے کے بعد نصرت خاں کچھ اور کھمبایت
کی طرف گیا اور وہاں کے ساہوکاروں سے خوب روپیہ وصول کیا۔ یہیں اس نے ایک
نیچ قوم کے برواری ہندو کو جسے خوجہ بنا کر ایک ہندو ساہوکار نے اپنا غلام بنا رکھا تھا اس
کے مالک سے زبردستی چھین لیا۔ یہی وہ غلام تھا جو علاء الدین کی خدمت میں پہونچکر ملک
کافور بنا اور پھر رفتہ رفتہ ہزار دیناری اور بالآخر وزیر ممالک بن گیا۔

گجرات و کھمبایت کی فتح اور وہاں کے انتظامات سے فارغ ہو کر جب الغ خاں اور
نصرت خاں دہلی کی طرف واپس ہوئے تو راستہ میں جالر (جھالر) کے مقام پر مالِ غنیمت
پر فوجیوں سے جھگڑا ہو گیا۔ چونکہ اکثر و بیشتر سپاہیوں کے پاس مالِ غنیمت خمس سے
زائد تھا اسلئے سرداران لشکر نے سپاہیوں کی تلاشی کا حکم دیا۔ اس سلسلے میں سپاہیوں پر بڑی
سختیاں کی گئیں، انہیں زدوکوب کیا گیا اور بُری طرح پیٹا گیا۔ اس پر نومسلم مغل سپاہی یکدل

ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو گئے اور دو تین ہزار سواروں نے بغاوت کر کے وزیر نصرت خاں کے بھائی ملک اعز الدین کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد الغ خاں کے خیمہ کی طرف بڑھے لیکن الغ خاں موقع کی نزاکت کو دیکھ کر نصرت خاں کے خیمہ کی طرف چلا آیا تھا۔ باغیوں نے خیمہ میں داخل ہو کر علاء الدین کے ہمشیر زادے کو الغ خاں کے دھوکے میں قتل کر دیا۔ اس عرصہ میں وفادار سپاہی نصرت خاں کی بارگاہ کے سامنے جمع ہو گئے۔ اُن کی مدد سے بلوائیوں کو منتشر کر دیا گیا۔ یہ لوگ آوارہ ہو کر رنتھمبور کے راجہ ہمیر دیو کے پاس چلے گئے۔ مال غنیمت کی فراہمی کے احکامات کو منسوخ کر دیا گیا اور پھر بغیر کسی حادثے کے دونوں شاہی لشکر معہ مال غنیمت دہلی پہونچ گئے۔

بلوائیوں سے انتقام

علاء الدین نے نومسلم مغل اُمراء و سپاہیوں کے بلوہ کی خبر سنتے ہی اُن کے اہل و عیال کو دہلی میں قید کر دیا یہ نئی بدعت تھی جو علاء الدین کی خودسری کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں پہلے پہل ظہور میں آئی ورنہ باغیوں کے عورتوں اور بچوں سے حکومت تعارض نہیں کیا کرتی تھی۔ نصرت خاں نے دہلی پہونچکر جوش انتقام میں عورتوں اور بچوں کو جلّادوں کے سپرد کر دیا جنھوں نے بڑی اذیتوں کے ساتھ ان کو قتل کر ڈالا۔ مورخ برنی نے اس پر بڑی حیرت و نفرت کا اظہار کیا ہے کیونکہ یہ ظالمانہ فعل بالکل نئے طرز کا تھا اور احکامات اسلامی کے سراسر خلاف چنانچہ لکھتا ہے کہ "ایں ظلم در ہیچ دینی و مذہبی نہ کردہ اند کہ او کرد و ہرچہ ازیں بابت ہا از و در وجود می آمد خلق دہلی در تعجب و حیرت می شد و لرزہ در سینۂ خلائق می افتاد"[1]

مہم سیوستان

۶۹۹ھ کے شروع میں جبکہ گجرات کی تسخیر کے لئے فوجیں روانہ کی گئیں علاء الدین نے ایک فوج ظفر خاں کے ماتحت سیوستان (واقع سندھ) بھیجی۔ سیوستان سندھ کا ایک حصّہ اور سلطنت دہلی کا ایک جز تھا جہاں عرصہ سے ایک

---

[1] ضیائے برنی ص ۲۵۳

قبول نہیں کیا اور مغلوں سے دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھان لی۔ اس کا یہ فیصلہ کچھ تو انہی فطری شجاعت کی بنا پر اور زائد تر اپنی فوج کے اوپر اعتماد و بھروسہ کی وجہ سے تھا جس کے لڑانے والے ظفر خاں، الغ خاں، رکن خاں اور غازی ملک جیسے آزمودہ کار سپہ سالار تھے جنھوں نے پہلے بھی مغلوں کو شکستیں دے کر نام پیدا کیا تھا۔

مغلوں کی فوج ۲۰ تمن[۱] (۲ لاکھ) تھی اور دہلی کی سپاہ میں بقول فرشتہ تین لاکھ[۲] صرف سوار تھے۔ ہندوستان میں اس سے پہلے اور نہ بعد کو پایۂ تخت دہلی کے زیر حصار اتنی بڑی لڑائی ہوئی جس میں فریقین کی فوجوں کا شمارہ لاکھ تک پہونچا ہو بلکہ جنگ مہابھارت کی افسانوی حیثیت سے قطع نظر پانی پت کی تیسری لڑائی کے سوا پوری تاریخ ہند میں اور کسی جنگ کا پتہ نہیں چلتا جس میں لڑنے والوں کا شمار مذکورہ بالا تعداد کے قریب پہونچ گیا ہو۔ علاء الدین نے شہر سیری کو علاء الملک کی سپردگی میں دیکر پھاٹکوں کو بند کرا دیا اور خود شہر سے باہر نکل کر کیلی (غالباً مہرولی) کے صحرا میں اپنی فوجوں کو لڑنے کے لئے ترتیب دیا۔ اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دہلی کے حربی ماہروں نے ہندوستان کے جنگی ہاتھیوں کو سدھا کر جس قدر کارآمد شئے بنا دیا تھا اس سے اسلامی حکومت کے فن حرب میں ترقی کا ثبوت ملتا ہے۔ پیل و اسپ کا متحدہ حملہ روکنا غنیم کو دشوار ہو جاتا تھا۔ گو مغل حملہ آور اس "بلائے سیاہ" سے ناواقف نہ تھے اور اُن کی جرأت و گزیر پائی میں بھی کوئی کلام نہیں ہو سکتا لیکن جس وقت "ظفر خاں" جو کہ شجاعت میں رستم ثانی تھا فوج میمنہ کو لیکر آگے بڑھا اور اُس کے جنگی ہاتھیوں کے خوفناک حملے کے ساتھ ہی سواران دہلی گھوڑے اُڑا کر دشمن پر جا پڑے تو مغلوں کا بایاں بازو یعنی "میسرہ" اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکا۔ اس کی صفیں ٹوٹ گئیں اور اُن کے پیچھے ہٹتے ہی ظفر خاں نے اس طرح گھیر کر دبا یا کہ وہ مغلوں کے قلب سے جدا ہو کر دور

۱:۔ برنی صفحہ ۲۵۳ ۔ ۲:۔ فرشتہ صفحہ ۱۱۴

ہوتا چلا گیا۔

مغل سرداروں نے اب یہ کوشش کی کہ جس طرح ممکن ہو اس گھیرے سے اپنی صفیں نکال کر اصلی لشکر سے جا ملیں لیکن ظفر خاں کے پیہم حملوں نے انہیں صف بندی اور جم کر لڑنے کی قطعی فرصت نہ دی۔ دیر تک یہی صورتِ جنگ قائم رہی۔ مغل سپاہی ظفر خاں کی شکل دیکھ کر سہمے جاتے تھے جو ہر خطرناک مقام پر سب سے آگے نظر آتا تھا۔ برنی کی روایت[1] یہ ہے کہ وہ مغلوں کی فوج کو بھگاتا اور مارتا ہوا چھتیس میل تک پیچھے ہٹا لایا۔ اس موقع پر علاء الدین کی فوج میسرہ نے جو الغ خاں کے ماتحت تھی اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ اس کو چونکہ ظفر خاں سے حسد تھا اسلئے وہ خاموش اپنی جگہ پر کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ اس بات کو مغلوں کے ایک بہادر سردار "طرغی" نامی نے بھانپ لیا اور یہ دیکھ کر کہ ظفر خاں کی پشت پر کوئی مددگار فوج نہیں ہے تو پیچھے سے آکر اس کو گھیر لیا۔ ظفر خاں دشمن کے نرغہ میں گھر کر گھوڑے سے گرا اس پر بھی وہ دشمن سے برابر لڑتا رہا۔ قتلغ خواجہ نے اس کو پیام دیا کہ اگر وہ اطاعت قبول کرے تو مغلوں کا شہنشاہ علاء الدین سے زیادہ اُس کی قدر کرے گا۔ لیکن اُس نے کوئی توجہ نہ دی اور آخر کار پیادہ لڑتا ہوا مارا گیا۔

ظفر خاں کی شہادت سے اگرچہ علاء الدین کے دل کی کھٹک جاتی رہی لیکن شمشیر زنی کا مغلوں کے اوپر سکہ بیٹھ گیا جسے ہمعصر مورخ نے شاعرانہ آب و تاب کے ساتھ بیان کیا ہے[2]۔ ویسے بھی مغل سپہ سالار کو حریف کی کثرتِ سپاہ دیکھ کر اپنی فتح سے مایوسی ہوگئی اور وہ راتوں رات دہلی سے تیس میل ہٹ گیا اور پھر جس قدر جلد ممکن ہو المبی منزلیں کرتا ہوا اپنی فوج کو ہندوستان سے واپس لے گیا۔

---

[1] :۔ ضیائے برنی صفحہ ۲۶۰

[2] :۔ برنی نے لکھا ہے کہ مغلوں کے گھوڑے جب پانی پیتے پیتے ٹھٹک رہتے تھے تو جانور کو مخاطب کرکے کہتے تھے کہ پانی کیوں نہیں پیتا کیا تو نے ظفر خاں کو دیکھ لیا ہے (برنی صفحہ ۲۶۱)۔

ملک کے اندر انتشار پھیل جائیگا اور فتنہ و فساد کے سوکھے چشمے جاری ہوجائیں گے[1]۔ بادشاہ کی سمجھ میں یہ بات بھی آگئی اور اُس نے کشور کشائی کے لئے ہندوستان سے باہر جانے کا ارادہ ترک کردیا لیکن ۱۲۹۸ء میں مغلوں کے دوسرے حملہ کو دفع کرنے کے بعد سکندر ثانی کا خطاب اپنے لئے تجویز کیا اور یہی خطاب سکوں اور خطبوں میں داخل ہوا۔

مہم رن تھمبور

جلال الدین خلجی کی نرم پالیسی کی وجہ سے رن تھمبور کی دیواروں سے شاہی فوجیں ہو چکی واپس آگئیں اور اُس کی تسخیر کچھ دنوں کے لئے ملتوی ہوگئی لیکن علاء الدین خلجی دوسرے قسم کا بادشاہ تھا وہ رن تھمبور کی اہمیت کو سمجھتا تھا اس لئے مغلوں کے دوسرے حملہ کو دفع کرنے کے بعد اُس نے الغ خاں حاکم بیانہ کو رن تھمبور پر چڑھائی کرنے کا حکم دیا۔ رن تھمبور پر حملہ آور ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ مہم گجرات کے باغی محمد شاہ وکا بہرو وغیرہ کو وہاں کے راجہ نے پناہ دی تھی[2]۔ علاء الدین نے نصرت خاں حاکم کڑہ کو لکھا کہ وہ الغ خاں کی پوری پوری مدد کرے چنانچہ ۱۲۹۹ء میں الغ خاں اور نصرت خاں نے جاکر پہلے قلعہ جھائین[3] کو فتح کیا اس کے بعد رن تھمبور کا محاصرہ کرلیا۔ اس محاصرہ میں نصرت خاں ایک پتھر کے لگنے سے مارا گیا۔ اور الغ خاں کو بھی ناکام ہوکر جھاین واپس لوٹ آنا پڑا۔ یہ خبر سُن کر علاء الدین خود امدادی فوجیں لیکر روانہ ہوگیا۔

---

[1] - علاء الملک کی راست گفتاری سے بادشاہ بہت متاثر ہوا اور خوش ہوکر علاوہ خلعت فاخرہ کے دس ہزار تنکہ اور دو گاؤں انعام میں دئے اور الغ خاں، ظفر خاں، نصرت خاں اور الپ خاں ان چاروں نے جو گفتگو میں شریک تھے تین تین چار چار ہزار تنکہ معہ گھوڑوں کے اسکی خدمت میں پیش کئے۔ ترتیب زمانی کے لحاظ سے علاء الدین کے دماغ میں یہ نئی باتیں مغلوں کے دوسرے حملے سے پہلے پیدا ہوئی تھیں جبکہ ظفر خاں زندہ تھا (ملاحظہ ہو برنی صفحہ ۲۷۱)

[2] - ملاحظہ ہو ضیائے برنی صفحہ ۲۸۲، فتوح السلاطین صفحہ ۲۶۱ و صفحہ ۲۴۵، طبقات اکبری صفحہ ۱۵۹، فرشتہ صفحہ ۱۰۸

[3] [illegible]

(باقی مضمون صفحہ ۴۵۳ پر)

آکت خاں کی بغاوت[1]

راستہ میں تلپت کے مقام پر بادشاہ شکار کھیلنے کے لئے رک گیا۔ ایک دن شکار کھیلتا ہوا لشکرگاہ سے دور نکل گیا۔ اور رات ہو جانے کی وجہ سے ایک گانوں میں ٹھہر گیا۔ صبح ہونے پر اس نے کھیدے کا حکم دیا۔ کھیدے کے لئے جمعیت منتشر ہو گئی اور اس کے پاس صرف چند آدمی باقی رہ گئے۔ بادشاہ اطمینان کے ساتھ موڑھ پر بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں اس کا بھتیجا آکت خاں جو وکیلدری کے عہدہ پر فائز تھا معہ چند نو مسلم مغل سپاہیوں کے نمودار ہوا اور تیروں سے بادشاہ پر حملہ کر دیا اس کا ارادہ تھا کہ جس طرح علاء الدین نے اپنے چچا کو مار کر تخت حاصل کیا ہے اسی طرح وہ بھی اپنے چچا علاء الدین کو مار کر تخت حکومت کا مالک بن جائے۔ یہ زمانہ موسم سرما کا تھا اسلئے بادشاہ موٹے قسم کے کپڑے پہنے ہوئے تھا اس نے موڑھ پر تیروں کے وار روکے اور اس کے ایک غلام "مالک" نامی نے اس کو اپنی آڑ میں لے لیا پھر بھی بادشاہ کے بازو پر دو تیر لگے جن کی وجہ سے وہ زخمی ہو گیا اتنے میں حملہ آور اور بھی قریب آگئے اور ممکن تھا کہ بادشاہ کا خاتمہ کر دیں کہ اس کے غلام چلا پڑے "بادشاہ مرگیا، بادشاہ مرگیا" آکت خاں نے عجلت میں بادشاہ کو مردہ خیال کر کے وہیں چھوڑ دیا اور خود معہ باغی سواروں کے لشکرگاہ میں پہونچکر اپنے

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۵۸ – جس طرح پرتھوی راسو میں چاند بردائی نے محمد غوری اور پرتھوی راج کی لڑائی کا ایک من گھڑت سبب تحریر کیا ہے ٹھیک اسی طرح ہمیر مہا کاویہ میں علاء الدین اور راجہ ہمیر دیو کی جنگ کا ایک افسانوی قصہ تراش کر موٴلف نے پوری عمارت تیار کی ہے۔ قصہ نہایت لغو اور شرافت کے معیار سے گرا ہوا ہے اور جو عقلاً و نقلاً کسی اعتبار سے قابل قبول نہیں۔ [3] اس قلعہ کے بن جانے سے رن تھمبور کی جنگی قوت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس کے محل وقوع کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ غالباً ویران و برباد ہو گیا۔

[1] – آکت خاں کا پورا نام سلیمان شاہ آکتخاں ہے (ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ صفحہ ۱۰۶)

بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اِدھر علاء الدین کو جب ہوش آیا۔ تو اُس نے یہ ارادہ کیا کہ وہ کسی طرح الغ خاں کے پاس جھاین پہونچ جائے تاکہ وہاں سے حصول سلطنت کے لئے دوبارہ کوشش کرے مگر اُس کے ایک سردار ملک حمید الدین نے جو نائب وکیلدر تھا۔ بادشاہ کو اس کے ارادے سے باز رکھا اور اس کو لشکرگاہ میں واپس لوٹ چلنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ علاء الدین لشکرگاہ کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ فاصلے پر تھا کہ اُمراء سلطنت کی نظر چتر شاہی پر پڑی جس سے اُن کو علاء الدین کے زندہ ہونے کا یقین ہو گیا اور سب کے سب آکت خاں کو چھوڑ کر علاء الدین سے آکر مل گئے۔ آکت خاں یہ رنگ دیکھ کر گھوڑے پر سوار ہو کر افغانپور کی طرف بھاگا مگر ملک اعزالدین یناں خاں اور نصیرالدین نور خاں نے اس کا تعاقب کر کے سر کاٹ لیا اور علاء الدین کے سامنے لاکر پیش کیا بادشاہ نے اس سر کو سارے لشکر میں تشہیر کرایا اور پھر دہلی بھیج دیا تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔ آکت خاں کے چھوٹے بھائی قتلغ خواجہ کو بھی بادشاہ نے قتل کرا دیا۔ اور اس کے علاوہ جتنے باغی تھے سب کو تلاش کر کے تہ تیغ کرایا[ا]۔

رن تھمبور کا حشر

اِس حادثہ کی وجہ سے بادشاہ کو رن تھمبور پہونچنے میں دیر لگی لیکن بادشاہ کی روانگی کا حال سُن کر الغ خاں نے جھاین سے نکل کر رن تھمبور کا دوبارہ محاصرہ کر لیا تھا۔ علاء الدین کی آمد نے گو محاصرین کی ہمتیں بڑھا دیں پھر بھی قلعہ کے فتح کرنے میں ایک سال[۲] کا عرصہ لگا اور ۱۳۰۱ء کے اخیر میں

---

۱ :- مولانا عصامی نے جو برنی کے ہمعصر ہیں فتوح السلاطین میں اِس بغاوت کا ذکر چتوڑ کی تسخیر کے سلسلہ میں کیا ہے اور باغی کا نام سلیمان شہ تحریر کیا ہے (ملاحظہ ہوں صـ ۲۶۹ تا صـ ۲۷۱) لیکن عصامی کی روایت کو برنی کے مقابلہ میں ترجیح نہیں دی جا سکتی کیونکہ برنی نے عہد علائی کی مستند روایات کو اپنے بزرگوں سے سُنا ہے جن کو حکومت کے معاملات سے زیادہ صحیح واقفیت تھی۔ ۲ :- رن تھمبور کی تسخیر میں علاء الدین کو کتنا عرصہ لگا اور قلعہ کب فتح ہوا اس کی کسی مورخ نے تصریح نہیں کی۔

(باقی مضمون صفحہ ۳۵۸ پر)

ہمیر دیو کے دو غدّار سرداروں رن پال اور کرشن پال کی مدد سے قلعہ فتح ہو سکا۔
راجہ ہمیر دیو جو پرتھی راج کی نسل سے تھا مارا گیا اور اُس کا بہادر نو مسلم منگل[1] سردار
"محمد شاہ" نامی میدانِ جنگ میں زخمی پایا گیا۔ علاء الدین نے اپنے اس باغی نو مسلم منگل،
سردار کو دیکھ کر پوچھا کہ "اگر تیرا علاج کرا دیا جائے تو اچھا ہو کر میرے ساتھ کیا سلوک
کرے گا" زخمی سردار نے جواب دیا کہ "تندرست ہو کر تجھ کو قتل کروں گا اور تیری جگہ
ہمیر دیو کے لڑکے کو ہندوستان کا بادشاہ بناؤں گا"، اس پر علاء الدین نے اس
کو ہاتھی کے پیر سے کچلوا دیا۔ مگر پھر اُس کی بہادری کا خیال کر کے اُس کی لاش کو
فوجی اعزاز و اکرام کے ساتھ دفن کرا دیا۔

رن تھمبور کو فتح کرنے کے بعد اُس نے اُن تمام غدّار ہندوؤں کو جنھوں نے اپنے
راجہ[2] سے بیوفائی کی تھی یہ کہہ کر قتل کرا دیا کہ "جس نے اپنے مالک سے وفا نہیں کی وہ ہم
سے کب وفا کرے گا"[3]، یہی سلوک اُس نے اُن تمام جلالی اُمراء کے ساتھ برتا تھا جنھوں
نے رکن الدین ابراہیم کا ساتھ چھوڑ کر علاء الدین کی موافقت کی تھی۔ بہر حال رنتھمبور کی
حکومت اپنے بھائی الغ خاں کو سپرد کرنے کے بعد خود دہلی چلا آیا۔ اُس کے پیچھے پانچ

بقیہ مضمون صفحہ ۳۵۷:- برنی نے "حاجی" کی بغاوت کے سلسلہ میں ایک جگہ اشارہ کیا ہے
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم ۳ سال میں سر ہوئی۔ اس لئے ۱۳۰۱ء قیاسی ہے۔

[1]:- گجرات کی مہم میں واپسی کے وقت یہ سردار باغی ہو کر راجہ ہمیر دیو کے پاس ملازم ہو گیا تھا۔

[2]:- راجہ ہمیر دیو بہادروں کی کتنی قدر کرتا تھا اور خود بھی کتنا بہادر اور آن بان کا راجہ تھا اس کا اندازہ
اس سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے اپنی پناہ میں آئے ہوئے مہمان یعنی محمد شاہ کو دشمن کے سپرد کرنے کے بجائے
اسکو گوارا کر لیا کہ اپنی عزت و آبرو اور جان و مال کو اپنی آن پر قربان کر دے چنانچہ نیاء چندر شاعر نے
ہمیر مہا کاویہ میں اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ
"ہمیر دیو نے اپنی پناہ میں آئے ہوئے محمد شاہ کی خاطر (دھرم رکھشا) کو نبھانے کے لئے اپنی جان و مال اور

(باقی مضمون صفحہ ۳۵۹)

چاہا اُس نے اپنی طرفدار ایک جماعت بنا کر رمضان المبارک کے مہینہ میں ایک دن دوپہر کے وقت جبکہ مئی و جون کی گرمی کی وجہ سے شہر کی سڑکیں سنسان پڑی ہوئی تھیں ترمذی کوتوال کے مکان پر پہونچکر اسے دھوکہ سے قتل کر دیا۔ اس کے بعد سیری کے کوتول علاء الدین ایاز کو بھی قتل کرنے کی تدبیر کی لیکن وہ دھوکہ میں نہیں آیا۔ اُس نے شہر کے پھاٹک بند کرا دئے اور محصور ہو بیٹھا۔ حاجی نے اس کے بعد کوشک لعل میں پہونچکر ایک علوی کو جو ماں کی طرف سے سلطان التمش سے نسبت رکھتا تھا۔ زبردستی تخت پر بٹھا دیا۔ جیل کو توڑ کر قیدیوں کو رہا کر دیا۔ شاہی خزانہ لوٹ لیا اور عمائدین شہر کو علوی کی اطاعت کے لئے مجبور کیا۔

حاجی و علوی کا طوفانِ بے تمیزی سات یا آٹھ دن تک رہا۔ چوتھے دن امیر کوہ ملک حمید الدین نے اپنے لڑکوں اور رشتہ داروں کی مدد سے شہر کے غربی دروازے کھنڈار کل پر قبضہ کر لیا اور پھر رفتہ رفتہ شہر کے وفادار باشندوں نیز اطراف کے جاگیرداروں کی مدد سے اس بغاوت کو فرو کر دیا۔ حاجی مارا گیا اور نصیب سید کا سر اُتار کر علاء الدین کے پاس رنتھمبور بھیج دیا گیا۔

یہ چاروں بغاوتیں جو یکے بعد دیگرے ہوئیں علاء الدین کو ہوشیار و چوکنا کر دینے کے لئے کافی تھیں اُسے یقین ہو گیا کہ اُس کے نظام حکومت میں کچھ نہ کچھ خرابی ضرور ہے اس کے لئے اُس نے اپنے مشیرانِ سلطنت سے دن و رات مشورے کئے اور آخر میں وہ جس نتیجہ پر پہونچے اُس کا ذکر انتظام سلطنت کے ضمن میں کیا جائیگا۔

ع ۱؎ حاجی دوپہر کے وقت جبکہ شہر کی مخلوق اپنے گھروں میں آرام کر رہی تھی اور گرمی کی وجہ سے سڑکوں پر آمد و رفت بند تھی کچھ روپی کا غذات لئے ہوئے ترمذی کے مکان پر پہونچا اس وقت ترمذی آرام کر رہا تھا اطلاع ہونے پر سادہ لباس میں باہر نکل آیا۔ اُس کو دیکھتے ہی حاجی نے پہرہ دینے والے سپاہیوں سے کاغذات کیطرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ شاہی فرمان ہے۔ اسمیں ترمذی کے قتل کا حکم ہے چنانچہ سپاہیوں نے ترمذی کو قتل کر ڈالا۔ (ضیاء برنی صفحہ ۲۷۹)

بعد اُس نے راجہ کے بھانجے آرسی سے چتوڑ کی شورش کے دبانے کا مشورہ کیا اور اس کے مشورہ کے مطابق رانی پدمنی کو دعوت دی کہ وہ رتن سین کے پاس دہلی چلی آئے اور عزت کی زندگی بسر کرے لیکن راجپوت سرداروں نے یہ چال چلی کہ بجائے پدمنی کے مسلح راجپوتوں کو چند پالکیوں میں بٹھا کر اور بہت سے راجپوتوں کو تیز رفتار گھوڑوں پر محافظ دستہ کے طور پر مامور کر کے دہلی روانہ کر دیا۔ اور یہ شہرت دی کہ رانی حسب اجازت بادشاہ دہلی اور حسب الطلب راجہ رتن سین دہلی کو جا رہی ہے اسلئے راستہ میں چتوڑ سے دہلی تک ان کا کوئی بھی مزاحم نہ ہوا جب یہ مصنوعی سواری دہلی پہونچی تو راجہ تمام نظربندی سے چند محافظوں کی نگرانی میں رانی کے استقبال کے لئے باہر نکلا لیکن جیونہی وہ مصنوعی سواری کے قریب پہونچا راجپوتوں نے ڈولوں سے نکل کر راجہ کو گھوڑے پر بٹھا کر چتوڑ کی طرف روانہ کر دیا اور اس طرح یہ پارٹی بطریق بلغار نوابِ چتوڑ میں ایک محفوظ مقام پر پہونچ گئی۔

سلطان علاءالدین راجپوتوں کی اس چالاکی پر حیران رہ گیا۔ اُس نے مفرور راجہ کے بھانجے آرسی کو چتوڑ کی سند حکومت دیکر روانہ کیا جس نے چتوڑ پہونچ کر خضر خاں کو معزول کر کے دہلی بھیج دیا اور خود کوشش کر کے تمام راجپوتوں کو جیتا اور ان کو بڑی محبت سے اپنی جانب مائل کر لیا۔ رتن سین اور اس کی رانی گمنامی کی تاریکی میں غائب ہو گئے اور راجہ مالدیو (آرسی) تا زیست دہلی کا فرمانبردار رہا۔ وہ بوقت ضرورت مرکزی حکومت کی ۵ ہزار سوار اور دس ہزار پیدل سپاہ سے مدد کیا کرتا تھا۔[1]

یہ اصل واقعہ تھا جس کو قصہ گویوں اور بعض یورپی مورخین نے علاءالدین اور پدمنی کے حسن و عشق کی ایک عجیب و غریب داستان بنا دیا ہے۔ مرقع چتوڑ میں جو دلچسپ داستان [illegible] ہے

---

[1] بحوالہ فرشتہ صفحہ ۱۱۵ مقالہ ۷ ... ٹاڈ صاحب کا یہ بیان کہ جب علاءالدین چتوڑ سے گئے تھے تو ایسی کوئی صورت واقع ہو کر عمل میں لائے محض طلب پر سبحان رائے جس نے پدماوت کی حوالے سے اس فرضی داستان کو خوب [illegible] (ملاحظہ ہو [illegible] صفحہ ۱۲۱)

چھوٹے بڑے واقعہ کو کھول کر بیان کرتا ہے چتوڑ کی فتح کو سرسری طور پر اس طرح لکھتا ہے گویا یہ ایک معمولی واقعہ تھا حالانکہ یہ ایک اہم چیز تھی بشرطیکہ اس میں کچھ حقیقت ہوتی جو برنی کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتی تھی۔ بہر حال چتوڑ کی کل ریاست کی تسخیر ۱۳۰۳ء تک مکمل ہو گئی۔

مالوہ پر حملہ

۱۳۰۵ء میں علاء الدین نے الپ خاں الملقب الغ خاں ثانی کو گجرات کا صوبیدار مقرر کیا اور عین الملک [illegible] کو فوجیں دیکر اُجین، چندیری اور جالور یا جھالور پر فوج کشی کو [illegible] مامور کیا۔ مالوہ کے راجہ کوکا یا ہرنند نے ایک لاکھ پیادے اور چالیس ہزار سوار لیکر عین الملک کا مقابلہ کیا۔ محاربۂ عظیم کے بعد مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور اُجین، مانڈو، دھار اور چندیری وغیرہ پر قبضہ ہوگیا۔ جالور کا چوہان راجہ کنور دیو کانہ دیو خود بخود مطیع ہوگیا اور عین الملک کے ساتھ دہلی آ کر بادشاہ کے سامنے اظہار اطاعت کیا۔

۱۳۰۸ء کے آخر میں کنور دیو سے آثار سرکشی ظاہر ہوئے اُس نے ایک موقع پر یہ ڈینگ ماری تھی کہ سلطان علاء الدین اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ علاء الدین نے راجا کو نیچا دکھانے کے لئے اس کے مقابلہ پر اپنی ایک لونڈی "گل بہشت" نامی کو سپہ سالار بنا کر جالور پر جالور بھیجا۔ گل بہشت نے راجہ کو قریباً مغلوب کر لیا تھا کہ اُس کا انتقال ہوگیا اُس کے مرنے کے بعد شاہی افواج کی کمان اُس کے بیٹے شاہین کے قبضۂ اقتدار میں آئی۔ شاہین سپہ سالار سپاہی نہ تھا اس لئے راجہ کے مقابلہ میں اُسے شکست ہوئی لیکن جب کمال الدین گرگ امدادی فوج لیکر آیا تو راجہ مغلوب ہوگیا اور مع اپنے رشتہ داروں کے مارا گیا۔ جالور کا دہلی سے الحاق کر لیا گیا۔

مہم وارنگل

۱۳۰۹ء میں جب ملک کافور کو دکن کی مہم پر روانہ کیا گیا تو آئینۂ اکبری کی روایت کے موجب ایک فوج بادشاہ کے حسب سے زیادہ مشہور

ومضبوط قلعہ سوانا کی تسخیر کے لئے بھی روانہ کی گئی کیونکہ وہاں کے راجہ ستیل دیو سے آثار
سرکشی ظاہر ہوئے تھے۔ محاصرہ نے جب طول پکڑا تو بادشاہ نے دہلی سے خود جاکر
راجہ کی گوشمالی کی۔ راجہ نے صلح کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی لیکن سلطان کے
سامنے آنے سے گریز کیا۔ اظہار اطاعت کے لئے اپنی تمثال سونے کی بنوا کر اور
اُس کے گلے میں زنجیر ڈال کر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کی لیکن بادشاہ نے اُس
کی خطا اُس وقت تک معاف نہیں کی جب تک کہ وہ راجہ خود بنفس نفیس اپنے گلے
میں زنجیر ڈال کر حاضر نہ ہوا۔ قلعہ راجہ کو واپس کر دیا گیا لیکن قلعہ کے اندر کی ہر چیز
حتیٰ کہ چاقو اور سوئی تک ضبط کر لی گئی۔

شمالی ہند کی تسخیر دراصل ۱۳۰۵ء تک ختم ہو جاتی ہے اسلئے اب علاءالدین
نے توسیع مملکت کے لئے دکن کی طرف توجہ کی لیکن قبل اس کے کہ ہم دکن میں آئیں ہمیں
اتنا اور بتانا ہے کہ بادشاہ نے مغلوں کا کس طرح مقابلہ کیا۔ ○

مغلوں کے حملے

تیسرا حملہ چتور کی مہم سے فارغ ہو کر جب بادشاہ دہلی پہونچا تو اسے "طرغی بیگ" کا
سامنا کرنا پڑا۔ مغلوں نے یہ معلوم کر کے کہ بادشاہ چتور کی مہم میں مصروف
ہے اور دارالسلطنت سے دور دراز کے فاصلہ پر مقیم ہے اسلئے دہلی کو خالی سمجھ کر ان
کا سپہ سالار "طرغی" جو قتلغ خواجہ کی ہمراہی میں پچھلی مرتبہ ہندوستان کو اچھی طرح دیکھ چکا
گیا تھا ایک لاکھ بیس ہزار سوار لیکر نہایت تیزی کوچ کرتا ہوا پایہ تخت کے قریب آپہونچا۔
علاءالدین اُس وقت تک چتور سے واپس ہو کر دہلی پہونچ چکا تھا لیکن حالت یہ تھی کہ
چتور کی مہم میں بہت کچھ سامان جنگ برباد ہو گیا تھا۔ فوج بیشتر صوبوں کی گئی تھی
وہ نیز مشرقی صوبہ جات سے جو فوجیں شاہی مدد کے لئے پہونچ سکتی تھیں وہ ویسی

روانہ ہوسکیں کیونکہ وہ تلنگانہ کی مہم سے ابھی حال میں تھکی ہاری ماندی واپس آئی تھیں اور ادھر مغلوں نے برن، کوئل وغیرہ کی طرف سے آنے والے تمام راستوں پر قبضہ کرلیا تھا اس لئے علاء الدین کو مجبوراً شہر سیری میں محصور ہونا پڑا۔ شہر کے لوگوں کو اس محاصرہ سے بہت پریشانی و تکلیف اٹھانا پڑی لیکن مغلوں نے جب کبھی شہر کے کسی حصہ میں گھسنے کا ارادہ کیا تو انھیں ناکامی ہوئی اور دہلی کی سپاہ نے کئی بار مدافعت کا حق ادا کردیا۔ لہٰذا حملہ آور جو رسد رسانی کی دقتوں کے علاوہ بظاہر ایک غیر ملک میں عرصہ تک بیکار پڑے رہنے سے گھبرا گئے تھے اور جن کا خاص مقصد اپنی پچھلی شکست کا داغ مٹانا تھا دو مہینے کے محاصرہ کے بعد واپس چلے گئے۔

ما:- اس تشویشناک محاصرے کے زمانہ میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے بھی دعا کی درخواست کی گئی تھی اور مغلوں کا بلا جنگ کئے پسپا ہوجانا آپ کے روحانی تصرف پر لوگوں نے محمول کیا۔ مؤلف نظامی بنسری نے اس کو ذرا تفصیل کیساتھ بیان کیا ہے کہ علاء الدین نے عالم مجبوری میں نصرت خاں اور امیر خسرو کو حضرت سلطان المشائخ کے پاس بھیجکر دعا طلب کی۔ امیر خسرو نے سلطانی مقصد کی ترجمانی کی۔ حضرت خواجہ صاحب نے سن کر تبسم فرمایا اور کہا کہ سلطان سے کہنا اطمینان رکھے منغل کل تک واپس چلے جائیں گے چنانچہ دہلی والوں نے دوسری صبح کو حیرت سے یہ دیکھا کہ مغلوں کا کہیں دور دور تک پتہ بھی نہ تھا اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ صاحبؒ نے بطور تبرک کچھ چیزیں طرغی بیگ کے پاس بھیجیں ان میں ایک رومال بھی تھا جس کو طرغی نے تعظیماً اپنے سر پر رکھا اور آنکھوں سے لگایا معاً اس کی حالت متغیر ہوگئی اس نے دیکھا کہ اس کے ملک پر ایک زبردست غنیم حملہ آور ہے اور ملک کو اس کی مدد درکار ہے۔ اسلئے اپنی فوجوں کو دہلی سے واپسی کا حکم دیدیا (ملاحظہ ہو نظامی بنسری صفحہ ۱۱۵ تا ۱۱۶)۔ ہمعصر مورخ برنی نے تفصیل نہیں دی لیکن روحانی تصرف کے عقیدہ سے کو تحریر کردیا ہے اس پر استمہ صاحب یہ بدگمانی کرتے ہیں کہ حکومت دہلی کی جانب سے کوئی رشوت یا نذرانہ مغلوں کو دیا گیا ہوگا جس سے منغل حملہ آور واپس چلے گئے لیکن استمہ صاحب اگر غور کرتے تو انھیں بلا وقت

(باقی مضمون صفحہ ۳۶۶ پر)

منگولوں کا چوتھا حملہ

منگولوں کے تیسرے حملے نے اور رن تھمبور و چتوڑ کی مشکلات نے سلطان کے سکندری ولولوں کو بہت کچھ سرد کر دیا اور اب اُسے صاف نظر آ گیا کہ جب تک فوجی تعداد اور جنگی ساز و سامان میں خاطر خواہ اضافہ نہیں کیا جائیگا دنیا کی فتح ایک طرف خود اس کو اپنے ملک میں بھی منگولوں کے خوف سے اطمینان میسر نہ آئیگا اس لیے اُس نے نہایت سرعت کے ساتھ فوج کو عمدہ و مضبوط بنانے کے لیے از سر نو تنظیم کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۷۰۵ھ[1] میں جب منگولوں نے شہزادہ علی بیگ اور تریاک[2] خواجہ کی سرکردگی میں چالیس ہزار کی تعداد میں ہندوستان پر حملہ کیا تو انھوں نے علاء الدین کو مقابلہ کے لیے ہر طرح سے تیار پایا۔ اس کے حسن انتظام کی وجہ سے ۴ لاکھ ۷۵ ہزار سوار ہر وقت دشمن کا سر کچلنے کے لیے تیار تھے۔ منگل کوہ ہمالیہ کے اندر ہو کر اس راستے سے حملہ آور ہوئے کہ جس راستے سے سلطان محمود غزنوی نے قنوج پر چھاپہ مارا تھا۔ منگولوں نے یکایک پہاڑوں سے نکل کر دامن کوہ سے لیکر امروہہ تک کے علاقے کو پامال کر ڈالا۔ سلطان غازی نے ملک تغلق کو جو سلطان کا امیر آخور (داروغہ اصطبل) تھا اور ملک کافور ہزار دیناری کو مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ انھوں نے منگولوں کو گھیر کر شکست دی اور ان کے دونوں سرداروں کو قید کر کے مع ۹ ہزار فوج اور ۲۰ ہزار گھوڑوں کے دہلی بھیجدیا۔ بہت سے منگل میدان جنگ میں مارے گئے باقی جو بھاگ کر ادھر ادھر

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۹۸ [illegible] کے بہت سے ظاہری اسباب اور قوی قرائن بھی مل جاتے ہیں [illegible] برنی جو عہد علائی کی ہر کمزوری [illegible] کو بلا مبالغہ بیان کرتا ہے اس قسم کی کار روائی کو کیونکر [illegible]

۱۔ از روئے خزائن الفتوح حملہ کی صحیح تاریخ ۱۰ جمادی الآخر ۷۰۵ھ بروز پنجشنبہ ہے۔

یعنی کہ پنجشنبہ دواز آخرین جمادی ۔۔۔ دہ روز رفتہ بود در سال پنج ہفتصد

۲۔ تاریخ فیروز شاہی میں ترتاک اور تتاک دونوں طرح سے تحریر ہے۔ برنی ص ۳۲۰ لیکن حضرت امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں "ترتاق" تحریر کیا ہے۔

منتشر ہوئے ان کو چھوٹے چھوٹے مقامی زمینداروں اور امیروں نے اپنے علاقوں میں گھیر کر کیفر کردار کو پہونچایا۔ صرف چند مغل بمشکل تمام اپنی جانیں بچا کر تباہی کی داستان سنانے کے لئے خراسان و ترکستان پہونچ سکے۔

مغل قیدیوں کا دہلی پہونچنے پر یہ حشر ہوا کہ اُن کے دونوں سرداروں کو ہاتھی کے پیروں کے نیچے کچلوا دیا گیا اور عام قیدیوں کو قتل کر کے اُن کے سروں کو شہر سیری کی شہر پناہ میں جو اس وقت تعمیر ہو رہی تھی چنوا دیا۔ اور غازی ملک کو ترقی دیکر صوبۂ پنجاب کا گورنر بنا دیا چونکہ مغلوں کا یہ حملہ غیر متوقع اور ایک نئے راستے سے ہوا تھا۔ اس لئے سلطان علاؤ الدین نے آئندہ کے لئے دار السلطنت دہلی سے باہر جانا ترک کر دیا اور ملکی مہمات پر اپنے سرداروں کو بھیجتا رہا۔

مغلوں کا پانچواں حملہ

علی بیگ اور ترتاک کا انتقام لینے کے لئے [illegible] میں مغلوں نے کنک[1] نامی سردار کی ماتحتی میں براہ ملتان ہندوستان پر حملہ کیا۔ مغل دریائے انڈس کو ملتان کے پاس عبور کر کے ہمالیہ کی طرف لوٹ مار کرتے ہوئے بڑھے۔ موسم گرما کا زمانہ تھا۔ جب وہ واپسی میں مال غنیمت سے لدے ہوئے واپس آئے تو دریائے انڈس کا راستہ غازی ملک مسدود کر چکا تھا مجبوراً انہیں لڑنا پڑا اور ساٹھ ہزار میں سے صرف تین چار ہزار زندہ بچ کر اپنے وطن واپس پہونچ سکے۔ اُن کا سردار "کنک" بہت سے مغلوں کے ساتھ گرفتار ہو کر دہلی بھیجا گیا جہاں انہیں نہایت عبرت انگیز سزائیں دی گئیں۔ کنک کو ہاتھی کے پیروں سے کچلوا دیا گیا اور بقیہ مغلوں کے سروں سے مینار بنوائے گئے جو بدایوں دروازے کے باہر [illegible] تک موجود تھے۔

---

[1] حضرت امیر خسرو نے مغل سردار کا نام "کپک" تحریر کیا ہے۔ اس کو شکست دینے میں ملک کافور بھی شامل تھا (خزائن الفتوح قلمی)۔

مغلوں کا چھٹا حملہ

سنہ ۱۳۰۶ء میں تین چار مغل سرداروں نے تیس چالیس ہزار سواروں کو لیکر کوہ شوالک کی طرف لوٹ مار مچائی۔ علائی سرداروں نے ان کو بھی شکست دی۔ ان کے بیوی بچوں کو گرفتار کرکے دہلی بھیجا گیا جہاں انھیں لونڈی غلاموں کے بطور فروخت کر دیا گیا اور مغل سپاہیوں کو جو قلعۂ نرانیہ میں قید کر دئے گئے تھے "ملک خاص حاجب" نے دہلی سے جا کر قتل کرا دیا۔ بادشاہ نے اس کو اسی کام کے لئے نرانیہ بھیجا تھا۔

ساتواں حملہ

سنہ ۱۳۰۷ء میں مغلوں کے ایک سردار "اقبالمندہ" نامی نے ہندوستان پر حملہ کیا اس کا امیر علی واہن سے تلنبہ کے مقام پر آمنا سامنا ہوا لشکر اسلام کو فتح حاصل ہوئی۔ مغلوں کے سردار کو ہاتھی کے پیروں سے پامال کرایا گیا اور بہت سے مغل سپاہیوں کو قتل کر دیا گیا۔ ان مسلسل فتوحات کی وجہ سے مغل ہندوستانی فوجوں سے ڈرنے لگے اور قطب الدین مبارک شاہ کے اخیر عہد تک انھیں ہندوستان میں آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ غازی ملک جو دیپالپور و لاہور کا صوبیدار تھا ہر سال دیپالپور سے مغلوں کی سرحد تک چکر لگایا کرتا تھا اس کی ڈر کی وجہ سے مغلوں نے اپنی سرحد تک آنا چھوڑ دیا تھا۔

توسیع مملکت یعنی جنوبی ہند کی تسخیر

علاء الدین سلاطین دہلی میں پہلا بادشاہ ہے جو دکن کی تسخیر پر آمادہ ہوا۔ راستہ کی دوری کے علاوہ ملک کی قدرتی حالت اور بڑی بڑی ریاستوں کے طاقتور حکمرانوں کی فوجی مخالفت و قوت نے علاء الدین کے راستہ میں رکاوٹیں ڈالیں لیکن وہ ارادے کا مضبوط اور قوت عمل کا مالک تھا اس لئے آخر کار اس نے دکن کو فتح کر کے دم لیا۔ اس وقت دکن کی عام سیاسی کیفیت یہ تھی کہ۔

(۱) دیوگری میں یادو خاندان حکمراں تھا اور راجہ رام چندر یا رام دیو حکومت کر رہا تھا۔ اُس نے سنہ ۱۲۷۱ء سے سنہ ۱۳۰۹ء تک حکومت کی۔

(۲) کاکاتی یا کاکتی خاندان کا حکمراں پرتاپ رُدر دیو ثانی تلنگانہ کا مالک تھا اِس کا دارالسلطنت ورنگل تھا جو آج کل حکومت آصفیہ کا مشہور شہر ہے۔

(۳) ہوئسل یا ہوشل کا علاقہ حکومت موجودہ ریاست میسور کو سمجھنا چاہئیے۔ اِن کا پایۂ تخت دوارسمدر تھا جو سرنگاپٹم کے شمال ومشرق میں ۰۰ امیل کی دوری پر واقع تھا۔ اس وقت یہاں کا حکمراں راجہ ویر بلال سوم تھا جس کی مدد سے بعد کو ریاست وجیانگر کی بنیاد پڑی۔

(۴) پانڈیہ حکومت دکن کے دور ترین حصہ میں تھی۔ پایۂ تخت مدورا تھا جس کو مسلمان مورخ معبر لکھتے ہیں یہاں کا راجہ کل شیکھر اول (۱۲۶۸- ۱۳۱۱ء) نہایت قابل حکمراں تھا۔

(۵) چولا خاندان اب تقریباً گوشۂ گمنامی میں جا پڑا تھا اُس کی جگہ چیرا خاندان کا عروج تھا اِن کا سردار "روی ورمن" تھا جس نے چولا اور پانڈیہ دونوں خاندانوں کو شکست دیکر اپنی قوت بڑھالی تھی۔ اِن کے دائرۂ حکومت میں دریائے کرشنا کے مدخل کا جنوبی حصہ سمجھنا چاہئیے۔

(۱) دکن کی پہلی مہم

سنہ ۱۳۰۶ء میں بادشاہ نے ملک کافور کو ملک نائب کا خطاب دیکر خلعت فاخرہ اور سرخ شامیانہ جو بادشاہ کے سوا دوسرا استعمال نہیں کر سکتا تھا عطا کیا اور تمام اُمراء سے اُس کا مرتبہ بلند کر کے سپہ سالاری اور وزارت عظمٰی کا عہدۂ جلیلہ دیکر ایک لاکھ سواروں کے ساتھ دکن کی جانب روانہ کیا۔ ساتھ میں ایک نہایت تجربہ کار و ہوشیار امیر خواجہ حاجی کو کیا۔ اس کے علاوہ اپنے سالے الپ خاں المخاطب الغ خاں ثانی حاکم گجرات اور عین الملک ملتانی حاکم مالوہ کو مزید کمک کے لئے فرمان جاری

کیے۔ دکن کی جانب اس فوج کشی کا اصل سبب یہ تھا کہ دیوگیر کے راجہ رامچندر (رام دیو) نے
تین سال سے ایلچپور کے علاقہ شاہی کا اور اپنا خراج دہلی روانہ نہیں کیا تھا۔ اس کے
علاوہ اس نے گجرات کے راجہ کرن کو اپنے یہاں پناہ دی تھی۔ اس لیے راجہ کی گوشمالی ضروری
سمجھی گئی۔

دہلی سے جب ملک کافور دکن کی طرف روانہ ہونے لگا تو کنولا دیوی نے علاء الدین سے
یہ استدعا کی کہ اس مہم میں اگر اس کی لڑکی دیول دیوی راجہ کرن سے مل جائے تو اس کو دہلی
بھیج دیا جائے۔ راجہ کرن بگلانہ میں شکست پذیر تھا اور راجہ رامچندر کے باجگزار کی
حیثیت سے زندگی گزار رہا تھا۔ دیول دیوی جس کی عمر [illegible] میں آٹھ برس کی تھی اپنے
باپ کے ساتھ رہ رہی تھی۔ دیوگیر کا ولی عہد شنکر دیو اس کا طالب تھا لیکن راجہ کرن نے
اس کو نسب میں اپنے سے کمتر سمجھ کر شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس جگہ یہ بتا دینا ضروری
معلوم ہوتا ہے کہ مغربی مورخین نے دیوگیر پر حملہ کا اصلی سبب تحصیل خراج نہیں بلکہ حصول
دیول دیوی قرار دیا ہے۔ لیکن یہ [illegible] سوچیے۔ بہرحال گجرات کی ملکی افواج جب
بگلانہ کی طرف ہو کر گزریں جو کہ راستہ [illegible] تھا تو راجہ کرن نے بگلانہ کے مضبوط [illegible]

۱۔ فرشتہ صفحہ ۱۱۶ [illegible] روایت ہے کہ جب کنولا دیوی دہلی لائی گئی تو اس کی
لڑکی دیول دیوی کی عمر چار سال کی تھی ([illegible]) لیکن حضرت امیر خسرو نے اپنی مشہور مثنوی
"دولرانی خضر خاں" میں دیول دیوی کی [illegible] بتائی ہے (ملاحظہ ہو مثنوی مذکور ص [illegible]) اور
خضر خاں سے رشتہ کے وقت خضر خاں کی عمر دس سال اور دولرانی کی عمر آٹھ سال بتلائی ہے

دراں دم بود خاں دہ سالہ راست — کہ [illegible] داشتن [illegible]

دولرانی [illegible] هشت سالہ — دو هفته ماه [illegible] (مثنوی مذکور ص [illegible])

راقم الحروف نے حضرت امیر کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔

۲۔ حضرت امیر نے یہ [illegible] نام [illegible] تحریر کیا ہے۔

قلعہ نندبار میں دو ماہ تک سلطانی افواج کا مقابلہ کیا۔ اس اثنا میں وہ اپنی لڑکی دیولدیوی کی شادی شنکر دیو کے ساتھ کرنے پر راضی ہو گیا تھا۔ دیول دیوی کو لینے کے لئے دیوگیر سے شنکر دیو کا بھائی بھیم دیو آیا اور ڈولہ دیوگری کو روانہ کر دیا گیا۔

الپ خاں کی فوجیں راجہ کرن کے تعاقب نواح مغارات ایلورہ پہونچیں جہاں انھوں نے دو دن قیام کیا۔ ایک دن اس کی فوج کے پانچ سو جوانوں نے ایلورہ غار کے عجائبات دیکھنے کی اجازت لی۔ یہ لوگ سیر و تفریح میں مصروف تھے کہ ان کو دشمن کا ایک فوجی دستہ ملا جو ڈولہ لئے ہوئے دیوگیر کو جا رہا تھا۔ مسلمانوں نے ڈولہ پر قبضہ کر لیا اور نہایت احترام کے ساتھ اسے الپ خاں یا الغ خاں کے پاس لے آئے جس نے اسے بحفاظت تمام دہلی کی جانب روانہ کر دیا کنولا دیوی [illegible] کو نہایت خوشی ہوئی اور اس کی شادی ولی عہد سلطنت خضر خاں کے ساتھ کر دی۔

ملک کافور اور خواجہ حاجی نے راجہ [illegible] گذشتہ تین سال کا خراج اور صلح کے عوض ۰۰ ہاتھی راجہ سے وصول کئے اور اس کو والیوں میں اپنے ساتھ دہلی لے آئے جہاں سلطان نے اس کے ساتھ نہایت عزت و حرمت کا برتاؤ کیا۔ اس کو رائے رایاں کا خطاب دیکر چتر سفید عطا کیا اور [illegible] واپس کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ صوبہ گجرات میں علاقہ نوساری کی جاگیر [illegible] انعام مرحمت کی۔ اس کے بعد رامچندر جب تک زندہ رہا سلطان کا وفادار [illegible] اس حملہ میں ملک کافور نے ایلچپور کے علاقے شاہی میں مستحکم [illegible] رامچندر کی نگرانی میں دینے کے دہلی سے ملحق کر لیا۔

(۲) دکن کی دوسری مہم | [illegible] ہم نصرت خاں مرحوم کے جانشین اور [illegible] کے لئے ہوا ہنگالی واڑیہ

روانہ کی گئی تھی۔ راستہ کی صعوبتوں اور مشکلات نے فوجوں کو پست ہمت کر دیا تھا اس لئے
تلنگانہ میں انھیں شکست ہوئی اور یہ مہم ناکام واپس آئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مغلوں کی دہشت
سے شمالی ہند کانپ رہا تھا۔ علاء الدین نے ۱۳۰۹ء میں دوبارہ تلنگانہ کی تسخیر کے لئے ملک
کافور اور خواجہ حاجی کو مامور کیا۔ اور چلتے وقت انھیں ہدایت کر دی کہ اگر راجہ اطاعت
قبول کر لے اور خراج دینے کا وعدہ کرے تو اس سے تعرض نہ کیا جائے۔ شاہی فوج جب
دیوگیری پہونچی تو راجہ رامچندر نے اس کا استقبال کیا اور لشکر کو اپنا مہمان کیا۔ اور جب
راجہ ورنگل کی رعونت میں کمی نہ دیکھ کر لشکر شاہی تلنگانہ کی طرف روانہ ہوا تو راجہ رامچندر کئی
منزل تک بطریق مشایعت لشکر کے ہمراہ آیا اور ملک کافور سے اجازت لیکر واپس ہوا۔

اس وقت ورنگل کا حکمراں راجہ پرتاب رودر دیو ثانی تھا جو کاکتیہ یا کاکتی خاندان کا
ساتواں فرمانروا تھا شہر ورنگل کے چاروں طرف دو شہر پناہیں تھیں۔ باہری شہر پناہ مٹی کی
اور اندرونی شہر پناہ جو پختہ تھی طول میں ۴ میل ۱۳۶ گز تھی[عا]۔ تلنگانہ کے حدود میں داخل ہوتے
ہی لشکر اسلام نے شہروں اور قلعوں کو فتح کرنا شروع کیا۔ اِدھر گرد کے کئی راجہ اور چھوٹے
چھوٹے رئیس راجہ ورنگل کی مدد کے لئے آئے اور سب نے ورنگل کے قریب شکست کھائی راجہ
معہ رفیقوں کے قلعہ ورنگل میں محصور ہوگیا۔ آخر محاصرہ کی شدت[عٓ] اور باہری شہر پناہ کو مفتوح

عا: حضرت امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں مہم ورنگل کا حال نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ دہلی سے
روانہ ہوکر ورنگل تک پہونچنے میں ہر ہر منزل کا حال لکھا ہے۔ ورنگل کے قلعہ کا کل دور بارہ ہزار پانچ سو چھیالیس گز
تھا۔ (خزائن الفتوح قلمی)

عٓ: اس زمانہ میں جبکہ ملک کافور ورنگل کی پہلی شہر پناہ کو فتح کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔
علاء الدین کو ۴۰ دن تک لشکر کی خیر خبر نہیں معلوم ہوسکی ورنہ یہ التزام رکھا گیا تھا کہ ہر دوسرے یا تیسرے
روز بادشاہ کو دکن سے لشکر کی کارگذاری کی اطلاع بہم پہونچتی رہے اس کے لئے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ
دہلی سے دکن تک ہر منزل پر ڈاک کے صبا رفتار گھوڑے تیار رکھے جاویں اور ہر نصف اور چوتھائی میل

(باقی مضمون صفحہ ۳۰۴ پر)

ہوجانے کی وجہ سے راجہ نے صلح کی درخواست کی اور اطاعت وفرماں برداری کا اقرار کرکے تین سو ہاتھی سات ہزار گھوڑے اور بہت سا سونا چاندی اور قیمتی تحائف بطور نذرانہ پیش کئے اور سال بہ سال خراج ادا کرتے رہنے کا وعدہ کیا۔ ملک کافور یہ سب سامان لیکر سلطان کی خدمت میں دہلی حاضر ہوگیا۔ یہ مہم سنہ ۷۱۰ھ میں جاکر ختم ہوئی۔

دکن کی تیسری مہم

دکن کی دوسری مہم سے واپس ہونے کے بعد ملک کافور نے سلطان کی توجہ بقیہ ملک دکن کی تسخیر کی طرف مبذول کی اور اِدھر پانڈیہ کا ایک شہزادہ سندر نامی سلطان کے پاس بغرض امداد مقیم تھا۔ بادشاہ کو بھی راجگانِ دکن کے ملکی معاملات میں مداخلت کا یہ موقع اچھا نظر آیا۔ اس لئے سنہ ۱۳۱۰ء / ۷۱۰ھ میں ملک کافور کو خواجہ حاجی کے ساتھ کرکے تیسری بار دکن روانہ کیا۔ دیوگری کو راجہ رامچندر کا انتقال ہوچکا تھا اور اُس کی جگہ اُس کا لڑکا شنکر دیو حکومت کر رہا تھا۔ دیوگری سے ملک کافور نے بخط مستقیم دوارواتی پوریا دوارسمندر کا رُخ کیا۔ دوارسمدر کے کھنڈرات ہلیبد کے مقام پر جو ریاست میسور کے ضلع حسن میں واقع ہے اب بھی موجود ہیں۔ کافور

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۷۲:- کے فاصلہ پر ہرکاروں کی ڈاک بٹھادی جاوے۔ اِس انتظام کے باوجود جب ایک عرصہ تک بادشاہ کو ورنگل کے لشکر کی خیریت نہیں معلوم ہوئی تو وہ بڑا متفکر ہوا اور اُس نے قاضی مغیث الدین بیانوی اور ملک قرا بیگ کو ہدایا وتحائف کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے پاس بھیجا اور درخواست دعا کی کہ "شما را غم اسلام بیش از من است اگر بنور باطن خبرے از حال لشکر شما را روشن شدہ باشد بشارتے برمن بفرستید" یعنی اگر آپ کو کشف کے ذریعہ سے لشکر اسلام کا حال معلوم ہو تو اس سے مطلع فرمائیں۔ حضرت خواجہ موصوف نے اس کو فتح ونصرت کی بشارت دینے کے ساتھ ساتھ پیامبروں کے ذریعہ یہ بھی کہلا بھیجا کہ "این فتح چہ باشد کہ ما فتح ہائے دیگر را امید داریم" یعنی یہ فتح کیا چیز اور فتوحات کی بھی اُمید ہے۔ چنانچہ اُسی دن ظہر کی نماز کے وقت ورنگل کی فتح کی خوشخبری قاصدوں نے آکر سنائی۔ (برنی صفحہ ۳۳۱)

عـ۱: ضیائے برنی صفحہ ۳۳۳

نے راستہ میں جالنہ کے مقام پر ایک قوی فوجی دستہ کا قیام شاہی ڈاک کی آمد ورفت
کی حفاظت کی خاطر ضروری سمجھا۔

دوارسمدر میں ہوئسل خاندان کا دسواں راجہ ویر بلال سوم (۱۲۹۲ء تا ۱۳۴۲ء) حکمراں
تھا۔ یہ مسلمانوں کی اچانک اور یکایک آمد سے گھبرا گیا۔ شہر فتح کرکے راجہ گرفتار کر لیا گیا
کافی مال غنیمت ہاتھ لگا۔ دوارسمدر کے حملہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کدور کے مقام
پر راجہ کی حمایت میں مسلمان سپاہیوں نے شاہی فوجوں کا مقابلہ کیا تھا۔ راجہ بلال
سوم کی فوجوں نے علائی فوجوں کا بمقام پٹن جو کہ گوداوری کے کنارے ہے مقابلہ
کیا تھا۔

دوارسمدر سے ملک کافور دکن کے انتہائی جنوبی گوشہ یعنی دریائے کاویری کے
جنوبی علاقے کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں پانڈیہ خاندان حکمراں تھا جن کا پایۂ تخت مدورا
تھا۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ ۱۳۱۰ء کے شروع میں سندر نامی پانڈیہ علاءالدین کے پاس
بغرض امداد دہلی میں موجود تھا۔ سندر نامی پانڈیہ نے اپنے باپ کل شیکھر دیو کو قتل کرکے
تخت پر قبضہ کرنا چاہا لیکن اس کے دوسرے بھائی ویر پانڈیہ نے اس کو شکست دیکر بھگا دیا
تھا۔ ملک کافور کی آمد پر ویر پانڈیہ مدورا کو خالی کرکے بھاگ گیا۔ شاہی لشکر کے ہاتھ اچھا
مال غنیمت پڑا۔ بعض مورخین علاقہ پانڈیہ میں دو حکمراں کو بتاتے ہیں ایک ویر پانڈیہ اور
دوسرا غالباً کیرالا کا "روی ورمن" ہے۔ دونوں کو شکست ہوئی۔ کافور نے مدورا میں
مسلمان گورنر مقرر کیا۔ آگے بڑھ کر سیت بندھ رامیشورم پہنچے اور پتھر کی ایک مسجد تعمیر
کرائی جو صاحب تاریخ فرشتہ کے زمانے تک موجود تھی اور مسجد علائی کے نام سے مشہور
تھی۔ راس کماری سے لشکر اسلام مغربی کنارہ مالابار کی طرف متوجہ ہوا اور اس طرف
کے تمام راجاؤں سے خراج وصول کیا اور اقرار اطاعت لیتا ہوا ۱۸ اپریل ۱۳۱۱ء کو
دہلی کی طرف واپس ہوا۔ اس مرتبہ مال غنیمت بے اندازہ ہاتھ لگا۔ ۳۱۲ ہاتھی بیس ہزار

کرکے روانہ کرتے رہو اور اگر دیوگیر کا راجہ راہ راست سے منحرف ہوگیا ہو تو اس کو قتل کرکے دیوگری راج کو دہلی سلطنت میں ملالو اور اپنی طرف سے اُمراء اور صوبیدار مقرر کردو۔ خود دیوگری میں مقیم رہو۔

ملک کافور نے دکن پہونچکر سنکردیو کو جو واقعی باغی ہوچکا تھا قتل کیا اور تمام علاقہ مرہٹہ میں گلبرگہ۔ دگل اور رائچور تک اپنے اہلکار اور اُمراء مقرر کردئے۔ علاقہ میں امن وامان اور رعب شاہی بٹھانے کی خاطر اُس نے علاقہ کا دورہ کیا۔ اسی سلسلہ میں اُس نے ویر بلال سوم کی ریاست پر دوبارہ چھاپہ مارا اور مال غنیمت لیکر دیوگری واپس لوٹ آیا۔ جہاں سے اُس نے کل سامان بادشاہ کی خدمت میں دہلی بھیجدیا۔

آخری زمانہ

"ہر کمالے را زوالے" کی ضرب المثل علاء الدین کے اوپر صحیح معنی میں صادق آتی ہے۔ شمالی ہند پہلے ہی بس میں آچکا تھا۔ دکن کی تسخیر نے اس کو پورے ہندوستان کا شہنشاہ بنا دیا۔ مغلوں کا خطرہ مٹ چکا تھا گویا اس طرح ۱۳۱۲ء میں اُس کے قوت واقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا کہ خلاف توقع اُس پر زوال آنا شروع ہوا۔ علاء الدین کی صحت کثرت کار کی وجہ سے بگڑ چلی تھی اور وہ آئے دن بیمار رہنے لگا۔ سلطان کے مرض میں طوالت ہوئی اور بیوی بچوں نے اس حالت میں اُس کی تیمارداری اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کی۔ اس حالت میں اس نے دکن سے ملک کافور اور گجرات سے الپ خاں کو بلا بھیجا۔ الپ خاں کو دہلی پہونچنے میں دیر ہوئی اور ملک کافور پہلے پہونچ گیا۔ بیماری نے اُسے نہایت بدمزاج اور پہلے سے زیادہ سخت گیر اور وہمی و شکی بنا دیا تھا۔ بادشاہ نے کافور سے اپنے بیوی اور بچوں کی بے اعتنائی کی سخت شکایت کی۔ [illegible] اس کی اولاد تھی بھی سخت نالائق۔ بہرحال کافور نے [illegible] کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر بادشاہ سے اس کی بیوی واولاد کی [illegible]

چونکہ جاہل اور خوشامد سے جلد متاثر ہونے والی طبیعت رکھتا تھا اس لئے اُس نے کافور کی اس بتائی ہوئی جھوٹی بات پر کہ بادشاہ کو مارنے کے لئے اُس کی بیوی خضر خاں اور الپ خاں نے سازش کی ہے یقین کر لیا۔ ہونے والی بات کہ اس موقع پر ملکہ نے بادشاہ سے اُس کے دوسرے بیٹے شادی خاں کی الپ خاں کی لڑکی کے ساتھ شادی کے لئے اجازت طلب کی۔ اس پر بادشاہ کو اور یقین ہو گیا۔ اُس نے اپنے ولی عہد خضر خاں کو دہلی سے امروہہ کی طرف جلاوطن کر دیا۔ شادی خاں کو گوالیار میں قید کر دیا اور اپنی بیوی کو حرم (محل سرائے) سے خارج کر کے پرانی دہلی میں مقید کر دیا۔ الپ خاں کو جو اپنی قابلیت و شجاعت کی وجہ سے کافور کی آنکھوں میں خار تھا آدمی بھیج کر جبکہ وہ گجرات سے آ رہا تھا راستہ ہی میں قتل کرا دیا اور اس کے بھائی نظام الدین کو جو جالور کے قلعہ کا حاکم تھا قتل کرنے کے لئے کمال الدین گرگ کو روانہ کیا۔ اس طرح ایک ہی وار میں کافور کے رقیبوں کا صفایا ہو گیا۔ صرف ایک خضر خاں باقی رہ گیا تھا جو جلاوطنی کی حالت میں تھا اُس کا بھی وقت آ گیا۔ بادشاہ کی بیماری میں افاقہ کی خبر سن کر خضر خاں امروہہ سے دہلی ایک بزرگ کے مزار پر حاضری دینے کے لئے آیا۔ یہ حاضری اُس مانی ہوئی منت کے تحت میں تھی جو کہ اُس نے بادشاہ کی صحت یاب ہونے کے لئے مانی تھی۔ بادشاہ اپنے بیٹے کی اس بات سے خوش ہوا لیکن ملک کافور نے بادشاہ کو بہکایا اور بار بار کہکر اُس کو یقین دلایا کہ خضر خاں امروہہ سے جان بوجھ کر بادشاہ کے احکامات کی خلاف ورزی کر کے آیا ہے چنانچہ خضر خاں کو بھی گوالیار کے قلعہ میں نظربند کرا دیا۔

بادشاہ کے ان ظالمانہ کاموں سے اور خصوصاً الپ خاں جیسے جلیل القدر اور باوفا سردار کے بے گناہ قتل سے ملک میں عام بددلی اور بے چینی پھیل گئی۔ سب سے پہلے بے چینی کے اثرات گجرات میں ظاہر ہوئے۔ گجرات کی شورش کو دبانے کے لئے کمال الدین گرگ کو بھیجا گیا جسے وہاں کی پبلک نے بڑی اذیت کے ساتھ قتل کر ڈالا۔ چتوڑ گڈھ جو اب تک راجہ مالدیو کے پاس تھا اُس کو ہمیر دیو نے فتح کر لیا اور مسلمان جاگیرداروں اور افسروں کو بری طرح

قتل کیا۔ اسی طرح دیوگری کے متوفی راجہ رامچندر کے داماد ہرپال دیو نے علم بغاوت بلند کیا اور کئی ایک قلعے مسلمانوں سے چھین کر اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ ان متوحش خبروں نے بادشاہ کے دماغی توازن کو بگاڑ دیا۔ غصہ کی وجہ سے اس کی حالت روز بروز گرتی گئی اور ۲ جنوری ۱۳۱۶ء مطابق ۷ شوال ۷۱۶ھ کو اس کا انتقال ہو گیا[1]۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ملک کافور نے زہر دے کر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ بادشاہ جامع دہلی کے سامنے دفن کیا گیا۔ ○

اصلاح حکومت

یہ بتایا جا چکا ہے کہ اکت خاں، عمر خاں، منگو خاں اور حاجی مولہ کی پے در پے بغاوتوں سے علاؤالدین کو فکر پیدا ہو گئی تھی اور وہ رات دن اسی فکر میں رہنے لگا کہ آئندہ کیا تدابیر اختیار کرے کہ کسی کو ملک کے امن و امان میں خلل انداز ہونے کی جرأت نہ ہو سکے۔ گو رنتھمبور کے محاصرہ کی کارروائی شدت کے ساتھ جاری تھی مگر سلطان رات دن امرائے سلطنت ملک حمیدالدین، ملک اعزالدین اور ملک عین الملک ملتانی سے جن کی اصابت رائے مشہور تھی اسی مسئلہ کے متعلق مشورہ کرتا رہتا تھا۔ آخر بہت کچھ غور و بحث کے بعد یہ جماعت اس نتیجہ پر پہونچی کہ (۱) حکومت کی لوگوں کے ذاتی معاملات سے بے خبری (۲) شراب خواری (۳) اور باہمی قرابت اور دوستی کے ذریعہ امراء کی فرقہ بندی اور (۴) رعایا کی دولت مندی یہی چاروں شورش اور سازش کے اصلی سبب ہیں جب تک ان کو دور نہیں کیا جائے گا اس وقت تک برابر فساد برپا ہونے کا اندیشہ رہے گا۔

---

[1] حضرت امیر خسرو نے بادشاہ کی تاریخ وفات ۷ شوال ۷۱۶ھ تحریر کی ہے۔

ز شوال آمدہ ہفتم پیاپے ــــ سنین ہفصد و شانزدہ بر سرے

کز یں گیتی آں شاہ آفاق ــــ بروں از ہفت گنبد بر ہشت طاق

(مثنوی دولرانی خضر خانی قلمی)

[I] علاؤالدین نے رن تھنبور کی مہم سے واپس آکر فوراً ہی مذکورۂ بالا اسباب کے تحت
میں نئے نئے قوانین بنائے اور ان کا سختی کے ساتھ نفاذ کیا۔ اس نے سب سے پہلے لوگوں
کی ذاتی جائداد اور ملکیت کی طرف توجہ کی جس سے دولت مند طبقہ کے بے کار افراد کو بہت
تکلیف اٹھانی پڑی (ل) اوّل تو بہت سی جاگیریں اور انعامات و معافیاں وغیرہ جو زائد
از ضرورت سمجھی گئیں سرکار نے ضبط کرلیں۔ (ب) دوسرے زرِ بستانی کے بعض نئے
ابواب بڑھا دئے اور ٹیکس وصول کرنے والوں کو سختی کے ساتھ ہدایت کردی کہ وہ
محصول میں زیادہ تر لوگوں سے سونا وصول کریں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے امراء کے
گھروں کو چھوڑ کر باقی عام پبلک کا سونا کھنچ کر بادشاہ کے خزانے میں پہونچ گیا۔ (ج)
دو آب کے ہندوؤں کے لئے کچھ تو ان کی تمرد و سرکشی کی بنا پر اور کچھ ان کے غیر معمولی تمول
کی وجہ سے بعض خاص قوانین بنائے جس کی وجہ سے غالباً برہمنوں اور راجپوتوں کو زیادہ
نقصان پہونچا کیونکہ ملک کا زمیندارہ انھیں لوگوں کے پاس تھا۔ یہ لوگ اب تک صرف
جزیہ دیکر مالی بار سے سبکدوش ہوجاتے تھے بدلہ میں جزیہ کی رقم سے کہیں زیادہ ان کو
مالگزاری وصول کرنے کا حق وصولیابی مل جاتا تھا اور حکومت کے بعض دیگر مالی مطالبات
کا بوجھ بلا واسطہ غرباء کے طبقہ پر پڑتا تھا کیونکہ یہ زمیندار حکومت کے مطالبہ کو اپنے پاس سے
ادا کرنے کے بجائے اپنی ہندو رعایا کے سر ڈال دیتے تھے۔ علاؤالدین نے سرمایہ کی اس
غیر مساوی تقسیم کو اڑا کر سب کو ایک سطح پر لانے کی کوشش کی۔ اس نے احکامات نافذ
کئے کہ آئندہ سے سب اپنی اصلی اور صحیح آمدنی پر پیداوار کا نصف ٹیکس ادا کریں۔ ظاہر ہے
کہ اس سے ہندو حکام اور ہندو زمینداروں کی بیجا [illegible] کی رقم نکل کر شاہی خزانہ میں

---

[1] علاؤالدین عہد غلامان کے [illegible] سسٹم کو قطعاً دور نہیں کرسکا چودھری، مقدم اور خوط
بدستور گاؤں کے عہدیدار رہے۔ انھوں نے [illegible] حکومت میں انتشار پھیلا کر سے
پورا فائدہ اٹھایا اور ضرورت سے زیادہ مالدار ہوگئے، یہ [illegible] اور شوکت کے ساتھ رہتے تھے۔

(باقی مضمون صفحہ ٣٨٠ پر)

جانے لگی اور غریب رعایا کو نسبتاً مالی مشکلات سے نجات مل گئی کیونکہ اس کا بار عام رعایا پر نہیں پڑا جس کی برنی شہادت دیتا ہے کہ "از خوط و بلاهر در دادن خراج یک حکم پیدا آید وخراج اقویا بر ضعفاء نیفتد"

(۵) اسی ضمن میں محکمہ مالگزاری کی بھی اصلاح کی گئی بہت سے پرانے عہدے دار جو رشوتیں لیا کرتے تھے یک قلم برخاست کر دیئے گئے[1] شہر سے دیپالپور تک اور جھاین سے لاہور تک تمام علاقہ کی پیمائش اور تشخیص کی گئی۔ نائب وزیر ممالک "شرف قائی" نے جو اپنی قابلیت کے لحاظ سے ارسطوئے زمانہ تھا خود ایک ایک گاؤں کی جمع بندی کا ملاحظہ کیا اور کئی سال کی محنت کے بعد چرائی اور مالگزاری کی رقوم متعین کیں ہر جگہ اور ہر شخص کے لئے ایک سا اصول بنایا گیا یعنی یہ کہ کاشتکار سے معہ خوط و بلاهر پیداوار کا نصف[2] سرکار لے گی۔ چرائی کا محصول اس کے علاوہ تھا جو دودھ دینے والی گائے اور بھینس پر لیا جاتا تھا۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۷۹: وہ گھوڑے ان کی سواری میں تھے۔ اچھے ہتھیاروں سے مسلح رہتے تھے اور حکومت کے مالیہ کی ادائیگی سے گریز کرنے لگے تھے۔ علاء الدین نے سیاسی حالات کی بنا پر ان کے امتیازی حقوق سلب کر لئے اور اب وہ صرف اپنا حق المحنت پانے کے مجاز تھے۔ بادشاہ نے ان کو کسان کے مساوی کر دیا جس طرح آجکل انگریزی گورنمنٹ زمیندار کو ملک کا ایک خیر اندیش بنانے کے لئے کسان کے مساوی کرنا چاہتی ہے۔ اس کو ظلم نہیں کہا جا سکتا کیونکہ حکومت نے کسی دشمنی کی بنا پر نہیں بلکہ سیاسی و مالی تقاضے کی بنا پر ایسا کیا تھا۔ (مؤلف)

[1] کم و بیش دس ہزار محرروں کو رشوت ستانی کے الزام میں برخاست کر دیا تھا (برنی صفحہ ۲۹۶)۔

[2] اس سلسلے میں ڈاکٹر رام پرشاد صاحب تریپاٹھی کا کہنا ہے کہ علاء الدین کو فوجی ضروریات نیز شراب وغیرہ کا ٹیکس اٹھا دینے کی وجہ سے روپیہ کی سخت ضرورت تھی۔ اس نے روپیہ کی کمی کو لگان میں اضافہ کر کے پورا کیا لیکن اسے یہ احساس تھا کہ اس کا بوجھ کاشتکار رعایا پر پڑے گا چنانچہ کاشتکار کا بوجھ [illegible] تھا اس لئے ان کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے دوسری تدبیریں اختیار کیں۔ مثلاً [illegible] (صفحہ ۱۴۰)

نے وہ دولت زمینداروں سے چھین کر اپنے خزانے میں بھرلی تھی تو وہ ہندوستان ہی میں رہی اور زیادہ تر بیں کی شاہی عمارتوں یا فوجی ضروریات میں خرچ ہوئی۔ اور اس طرح وہ دولت امیروں و زمینداروں سے نکل کر آخرکار مزدور پیشہ طبقہ کی جیبوں میں پہونچ گئی۔

II | علاؤالدین نے امراء کے اندرونی حالات سے واقفیت اور سیاسی سازشوں کے انسداد کی نئی نئی ترکیبیں نکالیں۔ اس نے بلبن کی طرح پرچہ نویسوں کا ایک نیا محکمہ قائم کرکے ملک میں جاسوسوں کا جال بچھا دیا۔ یہ پرچہ نویس اور جاسوس بادشاہ کو ملک کی بالعموم اور امراء کے گھروں کی بالخصوص ذرا ذرا سی خبریں بہم پہونچایا کرتے تھے۔ امراء پر جاسوسوں کا اتنا خوف غالب تھا کہ وہ گھروں میں بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ مبادا ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے جو شاہی عتاب کا باعث ہو۔ کوشک شاہی "ہزار ستون" میں اجتماع کے موقعوں پر بھی ایک دوسرے سے اشاروں سے باتیں کرتے تھے اس صورت میں ایک دوسرے سے مل کر بادشاہ کے خلاف سازش کی ہمکیر پنانا ایک امر محال ہو گیا۔ یہی وجہ ہے سلطان کی بقیہ زندگی میں ہم کسی سازش کا نام بھی نہیں سنتے۔

III | دوسری تجویز کے مطابق قمار بازی، شراب خوری نیز اور نشیلی چیزوں کا استعمال اور خرید و فروخت کو قانوناً ممنوع قرار دیا۔ سلطان نے سب سے پہلے خود شراب خواری سے توبہ کی اور شاہی کارخانہ میں میگساری کے جس قدر ظروف تھے سب تڑوا دئے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۸۰)

علاء الدین نے چرائی ٹیکس عائد کیا تا کہ لوگ زراعت کی طرف مائل ہوں (ریوے دی نیو سسٹم حصہ دوم باب ہشتم از ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی)

ع ۱ طبع ۳۸۱ تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۸ از ضیائے برنی۔

پھر شراب بیچنے اور پینے کی ایسی سخت سزائیں[1] مقرر کیں کہ اگر یہ عادت بالکل دور نہ ہو سکی تو کم سے کم مسکرات کی علانیہ خرید و فروخت ضرور موقوف ہوگئی۔ دہلی کے اطراف میں آٹھ آٹھ دس دس کوس تک کسی کی مجال نہیں تھی کہ شراب پی سکے، بنا سکے، یا بیچ سکے۔ آخر عہد میں سختیوں میں کمی کر دی تھی محکمۂ احتساب کے لوگوں کو منع کر دیا تھا کہ وہ ایسے لوگوں سے نہ بولیں اور نہ تلاشی کے لئے ان کے مکانوں میں داخل ہوں جن کی بابت یہ معلوم ہو کہ وہ اپنے گھر میں شراب کشید کر کے اور دروازہ بند کر کے تنہا پیتے ہیں کسی کو شریک نہیں کرتے اور نہ فروخت کرتے ہیں۔ بہر حال مسکرات پر پابندیاں عائد کر دینے سے یہ نتیجہ نکلا کہ ان سے پیدا ہونے والی تمام خرابیاں ختم ہوگئیں، اور ملک فتنہ و فساد سے پاک ہوگیا۔ آج ہماری قومی حکومتیں بھی شراب خواری کی لعنت کو ملک سے دور کرنا چاہتی ہیں انہیں چاہیئے کہ علاؤ الدین کے قدم بقدم چلیں۔

۱۷ فساد کا ایک سبب امراء کا آپس میں مجتمع ہو کر مجلسیں منعقد کرنا اور شادی بیاہ کے ذریعہ اپنی قوت کو مضبوط کرنا تھا۔ علاؤ الدین نے اس قسم کے اجتماعات کی ممانعت کر دی اور ملکی معاملات پر بحث کرنے سے روک دیا۔ اس کے علاوہ امراء سلطنت کو حکم دیا کہ وہ بغیر وزیر اعظم کی اجازت حاصل کئے ہوئے آپس میں شادی اور بیاہ نہ کریں۔ مطلق العنان بادشاہی کی یہ وہ شان تھی جو آئندہ مغل سلاطین کے عہد میں بھی باقی رہی۔

(۱۸) فوجی تنظیم اور نرخ اجناس کا تعین

۱۳۰۳ء میں چتوڑ سے واپس ہونے کے ایک ماہ کے بعد علاؤ الدین کو دہلی میں محصو

---

[1] بھاری بھاری جرمانوں نیز کوڑوں کی سزاؤں کے علاوہ شراب خواروں کو بڑے بڑے کنوؤں میں قید کر دیا جاتا تھا جو صرف انھیں کو سزا دینے کے لئے علاء الدین نے بدایوں دروازے کے باہر میدان میں کھدوا دئے تھے۔

ہوکر مغلوں کا مقابلہ کرنا پڑا یہ وہ ذلت تھی جس کو وہ کبھی نہیں بھولا اس کو غالباً پہلی مرتبہ اس کا شدید ترین احساس ہوا کہ ملک میں جب تک ایک باقاعدہ مستقل فوج نہیں ہوگی ہندوستان کو مغلوں کے حملوں نیز ملک کے اندرونی فسادات سے چھٹکارا نصیب نہیں ہوگا۔ لیکن ایک عظیم الشان فوج کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت تھی اور علاءالدین اپنی رعایا پر مزید مالی بار ڈالے ہوئے کام کو انجام دینا چاہتا تھا۔ اس نے اس مشکل کو حل کرنے کی یہ ترکیب سوچی کہ سکہ کی قیمت اور اجناس میں توازن قائم کردیا جائے۔ اس زمانہ میں دکن کی دولت کھنچ کھنچ کر شمالی ہند میں آرہی تھی جس کو علاءالدین نے نہایت فراخ دلی سے لوگوں میں تقسیم کردیا تھا۔ چنانچہ سونے چاندی کی افراط سے سکہ کی قیمت گر گئی تھی اور اس کے مقابلہ میں ضروریات زندگی کی چیزیں گراں ہوگئیں تھیں۔ لہٰذا علاءالدین نے صلاح کاران سلطنت کے مشورہ سے بازار کے انتظام کا قانون بنا کر سب چیزوں کا نرخ مقرر کردیا اس طرح سپاہی قلیل تنخواہ میں اپنی تمام ضروریات زندگی کو بخوبی پورا کرسکتا تھا اور حکومت اپنے مالیات میں ایک پیسہ کا بھی مزید اضافہ کئے بغیر اس قابل ہوگئی کہ ۴۷۵۰۰۰ لاکھ جرار سپاہ دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر وقت کیل کانٹے سے تیار رکھ سکے۔ اس زمانہ میں معمولی سوار کو ۲۳۴ ٹنکہ سالانہ یعنی ۱۹½ ٹنکہ ماہانہ اور دو اسپہ سوار کو ۳۱۲ ٹنکہ سالانہ ملا کرتے تھے۔ ضروریات زندگی کا نرخنامہ سب سے آخر میں منسلک ہے جس سے اشیاء کی ارزانی کا اندازہ ہوسکے گا۔

؎ مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے فرشتہ کی روایت کی بنا پر شرح تنخواہ ۲۳۴ ٹنکہ و ۱۹½ ٹنکہ ماہانہ تسلیم کی ہے (ملاحظہ ہو تاریخ ہند ج ۲ ص ۱۰۱) جو قابل تصحیح ہے۔ برنی نے کئی جگہ شرح تنخواہ وہی تحریر کی ہے جو اوپر مذکور ہوئی (ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی صفحات ۲۹۴، ۳۰۳، ۳۰۳، ۳۱۹) اسی شرح کو الیٹ وغیرہ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ (الیٹ جلد سوم ص ۱۹۲)

(۱) غلہ کی ارزانی ضروریات زندگی میں سب سے پہلا نمبر غلہ کا ہے اس کی ارزانی یا گراں ہونے کا اثر تمام چیزوں پر پڑتا ہے اس لئے علاءالدین نے سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ کی۔ ارکینِ سلطنت کے مشورہ سے اُس نے آٹھ قوانین یا ضابطے ایسے بنائے جن کی وجہ سے نہ صرف غلہ کا بھاؤ ارزاں ہوگیا بلکہ "درنزول باراں وامساک باراں یک دانگ ازاں نرخ بالا نرفت" اور اس کو ہمعصر مورخ نے عجائبات روزگار میں شمار کیا ہے۔ قوانین کی مختصر کیفیت یہ ہے:۔

(۱) غلہ کی مختلف جنسوں کا بھاؤ حکومت کی طرف سے تعین کر دیا گیا۔ یہ نرخ اتنا ارزاں تھا کہ اسے آج پڑھ کر مشکل سے یقین آتا ہے۔

(۲) منڈی کی دیکھ بھال کے لئے ایک نیا محکمہ قائم کیا اور اُس کا مہتمم ملک قبول الغخانی کو مقرر کیا جو "شحنۂ منڈی" یا "راشننگ آفیسر" کہلاتا تھا اس کو تاجروں کی تنبیہ و تادیب کے کامل اختیارات حاصل تھے۔ شحنۂ منڈی کے ساتھ ساتھ لیکن غالباً اس کے دائرۂ اثر سے باہر پرچہ نویسوں کا محکمہ قائم کیا جس کے افسر بازار کی کیفیت سے بادشاہ کو مطلع کرتے رہتے تھے۔

(۳) بادشاہ نے علاقہ میان دوآب و قصبات علاقہ جھاین وغیرہ میں مالگذاری غلہ کی صورت میں وصول کی۔ اور غلہ کو سرکاری گوداموں میں جمع کرایا جس کی وجہ سے غلہ کے تاجر سرکاری بھاؤ پر غلہ فروخت کرنے پر مجبور ہوگئے اور قحط وغیرہ کی صورت میں غلہ کے گراں ہونے کا خطرہ بھی جاتا رہا کیونکہ شاہی گوداموں سے اناج لاکر بازار کو پاٹ دیا جاتا تھا اور بھاؤ حسب سابق اپنی جگہ پر بدستور قائم رہتا تھا۔

(۴) غلہ کے تمام چھوٹے بڑے تاجروں کو حکم دیا گیا کہ وہ شحنۂ منڈی کے پاس جاکر اپنے اپنے ناموں کا اندراج کرائیں اور اُس کے احکامات کے مطابق عمل کریں۔

(۵) تمام مملکت میں اعلان کرا دیا کہ کوئی بقال، سوداگر یا زمیندار ایک یا آدھا من

غلہ بھی رعایا سے حاصل کر کے خفیہ فروخت نہ کرے اور نہ کوئی غلہ کو جمع کر کے اپنے پاس رکھے۔ علاقہ میاں دوآب کے کارکنان، نائبان و متصرفان کو شاہی احکامات کا بڑی سختی و ایمانداری کے ساتھ نفاذ کرنا پڑتا تھا ورنہ محتکر کے ساتھ ساتھ ان کو بھی سزا بھگتنا پڑتی تھی۔[۱]

(۶) دوآبہ کے حکام کو ہدایت تھی کہ وہ خراج میں زیادہ تر غلہ حاصل کریں اور رعایا مقررہ نرخ پر اپنا غلہ سرکاری تاجروں کے ہاتھ فروخت کرے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ غلہ برابر منڈی میں پہونچتا رہا اور بکتا رہا۔

(۷) بادشاہ نے یہ انتظام کیا کہ اس کو منڈی کی کیفیت تین مختلف ذرائع سے معلوم ہو یعنی شحنۂ منڈی، برید منڈی، اور جاسوسوں کا افسر اعلیٰ روزانہ آ سے بازار کے حالات سے باخبر رکھیں۔ ان تینوں کی اطلاعات میں اگر ذرا سا بھی اختلاف پایا جاتا تھا تو تحقیقات کے بعد شحنۂ منڈی کو اس کی جواب دہی کرنا پڑتی تھی۔ غرضکہ ان تینوں محکمہ جات کے افسران اعلیٰ کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بازار سے ہر قسم کی بدعنوانی جاتی رہی اور غلہ کا بھاؤ علاء الدین کی زندگی میں گرنے نہیں پایا۔ قحط کے زمانہ میں اگر نرخ بقدر نصف جیتل کے بھی بڑھ جاتا تھا تو شحنۂ منڈی کو ۱۲ ضرب کوڑوں کی سزا دیجاتی تھی۔

(۸) آخری قاعدہ یہ مقرر کیا کہ قحط کے دوران میں کسی کو ضرورت سے ایک دانہ زیادہ نہ دیا جائے۔

(ب) دیگر ضروریات زندگی کا نرخ ضروریات زندگی میں غلہ کے بعد دوسری اشیاء کا نمبر ہے مثلاً کپڑا، شکر، روغن اور میوہ جات

۱؎۔ گراں بیچنے کی نیت سے غلہ خرید کر جمع کرنے والا شخص محتکر کہلاتا ہے۔ ۲؎۔ جنگ عالمگیر کے دوران میں علاء الدین کے اصولوں پر راشننگ سسٹم جاری کیا گیا لیکن حکومت نے اس ضابطہ پر صحیح طریقہ سے عمل نہیں کیا اس لئے انتظام ناقص رہا۔ ۳؎۔ مولف کے زمانہ میں جو راشننگ سسٹم جاری تھا

(باقی صفحہ ۴۲۸ پر)

وغیرہ۔ ان کی ارزانی کے لئے علاءالدین نے پانچ ضابطے بنائے اور اُن کا سختی کے ساتھ نفاذ کیا۔ ان میں پہلا ضابطہ سرائے عدل کی تعیین کے بارے میں تھا۔ بدایوں دروازے کے اندر کوشک سبز کی طرف جو میدان خالی پڑا ہوا تھا اس کو سرائے عدل کے نام سے موسوم کیا اور حکم دیا کہ ہر قسم کا مال خواہ وہ سرکاری کارخانہ جات کا تیار شدہ ہو یا اس کو تاجر فروخت کرنے کے لئے باہر سے لائیں بجز سرائے عدل کے اور کہیں نہ اُتارا جائے اور نہ فروخت کیا جائے ورنہ بصورت دیگر بحق سرکار ضبط کر لیا جائیگا۔

(۲) اُن تمام اشیا کا نرخ مقرر کر دیا جو سرائے عدل میں صبح سے لیکر عشار کے وقت تک خرید و فروخت کی جاتی تھیں۔

(۳) تمام ہندو و مسلمان نیز شہری و غیر شہری سوداگروں کو حکم دیا کہ وہ اپنا نام سرکاری دفتریں درج کرائیں اور اپنے لائے ہوئے مال کی سرکاری افسر کو اطلاع دیں۔ اس کے بعد وہ سرکاری نرخ پر اپنے سامان کو فروخت کرنے کے مجاز ہیں اس طرح سرکاری کارخانہ جات کے تیار شدہ مال سے نیز غیر ولائتوں کے مال سے منڈی بھر گئی۔ اہالیان شہر کی ضرورت سے زائد جو سامان بچ رہتا تھا وہ غالباً حکومت خرید کے جمع کر لیتی تھی یہی وجہ ہے کہ (علاءالدین کے بعد بھی) ایک عرصہ تک وہ سامان سرائے عدل میں جمع رہا اور فروخت نہیں ہو پایا۔

(۴) حکومت کی طرف سے ۲۰ لاکھ ٹنکہ کی رقم ملتانی سوداگروں کو جو کپڑے کے مشہو بیوپاری تھے تقسیم کی گئی اور انھیں حکم دیا گیا کہ باہر سے مال لاکر سرائے عدل میں فروخت کریں۔ اس ضابطہ کی وجہ سے جہاں تجارت کو ترقی ہوئی اُس کے ساتھ ہی ساتھ بازار میں سامان بھی بافراط آنے لگا۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۶ = اس میں اس قسم کا تعاون مفقود تھا جس کے نہ ہونے سے پبلک اور سوداگر دونوں تکلیف محسوس کرتے رہے۔

(۵) نفیس قسم کے ریشمی پارچہ جات کو ارزاں نرخ پر بیچنے کے لئے یہ حکم صادر فرمایا کہ ضرورت مند اُمراء و ملوک نیز اکابر و معارف سرکاری عہدہ دار سے پروانہ (پرمٹ) لیکر سامان خریدیں تاکہ سامان کی بازار میں کمی نہ ہونے پائے اور ہر ایک کی ضرورت بھی پوری ہو جائے۔

سرائے عدل کا انتظام ایسے افسران کے ہاتھ میں تھا جو بڑے دیانتدار اور درشت مزاج تھے جو نہ خود رشوت لیتے تھے اور نہ لینے دیتے تھے اور کسی کے ساتھ رُو رعایت کرنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علاء الدین کا انتظام بہت کامیاب رہا اور ضروریات زندگی کا نرخ ہمیشہ ایک حال پر قائم رہا اور سامان کی بازار میں افراط رہی۔

(ج) گھوڑوں وغیرہ کا نرخ

حکومت کو فوج کے لئے گھوڑوں کی اشد ضرورت تھی ان کی فراہمی کے لئے بادشاہ نے چار ضابطے بنائے جن کی وجہ سے ایک ہی دو سال کے اندر گھوڑے اور دیگر چوپائے جانور اتنے ارزاں ملنے لگے کہ اتنے سستے نہ اس سے پہلے کبھی فروخت ہوئے تھے اور نہ بعد کو۔

(۱) ان قوانین میں پہلا قانون یہ نافذ کیا کہ گھوڑوں کے اقسام و جنس کے لحاظ سے اُن کی قیمتیں[1] سرکاری طور پر مقرر کر دیں اور دلّالوں کو حکم دیا کہ وہ اعلیٰ، اوسط اور معمولی قسم کے گھوڑوں کو "عارضِ ممالک" اور اُس کے ماتحت افسروں کے بلا اجازت فروخت نہ ہونے دیں۔ ٹٹوؤں کی قسم ان کے علاوہ تھی جو دس سے لے کر ۲۵ ٹنکہ میں مل جاتے تھے۔

حاشیہ(۱) اعلیٰ درجے کے گھوڑے ۱۰۰ سے لیکر ۱۲۰ ٹنکہ تک، اوسط درجے کے ۸۰ سے لیکر ۹۰ ٹنکہ تک اور تیسرے درجے کے گھوڑوں کے لئے ۶۵ ٹنکہ سے ۷۰ ٹنکہ تک قیمت مقرر تھی۔ علاء الدین کے حسن انتظام کی وجہ سے صرف شہر دہلی اور اس کے ملحقات میں، ستر ہزار فاضل گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے

(باقی مضمون صفحہ ۳۸۹ پر)

(۲) گھوڑوں کی تجارت کرنے والے سوداگروں کو حکم دیا کہ وہ گھوڑوں کو بازار میں لاکر عام طور سے فروخت نہ کریں۔ اسی طرح مالدار لوگوں کو اس امر کی ممانعت تھی کہ وہ دلالوں کے ذریعہ سے بغیر سرکاری علم میں لائے ہوئے گھوڑوں کا بالا ہی بالا سودا نہ کرلیا کریں۔

(۳) احکامات کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اور بالخصوص دلالوں کو جلا وطن کرکے دوسری ولایتوں کے قلعوں میں قید کردیا جاتا تھا۔ برنی نے دلالوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ طبقہ بڑا بے ایمان اور بے باک تھا اور ایک طرح سے بازار ان کے ہاتھ میں تھا۔ یہ بیچنے اور خریدنے والے دونوں سے رشوت لے کر سودا کرا دیتے تھے۔ علاء الدین نے ان کو راہ راست پر لانے کے لئے بڑی سخت اور عبرتناک سزائیں دیں۔

(۴) وہ ہر چالیسویں دن اور کبھی کبھی درمیان میں بھی دلالوں کے چودھری کو بلا کر گھوڑوں کی جنس اور قیمت کے بارے میں تفتیش کرتا رہتا تھا۔ اس ڈر کی وجہ سے دلال اپنی طرف سے نہ گھوڑوں کی قیمت مقرر کرسکتے تھے اور نہ انھیں اونے پونے گاہک کے سر منڈھ سکتے تھے۔

انھیں قوانین کا اطلاق دوسرے چوپایہ جانوروں پر بھی ہوتا تھا سو جانور جن کی قیمت کبھی تیس اور چالیس ٹنکہ فی راس تھی اب صرف ۴ اور زائد سے زائد پانچ ٹنکہ رہ گئی۔ دودھ دینے والی گائے کی قیمت ۳ ٹنکہ اور بھینس کی دس سے بارہ ٹنکہ تک تھی اور موٹی تازی بکری بازار میں دس سے بارہ اور چودہ جیتل تک میں مل جاتی تھی کنیزک وغلام کی قیمت ۵ سے ۱۰ ٹنکہ تک تھی۔ اس طرح بادشاہ کے بنائے ہوئے ضوابط کا اطلاق ضروریات زندگی کی ہر بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر ہوتا تھا چنانچہ

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۸۸ - (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو برنی ص ۳۱۳ اور ایڈمنسٹریشن آف دہلی سلطنت باب ہشتم)۔

کسی کی مجال نہیں تھی کہ کلاہ سے لیکر موزہ تک اور کنگھی سے لیکر سوئی تک نیز حلیم سے لیکر شوربہ تک اور برفی سے لیکر ریوڑی تک، اسی طرح کاک و بریاں سے لیکر خمیری روٹی اور مچھلی تک اور پھول سے لیکر ہری گھاس تک نیز پان چھالی وغیرہ کوئی بھی چیز مقررہ نرخ سے زیادہ میں فروخت کر سکے۔ تینوں قسم کے بازاروں میں جاسوسوں کا اس قدر ڈر غالب رہتا تھا کہ سوداگر ہر وقت بید کی طرح کانپتے رہتے تھے اور اور برنی کے الفاظ میں بازاری قوم جو کہ "بے شرم و بیباک و تعمیہ گر و رند و سفیہ و سوزندہ و کذاب و زہ دیدہ بودند" راہ راست پر آ گئے اور اُن کے اندر جو برائیاں تھیں مثلاً جھوٹ بولنا، کم تولنا اور آمیزش کرنا ان سب باتوں کا رواج اٹھ گیا۔

کامیابی کا راز ناظرین کی دلچسپی کے لئے یہ بات یہاں پر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ علاء الدین کو اتنی بڑی شاندار کامیابی صرف چار باتوں کی وجہ سے حاصل ہوئی اولاً یہ کہ اس کو "دیوان ریاست" کہ جس سے بازار کا تعلق تھا ایسا ہوشیار، امین اور راست کار ملا کہ جس کی دیانت و امانت نیز خرید و فروخت کے معاملات میں وسیع تجربات کی وجہ سے بازاری قوم اُسے کسی قسم کا دھوکا نہیں دے سکی۔ یہ دیوان ریاست یعقوب ناظر تھا۔

دوسرے یہ کہ یعقوب ناظر نے ہر منڈی کے لئے جن افسران کا بطور شحنۂ منڈی انتخاب کیا تھا وہ بھی نہایت کوتہ دست اور بے لوث واقع ہوئے تھے وہ رشوت نہ خود کھاتے تھے اور نہ دوسرے کو کھانے دیتے تھے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مرکز میں اشیاء کے نرخ کی جو فہرست مرتب ہوئی تھی اسی کی نقلوں کے مطابق وہ افسران بازار میں اشیاء کے خرید و فروخت کی دیکھ بھال کرتے تھے اور خلاف ورزی کرنے والوں

ملاحظہ برنی صفحہ ۳۱۶

چوتھی چیز جس نے بادشاہ کو کامیابی بخشی وہ اُس کی باخبری اور تفحص کی عادت ہے وہ ہر بازار کے اندر فروخت ہونے والی ہر شے کے اوپر نظر رکھتا تھا اور اُن کی جانچ پڑتال کرتا رہتا تھا۔ لوگ اُس کی باخبری پر حیرت کرتے تھے۔

۷۱ سرحدی قلعہ جات کی تعمیر بہرحال اشیاء کے نرخ ارزاں کر دینے کے بعد علاء الدین کو فوج کی از سرِ نو تنظیم اور اضافہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی چنانچہ اُس نے پایۂ تخت اور دیگر سرحدی مقامات میں بہت سے قلعے اور جنگی مورچے تعمیر کئے اور ۴ لاکھ ۷۵ ہزار سوار کی وہ جرار فوج مرتب کی جس نے مغلوں کو شکستیں دینے میں سپاہ بلبنی کی شہرت کو ماند کر دیا۔ اِس نئی فوج نے دو ہی سال میں مغلوں کو ایسی شکستیں[۱] دیں کہ انھیں ایک مدت تک ہندوستان کا رُخ کرنے کی جرات نہیں ہوئی اور کئی بار ان کی فوجیں کی فوجیں اِس طرح معدوم ہوئیں کہ ان میں سے ایک شخص بھی زندہ پھر کر نہ گیا۔ وہی ہندوستانی فوجیں جو کبھی مغلوں کے مقابلہ میں صرف اپنی مدافعت کرنا ضروری سمجھتی تھیں علاء الدین کے حسنِ انتظام[۲] کی وجہ سے اِس قابل ہو گئیں کہ ہر سال موسمِ سرما میں خود پیشقدمی کر کے مغلوں کے مقبوضات پر جارحانہ کارروائیاں کرنے لگیں۔ چنانچہ ملک الغازی حاکم دیپالپور و ملتان نے مغلوں کے اوپر حملہ کرنا اپنا شعار بنا لیا تھا۔ مغلوں پر ہندوستانی فوج کا اِس درجہ ہراس

۱: جتنے منظم حملے مغلوں نے علاء الدین کے زمانہ میں کئے اتنے وسیع پیمانہ پر انھوں نے کبھی ہندوستان پر فوج کشی نہیں کی۔ اگر علاء الدین فوجوں کو از سرِ نو ترتیب نہ دیتا تو نہ معلوم یہاں کی رعایا کو جو بالعموم ہندوؤں پر مشتمل تھی وحشی مغلوں کے ہاتھوں کتنی تکلیفیں اُٹھانا پڑتیں۔

۲: علاء الدین کے حسنِ انتظام کی وجہ سے ایک معمولی سوار ۱۹ ٹنکہ ماہانہ میں اپنے نیز اپنے اہل و عیال اور گھوڑے اور ہتھیاروں کے مصارف بخوبی پورے کر لیتا تھا۔ اسی طرح فوج کو مضبوط کرنے کے لئے اُس نے گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ ایجاد کیا تاکہ سوار اُسے وقت پر دھوکہ نہ دے سکیں۔

طاری ہوگیا تھا کہ وہ پھر ہندوستان کی سرحد سے متصل اپنی سرحدات کی دیکھ بھال کے لئے بھی نہیں آتے تھے۔

سلطان اور قاضی مغیث الدین کی گفتگو[1]

ایک مرتبہ سلطان علاء الدین نے قاضی مغیث الدین سے جو بیانہ کے قاضی تھے بعض مسائل پر گفتگو کی چونکہ اس سے بادشاہ کے جاری کردہ قوانین کے جواز و عدم جواز نیز دوسری اہم باتوں پر روشنی پڑتی ہے اس لئے اس کو مختصراً تحریر کیا جاتا ہے۔ یہ گفتگو اس موقع پر ہوئی جبکہ وہ اپنی زندگی کے تیسرے اور آخری دور سے گذر رہا تھا اور اس کی مطلق العنانی شباب پر تھی۔

علاء الدین اُمّی محض ایک ٹھیٹ سپاہی زادہ تھا اس کی علماء کے ساتھ نشست و برخاست غالباً کبھی نہیں رہی۔ جب وہ بادشاہت کے مرتبہ پر پہونچا تو وہ اپنی عدم واقفیت کی وجہ سے امور سلطنت کی انجام دہی میں مشروع و نامشروع کے مابین تمیز نہیں کر پاتا تھا۔ علما میں صرف قاضی مغیث الدین بیانوی مولانا ظہیر لنگ اور مولانا مشید کہرامی اس کے پاس آتے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ اس نے قاضی مغیث الدین سے تین چار باتیں (شرعی نقطۂ نگاہ معلوم کرنے کی غرض سے) دریافت کیں۔ ان میں پہلی بات یہ تھی کہ خراج گذار کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ خراج ذمی کے اوپر واجب الادا ہے وہ اس کو اس طرح ادا کرے کہ جس طرح نذرانہ پیش کیا جاتا ہے اس میں دینے والے کا ہاتھ نیچے اور لینے والے کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ خراج گذار اپنے عجز و انکسار اور مطیع و فرمانبردار ہونے کا اقرار کرے۔ اس پر علاء الدین ہنسنے لگا اس نے کہا کہ شرع کی رو سے تو خراج گذار کو اتنا مطیع و فرمانبردار ہونا چاہئے جتنا کہ آپ نے بتایا لیکن آج کیفیت یہ ہے کہ دیہات کے چودھری خوط، مقدم وغیرہ اعلیٰ درجے کے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ضیائے برنی صفحہ ۲۸۹ تا صفحہ ۲۹۶ ...

گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں، نفیس و پاکیزہ لباس پہنتے ہیں اور بہترین اسلحہ جات سے مسلح ہو کر آپس میں ایک دوسرے سے جنگ کرتے ہیں، شکار کھیلتے ہیں اور خراج، جزیہ و چرائی وکری محصولات کا ایک پیسہ بھی اپنے پاس سے ادا نہیں کرتے بلکہ الٹا اور اپنے حقوق گاؤں والوں سے وصول کرتے ہیں، مجلسیں منعقد کرتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اتنے سرکش ہیں کہ وہ بلانے سے بھی (حساب فہمی کے لئے) دیوان ریاست کے پاس نہیں آتے۔ میں اس صورت کو کیونکر برداشت کر سکتا تھا اسلئے میں نے (شرع سے ناواقف ہونے کے باوجود) انتظاماً ان کو قوانین کے ذریعہ مطیع و فرمانبردار بنانے کی کوشش کی ہے[1] اور عمال حکومت کو ہدایات دے رکھی ہیں کہ وہ ان کے پاس ان کی ضرورت کے بقدر مال و اسباب رہنے دیں تاکہ وہ سال بسال اچھی طرح سے اپنا گذارہ کر سکیں۔

دوسری بات قاضی صاحب سے یہ دریافت کی کہ وہ کارکن جو رشوت لیتے ہیں یا قلم کے زور سے[2] سرکاری مال چراتے ہیں یا غبن کرتے ہیں کیا ایسا کرنے کی انھیں ازروئے شریعت اجازت ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ شرع تو ان باتوں کی اس صورت

---

[1] علاء الدین کی اس تقریر سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس نے زمینداروں اور چودھری و مقدم وغیرہ کو محض ایک عام کسان کے برابر کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نے اس طبقہ کو اتنا کنگال و محتاج نہیں کر دیا تھا جتنا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے۔ تیسرے اس کی تقریر کا ماحصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک کسی ذمی کو مطیع و فرمانبردار بنانے کا تعلق ہے اسے شرعی نقطہ نظر سے اختلاف نہیں لیکن یہ دوسری بات ہے کہ اس نے عدم واقفیت کی وجہ سے جو قوانین جاری کئے وہ شرعی اصولوں سے کچھ ہٹے ہوئے ہوں اور اس کوتاہی کا وہ معترف ہے۔

[2] مثلاً اگر سرکاری مال حساب میں جتنا جمع ہونا چاہئے اس سے کم کا اندراج کر کے فاضل رقم یا مال کو ہضم کر لینا۔

میں بھی اجازت نہیں دیتی جبکہ اُن کی تنخواہیں ان کے گذارہ کے لئے ناکافی ہوں۔ البتہ جو شخص بیت المال سے کچھ چرا لے اُس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائیگا بلکہ اس سے نرم دوسری سزائیں حاکم وقت دے سکتا ہے۔ اس پر سلطان نے کہا کہ میں نے "دیوان ریاست" کے حکام کو ہدایات دے رکھی ہیں کہ کارکنوں، متصرفوں اور عاملوں کے نام جانچ پڑتال کے بعد جو رقوم نکلیں اُن کی وصولیابی کے لئے اُن پر سختیاں کریں اور مختلف قسم کی سزائیں دیں مثلاً بیدوں کی سزا دیکر یا قید و بند کی سزائیں دیکر اُن سے بقیہ رقوم کو وصول کریں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے ان کی تنخواہیں بھی اُن کے گذارے کے بقدر کردی ہیں تاکہ وہ لوگ چوری وغبن وغیرہ سے باز آجائیں۔ چنانچہ رشوت خواری کی عادت انھوں نے قریب قریب ترک کردی ہے۔

تیسری اور چوتھی بات جو سلطان نے دریافت کی اس کی زد چونکہ خود اس پر پڑتی تھی اسلئے اَلْحَقُّ مُرٌّ کے مصداق اس کا جواب نہایت تلخ تھا پھر بھی قاضی صاحب موصوف بادشاہ کی سطوت و شوکت کا لحاظ کئے بغیر راست گوئی پر قائم رہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ جو مال غنیمت مجھے دیوگیر کے حملے میں ہاتھ لگا ہے اُس کا مالک میں ہوں یا وہ بیت المال کی ملکیت ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ ہر وہ مال جو لشکر اسلام کی قوت سے حاصل کیا جائے بیت المال میں جمع ہونا چاہئے بادشاہ اُس کا تنہا مالک نہیں ہو سکتا اس پر بادشاہ نے خفگی کا اظہار کیا لیکن قاضی صاحب کی حق گوئی کی وجہ سے جو صحیح بات تھی وہ سلطان پر واضح ہو گئی۔

چوتھا مسئلہ یہ تھا کہ بادشاہ اور اُس کے اہل وعیال کا بیت المال میں کتنا حق ہے۔
قاضی صاحب نے جواب دیا کہ خداوند عالم اگر خلفاء راشدین کی اتباع کرکے اُخروی درجات کی سربلندی چاہتے ہیں تو صرف ۲۳۴ ٹنکہ سالانہ جو ایک عام سپاہی کی تنخواہ ہے بیت المال سے برآمد کرسکتے ہیں اور اگر میانہ روی کو کام میں لائیں تو گذارے کیلئے اتنی

تنخواہ کافی ہوگی جتنی اُمرار سلطنت کو ملتی ہے اور اگر علمارِ دُنیا (یعنی مصلحت پرست علماء)
کی روایت پر عمل کیا جائے تو اس تنخواہ میں اتنا اور اضافہ کر لیجیے کہ آپ کی حیثیت اُمراء
سلطنت سے ممتاز ہو جائے ان تینوں صورتوں کے علاوہ جو لاکھوں، کروڑوں کی رقم
حرم پر خرچ کی جاتی ہے اُس کی قیامت کے دن جوابدہی کرنا ہوگی۔ اس پر سلطان بڑا چین
بجبیں ہوا اور اسی غصہ کے عالم میں قاضی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ کیا یہ تمام
سزائیں بھی نامشروع ہیں جو میں شراب خواروں، شراب بیچنے والوں، شراب کشید
کرنے والوں، زنا کرنے والوں اور لواطت کرنے والوں کو دیتا ہوں قاضی صاحب
نے جواب دیا کہ ہاں یہ سزائیں بھی نامشروع ہیں۔ بادشاہ یہ سن کر طیش میں بھرا ہوا محل سرا کے
اندر چلا گیا اور قاضی صاحب ڈرتے ہوئے اپنے گھر چلے آئے۔ دوسرے دن جب
وہ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو کر سر سے کفن باندھے ہوئے دربار میں حاضر ہوئے
تو انھیں یقین تھا کہ بادشاہ جاہل ہے انھیں ضرور سزائے موت کا حکم دیگا لیکن اُن کے
اندازہ کے بخلاف سلطان نے انھیں اُن کی حق گوئی پر داد دی اور خلعت فاخرہ کے
علاوہ ایک ہزار تنکہ انعام میں دئیے اس کے بعد مخاطب کر کے اپنی صفائی پیش کی کہ
"اے مولانائے مغیث اگرچہ میں زیورِ علم سے بے بہرہ ہوں لیکن مسلمان ہوں و مسلمان
گھر میں پیدا ہوا ہوں۔ (میرا منشا یہ ہرگز نہیں کہ خلافِ شرع سزائیں دوں) ملک کی مفاد کی
خاطر تقاضائے وقت کی مناسبت سے جو موزوں سزائیں میرے ذہن میں آتی ہیں ان کو نافذ
ہونیکا حکم دیتا ہوں (دل کا حال اللہ جاننے والا ہے)۔ مجھے نہیں معلوم کہ کل قیامت کے
دن مجھ سے کس قسم کی باز پرس کی جائیگی۔ پھر بھی! اے مولانائے مغیث اپنے خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر
..... زانیوں، شراب خواروں، چوروں اور غبن کرنیوالوں کیلئے جو ممانعت کرتا ہوں اور ان کو
جو سزائیں دیتا ہوں ان کو اندر شریعت کی رو سے کار فرما ہوتی ہوں گو سزائیں بظاہر شریعت کے حکم کے
خلاف معلوم ہوتی ہوں) برنی کے الفاظ یہ ہیں "ودر باب ایں چہار طائفہ آنچہ حکم میفرمایم راست"
([illegible] صفحہ ۲۹۰ [illegible])

نرخنامہ علائی

جنس	مقدار	قیمت
گیہوں	فی من	۷½ جیتل
جو	〃 〃	۴ 〃
دھان	〃 〃	۵ 〃
ماش	〃 〃	۵ 〃
چنا	〃 〃	۵ 〃
موٹھ	〃 〃	۳ 〃
نمک دید	〃 〃	۵ 〃
نمک دیگر	۲ سیر	یک جیتل
روغن ستور (گھی)	۱½ 〃	〃
روغن کنجد (تل کا تیل)	۳ سیر	〃
نبات (مصری)	یک سیر	۲½ 〃
شکر تری	〃 〃	۱½ 〃
شکر سرخ (گڑ)	〃 〃	½ 〃

جنس	مقدار	قیمت
خز (ریشم) دہلی	فی تھان	۱۲ ٹنکہ
خز کونلہ	〃	۶ ٹنکہ
مشروع شعری (اونی کپڑا) اعلیٰ قسم کا		۳ ٹنکہ
برد مہین یا دوال لعل		۶ جیتل
برد کمینہ معمولی		۳½ 〃
استر لعل ناگوری		۲۴ 〃
استر معمولی		۱۲ 〃
چادر		۱۰ جیتل
شیریں بافت مہین		۵ ٹنکہ
〃 اوسط درجہ		۳ ٹنکہ
〃 〃 معمولی		۲ 〃

جنس	قیمت
سلاہتی عمدہ قسم	۶ ٹنکہ
〃 درمیانی قسم	۴ 〃
〃 معمولی 〃	۲ 〃
کرپاس (سوتی کپڑا) باریک	۲۰ گز یک ٹنکہ
〃 〃 معمولی	۴۰ 〃

جنس	قیمت
دودھ دینے والی گائے	۳ یا ۴ ٹنکہ
〃 〃 بھینس	۱۰ تا ۱۴ ٹنکہ
اسپ اعلیٰ درجہ کا	۱۰۰ تا ۱۲۰ 〃
〃 اوسط 〃	۸۰ تا ۹۰ 〃
〃 معمولی 〃	۶۵ تا ۷۰ 〃
ٹٹو	۱۰ تا ۲۵ 〃
غلام و کنیزک	۵ - ۱۰۰ 〃
بکری فربہ	۱۰ - ۱۲ جیتل

اسی طرح اور چیزوں کا نرخ سمجھئے۔

نوٹ:- ایک جیتل قیمت میں آجکل کے ایک پیسہ سے کچھ ہی زیادہ ہوتا تھا اور ایک ٹنکہ کی قیمت روپیہ سے کچھ زیادہ ہوتی تھی۔ من کی تول ۲½ یا فی پونڈ کے حساب سے ۲۸۰۸۰ ۵ پونڈ یا ۲۷ سیر فرشتہ کے بیان کے مطابق سیر کا وزن ۲۴ تولہ ہوتا تھا۔ جیتل کا وزن البتہ مشتبہ ہے بعض کہتے ہیں کہ ایک تولہ کا ہوتا تھا اور بعض ۱¼ تولہ کا بتاتے ہیں عہد علائی میں جو خیر و برکت اور ارزانی تھی اس کا اندازہ کرنے کے لئے فٹ نوٹ ۲۳ ملاحظہ ہو جو مسالک الابصار فی ممالک الامصار کے قابل انگریزی ترجمہ نگاروں نے درج کیا ہے۔

مثال زمانہ پیش کرنے سے قاصر ہے، برنی کے الفاظ یہ ہیں کہ "مثل آں در قہر ہاد عصر یانشان نداده اند"[1]

تیسرا دور جس کی مدت صرف چار پانچ سال ہے علاء الدین کے لئے بیکاری و بےفکری کا زمانہ ہے اس دور میں ملک کافور نائب سلطنت تھا اور عمدۃ الملک کا عہدہ بہاء الدین دبیر کے سپرد تھا جو برنی کے الفاظ میں "دیوان ابلہی بود" یعنی بیوقوف تھا۔ اسی طرح قضائے ممالک آخری عہد حکومت میں یہی لوگ تھے جن کی نااہلیت کی وجہ سے امور سلطنت میں خلل واقع ہوا۔ اور عرض ممالک کے علاوہ دیوان رسالت، دیوان وزارت اور دیوان انشاء وغیرہ کی رونق جاتی رہی، بادشاہ ضدی وخود سر ہوگیا اس نے دور دوم کے ملوک و امراء کو یا تو قتل کرا دیا یا معزول کر کے گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا۔ اس دور میں بھی بعض پرانے امراء مثلاً ملک قیران امیر شکار اور ملک قیرا بیگ معزز و محترم تھے لیکن ان کو حکومت کے کاموں میں دخل نہ تھا۔ یہ لوگ بادشاہ کے صرف ندیم ہو کر رہ گئے تھے۔

مالک کی خدمت پر حمید ملتانی مامور تھا جو ایک لاابالی طبیعت کا انسان تھا لیکن حکومت کے

ان تینوں دوروں پر جب ہم سرسری نظر ڈالتے ہیں تو اس کے عہد حکومت میں ہم کو بعض ایسی خصوصیات نظر آتی ہیں (جن کو برنی نے عجائبات روزگار میں شمار کیا ہے) جن میں اسے اولیت کا شرف حاصل ہے مثلاً (۱) اشیاء کی ارزانی (۲) ہندوستان کا پہلی مرتبہ ایک مرکز سے وابستہ ہونا اور فتوحات دکن (۳) مغلوں کا کلی استیصال (۴) لاؤ لشکر کی فراوانی و کثرت اور اس کی استقامت (۵) رعایا کی اطاعت و فرمانبرداری اور مقدمان چودھریاں وغیرہ کی سرکوبی (۶) مملکت کے چار اطراف کے راستوں کی حفاظت کا کام رہزنوں اور ڈاکوؤں سے لینا اور پھر ان راستوں پر انتہائی امن و امان کا قائم رہنا۔ (۷) بازاریوں کو بس میں کر کے کہ جن کا بس میں کرنا خود ایک امر عظیم ہے، سرکاری نرخ کو ہمیشہ ایک حال پر قائم رکھنا (۸) فن تعمیر کو ترقی دینا (۹) آخری دس سالوں میں

---

[1] برنی ص ۳۲۶۔

ملک کے اندر ہندوؤں اور مسلمانوں کا پرہیزگاری، راست گفتاری اور انصاف و دیانت کی طرف میلان (۱۰)، بادشاہ کے بلاارادہ و اہتمام ہر قوم و ملت کے بزرگوں، ہر علم کے اُستادوں نیز ہر فن کے ماہروں کا اجتماع جنھوں نے دارالملک دہلی کو رشک بغداد، غیرتِ مصر، ہمسر قسطنطنیہ اور موازی بیت المقدس بنا دیا۔

علاء الدین حقیقتاً عجیب و غریب صفات کا مالک تھا اس کی ذات میں اتنی خوبیاں جمع تھیں جو ایک شخص میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ وہ بہادر اور منچلا سپاہی، سخت اور مستقل مزاج حاکم، ہوشیار اور معاملہ فہم مدبر تھا۔ اُس نے تخت نشین ہونے سے پہلے ہی اپنے آپ کو ایک بہادر سپاہی اور فاتح سپہ سالار کی حیثیت سے ممتاز کر لیا تھا۔ اُس کا دیوگیر پر حملہ اس کی بہادرانہ قوتوں کا عملی مظاہرہ تھا۔ یہ حملہ ایک بڑا کارنامہ ہے جس نے اُس کے ذرائع کو مستحکم اور اُمیدوں کو حوصلہ افزا بنا دیا۔ اِس کا دورِ حکومت صرف بیس سال کا تھا مگر اس قلیل عرصہ میں اُس نے منگولوں کو شکست دی، راجپوتوں پر فتح یابی حاصل کی اور تمام دکن کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ اتنے وسیع پیمانہ پر مہاراجہ اشوک کے بعد اور اورنگ زیب سے پہلے کسی بادشاہ نے ہندوستان میں اتنی فتوحات حاصل نہیں کیں اسلئے وہ اپنے آپ کو سکندرِ ثانی کہنے میں حق بجانب تھا۔

وہ محض ایک فاتح ہی نہیں تھا بلکہ نظامِ حکومت کو از سرِ نو ترتیب دینے اور اس کو مستحکم بنانے میں بھی انتہائی انہماک اور دلچسپی کا اظہار کیا اس لئے وہ اُن چند ممتاز سیاہیوں میں سے ہے جو کہ مدبرانہ خصوصیات رکھتے تھے۔ اُس پر تنقید کی جاتی ہے کہ اُس نے حکومت کو حد درجہ مرکزی بنا دیا تھا مگر ایک بادشاہ جو ہر وقت غیر معتمد، باغیوں اور فتنہ پرور سرداروں سے گھرا رہتا ہو اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ بہر حال اُس کی حکومت کتنی ہی خود مختارانہ کیوں نہ ہو اُس نے اپنے مشیروں سے صلاح و مشورہ لینے کا کوئی موقع فروگذاشت نہیں کیا اور سلطنت کے تمام بڑے بڑے اور اہم امور اُن کے

مشورے سے انجام دیئے۔

علاء الدین سیاست کے میدان میں حقیقت پسند تھا اور وہ حقیقتوں کا اُن کی اصلی حالت میں مقابلہ کرنے پر یقین رکھتا تھا اور اس کو ہر پہلو سے سلسلہ وار جانچتا تھا قبل اس کے کہ اس پر عمل کرے۔ اُس نے کوئی بھی کام عجلت اور بے ڈھنگے پن سے نہیں کیا۔ اور کوئی چیز تقدیر کے بھروسہ پر نہیں چھوڑی۔ وہ ہر تجویز کو بہت فکر و تامّل کے بعد جاری کرتا تھا مگر جب وہ ایک دفعہ جاری ہو گئی تو پھر اُس کی تکمیل میں کسی رکاوٹ کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ادھورے کام خطرناک ہوتے ہیں اسکی اصلاحوں کی سب سے قابلِ تعریف بات یہ تھی کہ اُس نے عوام کو خوش کر دیا اور سرمایہ داروں اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کے ظلم کو کم کر دیا۔ برنی اس کے آخری دورِ حکومت کے بارے میں لکھتا ہے کہ "اُس نے ملک کی بہتری کے لئے تمام منشّی اور ممنوع چیزوں کو اور فسق و فجور کے اسباب کو قہر و غلبہ، تعزیر و تشدّد، قید و بند سے روک دیا اور مال جو دنیا اور ملکی فساد کا ذریعہ ..... ہے سلطان علاء الدین نے ہر بہانہ سے کہ جو اس کو ملتا مالداروں اور حکّام سے سختی سے لے لیتا اور بازار والوں کو کہ جو دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والی اور سب سے زیادہ فریب دینے والی قوم ہے، سچائی اختیار کرنے اور سچائی کے ساتھ مال بیچنے اور سچ بولنے کے لئے خون خرابہ میں رکھتا تھا" اُس کے بعد لوگوں کے دینی شغف اور پاکبازی کے میلانات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "عہدِ علائی کے آخری چند سالوں میں شراب، معشوق، فسق و فجور، جوا، فحاشی وغیرہ کا نام اکثر آدمیوں کی زبان پر کبھی نہیں آنے پایا۔ بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے۔ مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سود خواری، ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہیں ہو سکتے تھے، بازار والوں سے جھوٹ بولنے

ماخذ:- برنی صفحہ ۳۴۲-۴۳

کم تولنے اور آمیزش وغیرہ کرنے کا رواج اُٹھ گیا تھا۔"[1]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ دشمنوں، باغیوں اور غداروں کو سزائیں سخت دیتا تھا[2] اور بعض اوقات اس کی سزائیں حدود شریعہ سے تجاوز کر جاتی تھیں لیکن یہ سب کچھ کارروائیاں ملک کے مفاد کی خاطر تھیں جن کو وہ نہایت نیک نیتی کے ساتھ انجام دیتا تھا اس میں احکام شریعت کی اہانت ہرگز مقصود نہیں تھی[3] چنانچہ ایک مرتبہ جب قاضی مغیث الدین نے اس کو بتایا کہ بعض قوانین کے نفاذ میں شریعت کے اصولوں کو مدنظر نہیں رکھا گیا ہے تو وہ سخت متعجب ہوا اور اپنی لاعلمی وجہالت کا اقرار

ع۱:۔ برنی ص۳۳۶ ۔

ع۲:۔ غدار جلالی اُمراء نیز راجہ رن تھمبور کے بیوفا سرداروں کے ساتھ اُس نے جو سلوک کیا اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس نے نو مسلم مغل باغیوں کو بھی بڑی سخت سزائیں دیں۔ چونکہ یہ لوگ اُس زمانہ میں نہایت غیر متمدن، ناشائستہ اور جاہل ہوتے تھے لیکن پھر بھی بڑے بڑے عہدوں کی تمنا کرتے تھے جو انھیں نہیں مل سکتے تھے یہی ان کی ناراضی وشورش کا اکثر سبب ہوتا تھا۔ علاؤالدین نے ان کی شرارت سے زچ ہو کر نوکریوں سے الگ کر دیا تو انھوں نے مایوس ہو کر بادشاہ کے قتل کی سازشیں کیں جس کا اسے علم ہو گیا چنانچہ اس نے سزا کے یہ حکم دیا کہ نومسلم مغل جہاں ملیں قتل کر دئے جائیں اور نہ صرف ان کا اثاثہ البیت بلکہ بیوی و بچے تک قاتل کو دیدئے جائیں چنانچہ بیس تیس ہزار مغل قتل کر دئے گئے (برنی ص۳۳۶)۔

ع۳:۔ مورخین نے علاؤالدین کی تعریف کی ہے کہ اُس نے اُمور سلطنت کو دنیوی اُمور سمجھ کر مذہبی قوانین کی پابندی سے آزاد کر دیا۔ اس قسم کے بیانات ہم کو دھوکہ میں ڈال سکتے ہیں جبکہ وہ ایک اسلامی حکومت کے بارے میں استعمال کئے جائیں کہ جہاں کا سلطان خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو محدود طاقتیں رکھتا ہے کیونکہ وہ قانون ساز نہیں ہو سکتا اور شریعت کے قوانین کو جاری کرنے پر مجبور ہے۔ عملی طور پر اگرچہ بعض خود سر حکمرانوں نے ان قوانین کو چھوڑ دیا لیکن وہ تمام نظام دینکر ہونیکی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

کرنے کے بعد قاضی صاحب کو اُن کی دلیری اور حق بجانب تنقید پر انعام و اکرام دیا۔
واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک جاہل آدمی کی طرح مذہبی اصولوں کی پابندی کرنے میں بہت
کٹر تھا اور اس کو اپنے زمانہ کے بزرگان دین سے عقیدت و ارادت تھی۔ خزینۃ الاصفیاء
میں ہے "جلال الدین و علاء الدین بادشاہان دہلی ہم حلقہ ارادت آنحضرت (شیخ بو علی قلندرؒ)
بگردن خود داشتند"[1]۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ[2] کا وہ بیحد معتقد تھا اپنے دربار
کے امراء محمد کاشف حاجب اور ملک قیرا بیگ کو جو حضرت شیخ کے مرید تھے بارہا
تحائف و ہدایا دیکر شیخ موصوف کی خدمت میں بھیجا۔ ان کو ہدایت دے رکھی تھی کہ
محبوب الٰہیؒ کو محفل سماع میں جس شعر پر وجد آئے وہ اس کو آکر سنایا کریں چنانچہ ایک
بار محبوب الٰہیؒ کو حکیم سنائی کے ان دو شعروں پر وجد طاری ہوا ۔

بیش منما جمالِ جاں افروز   در نمودی برو سپند بسوز
آں جمالِ تو چیست ہستیٔ تو   واں سپند تو چیست ہستیٔ تو

قیرا بیگ ان اشعار کو لکھ کر سلطان علاء الدین خلجی کے پاس پہونچا۔ سلطان اشعار کو بار
بار پڑھتا، آنکھوں سے لگاتا اور تعریف کرتا تھا۔ قیرا بیگ نے سلطان کی یہ عقیدت دیکھ کر
کہا کہ اس حسنِ اعتقاد کے باوجود آپ نے اب تک شیخ سے ملاقات نہیں کی جو تعجب کا
باعث ہے اس پر سلطان نے جواب دیا " اے قیرا بیگ ترک ما پادشاہیم از سر تا پا
آلودۂ دنیا، و بدیں آلودگی شرم می دارم کہ آنجناب پاک را ببینم"۔ لیکن اسی وقت اپنے
جگر گوشوں خضر خاں و شادی خاں کو محبوب الٰہیؒ کے دامنِ ارادت سے وابستہ ہونے
کے لئے دو لاکھ ٹنکے کے ساتھ بھیجا۔ چنانچہ دونوں مرید ہو کر محبوب الٰہیؒ کی صحبت سے

---

۱ :- خزینۃ الاصفیا جلد اوّل ص ۳۲۲ ۔ ۲ :- حضرت محبوب الٰہی کے فیوض و برکات
کا بڑے والہانہ انداز میں برنی نے ذکر کیا ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروزشاہی از برنی
ص ۳۴۱ تا ۳۴۶ ۔

مستفیض ہوتے رہے اور خضر خاں ہی نے خانقاہ اور مقبرہ و مسجد کی عمارت بنوائی تھی[۱]

علاء الدین مذہبی علوم سے ناواقف تھا اس کو صرف الحمد، قل ہو اللہ، التحیات اور
دونوں درود شریفیں یاد تھیں اسلئے اس سے ہم ایک مذہبی آدمی کی طرح دینی شغف
کی توقع نہیں رکھ سکتے[۲]۔ تاہم یہ بات فراموش کرنے کے قابل نہیں ہے کہ اُس کے
آخری عہد حکومت میں بزرگان دین کی تعلیمات سے ایک دینی ماحول پیدا ہو گیا تھا
اور خاص و عام، غریب و دولتمند، بادشاہ و فقیر، عالم و جاہل، شریف و رذیل، شہری
و دیہاتی، غازی و مجاہد اور آزاد و غلام سب کے سب مذہبی میلانات رکھتے تھے
اور برنی کے بقول "سنن و فرائض کے علاوہ کثرتِ نوافل اور اس کی پابندی کا معاملہ
اس بابرکت زمانہ میں اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ خاص بادشاہ کے محل میں بہت
سے امراء، سلاحدار، لشکری و شاہی نوکر (جو اکثر و بیشتر حضرت محبوب الٰہیؒ کے مرید ہوتے تھے)

۱۔ ماخوذ از مونس الارواح و مرأۃ الاسرار بحوالہ رسالہ معارف ص ۲۵۰ بابتہ اکتوبر ۱۹۳۶ء۔

۲۔ مولانا شمس الدین ترک محدث جو حنبلی یا غالباً شافعی المذہب تھے مصر سے احادیث شریف کی کچھ کتابیں لیکر ہندوستان آئے اور ملتان میں آکر مقیم ہو گئے اور پھر وہیں سے واپس چلے گئے دہلی تک نہیں پہونچ پائے انھوں نے علاء الدین کے حسن انتظام پر یہ لکھکر مبارکباد دی کہ "اے بادشاہ مبارکت باد کہ بدیں چہار عمل درمیان انبیاء جائے تست"، لیکن بعض دینی کوتاہیوں پر اُسے تنبیہ بھی کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر کچھ تساہل پیدا ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہو کہ علاء الدین بجائے اس کے کہ ان تنبیہات پر ناراضی کا اظہار کرتا اُسے افسوس ہوا کہ وہ محدث موصوف کی زیارت نہ کر سکا۔ اور یہی نہیں بلکہ اسکے سعد منطقی سے جو اپنے زمانہ کا مشہور عالم و فلاسفر تھا جب یہ معلوم ہوا کہ محدث موصوف نے بادشاہ کی رہنمائی کے لئے ایک کتاب جس میں منتخب احادیث درج تھیں اور ایک رسالہ بہاء الدین دبیر ممالک کے توسط سے بھیجا ہے لیکن رسالہ اسکی خدمت میں پیش نہیں کیا گیا (اس رسالہ میں غالباً قاضی ملتان حمید اور محکمۂ قضا کی بدعنوانیوں کا ذکر تھا چونکہ اس کا اثر بہاء الدین

(باقی مضمون صفحہ ۴۰۵)

چاشت اور اشراق کی نمازیں ادا کرتے تھے اور ایام بیض عشرۂ ذی الحجہ کے روزے رکھتے تھے" ایسے ماحول میں رہکر علاء الدین کیونکر طاعت وعبادات کے فرائض سے غافل رہ سکتا تھا۔

اُس نے اپنی رعایا کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی اور نہ انھیں اپنے دین ومذہب سے پھیرنے اور زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کی البتہ بام (وام) مارگیوں اور شاکت مت کے پیرووٗں کے شرم انگیز اعمال وافعال کا ضرور تدارک کیا کیونکہ وہ بد اخلاقی وبیحیائی کا سخت دشمن تھا جو ان لوگوں کے مذہبی مراسم کا ایک لازمی جز تھے۔ ان لوگوں کو لامذہب، بودھ اور اباحتی[1] کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ضیائی برنی نے ان کے افعال ناستودہ کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا ہے لیکن فرشتہ نے ان کے اعمال ناشائستہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بسمع سلطان رسید کہ جمعے ازہر دم اباحتیان در دہلی جمع گشتہ اند ودر رسالے یکشب چنانکہ داب الیشاں است مجمعے ساختہ بازن وخواہر ومادر وجمیع محارم فراہم می آیند، سلطان...... آرہٗ سیاست برفرق الیشاں کشیدہ اثرے ازاں جماعت نگذاشت"[2]

سلطان علاء الدین خلجی نے عوام الناس کی اخلاقی گراوٹ کو دور کرنے کی جو انتھک کوششیں کی ہیں وہ ہر لحاظ سے مستحسن ہیں۔ خزائن الفتوح کے مطالعہ سے سلطان کی بعض اصلاحات کا پتہ لگتا ہے۔ "اس نے خون پینے والے جادوگروں (سحرۂ خون آشام)

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۰۴: پر بھی پڑتا تھا اسلئے بہاء الدین نے یہ رسالہ سلطان کی خدمت میں پیش نہیں کیا اور اُسے چھپا لیا) تو وہ بہاء الدین سے بہت ناراض ہوا اور اُس کو اور اُس کے لڑکے کو برخاست کر دیا۔ (برنی ص ۲۹۶) علاء الدین کو لادین سمجھنے والے اِس روایت پر غور کریں (مولف)

ع ۱:۔ ملاحظہ ہو منسلکہ ضمیمہ ع ۲

ع ۲:۔ فرشتہ ص ۱۲۰ ۔

کو بالکل ختم کر دیا۔ اس گروہ کے سب لوگوں کو گردن تک زمین میں گڑوا کر سنگسار کرا دیا"۔
"اصحاب اباحت کو نیست و نابود کرا کر دم لیا"۔ "طوائفوں کے نکاح جبراً کرا دئے"۔ [1]
شراب کی لعنت کو ملک سے دور کرنے میں اس نے جو کچھ جدوجہد کی اس کا تذکرہ کیا
جا چکا ہے۔ برنی نے لکھا ہے کہ شراب کے امتناعی احکامات کی وجہ سے سلطان کو بہت
بڑا مالی نقصان برداشت کرنا پڑا یعنی "خراجہائے بے اندازہ ایشاں از دفاتر دور کردند" [2]
لیکن چونکہ یہ احکامات درستی اخلاق اور استحکام سلطنت کے لئے ضروری تھے اس لئے
اس نے مالی نقصان کی قطعی پرواہ نہ کرکے احکامات کے نفاذ میں سختی سے کام لیا۔

علاؤالدین کے عدل و انصاف کا جہاں تک تعلق ہے یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ حکومت
کے باغیوں، خائنوں، فسادیوں اور اخلاق و شرافت کا خون کرنے والوں کو خواہ وہ
ہندو ہوں یا مسلمان نہایت سخت سزائیں دیتا تھا۔ برنی کی بعض عبارات کے مفہوم کو
صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے کچھ تاریخ نویسوں نے اس پر الزام لگایا ہے کہ وہ ہندوؤں
کے لئے سخت تھا لیکن عصر حاضر کے نامور محققین کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ الزام سراسر غلط
اور بے بنیاد ہے۔ مورلینڈ نے اپنی مشہور فاضلانہ تصنیف [3] میں نہایت عالمانہ طریقہ پر
اس موضوع پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں جہاں لفظ
"ہندو" استعمال کیا ہے اس سے مراد خوطہ، چودھری، مقدم اور وہ دیگر طبقے ہیں جو
ملک کے اقتصادی نظام میں بڑے طاقتور ہو گئے تھے اور جن کی وجہ سے عام ہندو
رعایا دبی ہوئی تھی۔ اسلئے ان طبقوں کا کسنا جانا سیاسی حالات کے مطابق تھا۔ پروفیسر

ع ۱:۔ خزائن الفتوح مطبوعہ ص ۱۵ تا ص ۲۱

ع ۲:۔ تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۴

ع ۳ Agrarian System during the Muslim Rule in India.

محمد حبیب صاحب نے بھی اپنے ایک فاضلانہ مقالہ[ع۱] میں بتایا ہے کہ "یہ عام خیال کہ علاءالدین نے ہندوؤں کو گھوڑے پر چڑھنے اور عمدہ کپڑے پہننے کی ممانعت کر دی تھی برنی کے مفہوم کو غلط سمجھنے سے پیدا ہوا ہے"۔ اسی طرح دولت کی فراوانی کو روکنے کے لئے جو ملک میں متواتر بغاوتوں کا سبب بنی ہوئی تھی اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے صاحبِ ثروت طبقوں کو دبایا اور ان سے دولت حاصل کر لی تو اس کا یہ اقدام بلا امتیاز مذہب و ملت صرف سیاسی مصالح کی بنا پر تھا جس کو غلط طور سے مذہبی رنگ دیدیا گیا۔[ع۲] ڈاکٹر ترپاٹھی نے صحیح لکھا ہے کہ "حصول دولت کے سلسلہ میں جب اس نے مسلمان امراء سے کوئی رعایت نہیں برتی تو پھر ہندو امراء کو کیوں چھوڑ دیتا"[ع۳]

مختصر یہ کہ علاءالدین کا عہدِ حکومت مجموعی طور پر نہایت خیر و برکت کا زمانہ تھا۔ اس کے حسنِ انتظام کی وجہ سے راستے محفوظ، شہر آباد اور عوام خوش حال تھے، زراعت و تجارت، صنعت و حرفت اور فن عمارت کو اس نے خوب ترقی دی اس کے یہاں ستر ہزار کاریگر، معمار، بیلدار، گل کار وغیرہ باقاعدہ ملازم تھے وہ عالیشان عمارت کو دو تین دن میں اور قلعہ کو دو ہفتہ میں تیار کرا لیتا تھا۔ اگرچہ وہ خود پڑھا لکھا نہ تھا لیکن علماء و شعراء کی قدر کرتا تھا۔ حضرت امیر خسروؒ اس کے درباری شاعر تھے اور علاوہ انعام و اکرام کے ایک ہزار روپیہ سالانہ تنخواہ پاتے تھے۔ اسی کے زیر سرپرستی حضرت امیر نے نظامی گنجوی کی پنج گنج یا خمسۂ نظامی کا جواب لکھا۔ اور پورا خمسہ[ع۴] سلطان علاءالدین کے نام سے معنون کیا۔

ع۱: An Introduction to the Study of Medieval (Historical journal) India (Aligarh Magazine).

ع۲: Politics in Pre-Mughal Times by Dr. I. Topa

ع۳: Some Aspects of Muslim Adm. by Dr. Tripathy

ع۴: مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو "سلطان علاءالدین خلجی کے مذہبی رجحانات" مؤلفہ خلیق احمد صاحب نظامی

(باقی مضمون صفحہ ۴۰۸ پر)

اسی طرح خزائن الفتوح" میں سلطان کی فتوحات کا ذکر کیا ہے جو تاریخی اعتبار سے بڑی اہم و مستند تصنیف ہے ہمعصر مورخ برنی نے عہد علائی کے علماء و مشائخ، قرّاء، ندماء، شعراء، مورخین، اطباء، وغیرہ کا جو بلا اہتمام دارالسلطنت دہلی میں جمع ہو گئے تھے[۲]، صفحات کے اندر نہایت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے ہم اسے بخوفِ طوالت نظر انداز کر کے عہد علائی کو ختم کرتے ہیں۔ ○

فصل دوم خلجیوں کا زوال

شخصی حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اگر تختِ حکومت پر کوئی قابل اور منتظم حکمراں نہیں رہتا تو یہ فوراً پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ علاء الدین کے مرنے کے بعد اُس جیسا کوئی حکمراں اُس کا قائم مقام نہ بن سکا اس لئے ہر طرف بدنظمی شروع ہو گئی علاء الدین نے جن درباری امیروں اور فوجی سرداروں کو اپنے حسنِ انتظام سے دبا رکھا تھا وہ پھر اپنے پرانے ڈھنگ پر آجانے کی کوشش کرنے لگے۔ ہندو راجہ و زمیندار جن پر لگان بڑھا دیا گیا تھا اور حسابات کی گہری جانچ ہوتے رہنے سے سخت نقصان اُٹھا رہے تھے وہ سب

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۰۷: ۔ ۔ امیر خسرو کے خمسہ میں "مطلع الانوار" نظامی کے مخزن الاسرار کا جواب ہے ۶۹۸ھ میں دو ہفتہ کے اندر تمام ہوئی اس میں ۳۳۱۰ اشعار ہیں۔ تصوف کے مضامین ہیں۔ "شیریں خسرو" رجب ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی ۴۱۲۴ شعر ہیں۔ "آئینہ سکندری" نظامی کے سکندر نامہ کا جواب ہے سال اختتام ۶۹۹ھ۔ اشعار کی تعداد ۴۴۵۰ ہے "لیلیٰ مجنوں" میں ۲۶۶۰ شعر ہیں ۶۹۸ھ میں ختم ہوئی۔ "ہشت بہشت" سلسلۂ پنج گنج کی سب سے آخری مثنوی ہے نظامی کے "ہفت پیکر" کا جواب ہے ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی اس کے اندر ۳۳۰۲ شعر ہیں خمسۂ نظامی میں ۲۸ ہزار اور خسرو کے پنج گنج میں ۱۸ ہزار شعر ہیں۔

[۲]: تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از برنی ص ۳۴۱ تا ص ۳۶۷

سلطنت کے زوال کے متمنی تھے سلطنت کے اعلیٰ افسروں سے لیکر گانوں کے ادنےٰ پٹواریوں اور مقدموں تک کو بادشاہ کے مرنے کی بڑی خوشی ہوئی کیونکہ بادشاہ کی سخت گیر پالیسی نے اُن کی رشوت ستانی کے دروازوں کو بند کر رکھا تھا۔ سوداگر بھی اپنے من مانے منافع کی محرومی سے نجات پا گئے۔ علاء الدین کے بیٹوں مین کوئی بھی اس قابل نہ تھا جو عظیم الشان سلطنت کے بار کو برداشت کر سکے۔ اس صورت میں سلطنت کی بربادی صرف وقت کی منتظر تھی اور وہ وقت بھی بہت جلد آ گیا۔

(۳) سلطان شہاب الدین عمر بن علاء الدین خلجی

علاء الدین کے مرنے سے کچھ پیشتر اُس کے چہیتے غلام ملک کافور نے ایک دستاویز لکھا کر اُس پر سلطان کی مہر لگوائی تھی۔ اِس دستاویز کے بموجب خضر خاں کو ولیعہدی سے معزول اور شہاب الدین عمر کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ کافور کو وزارت عظمیٰ کا عہدہ پہلے ہی سے حاصل تھا اُس نے تمام درباری اُمرا کو جمع کر کے سلطان کا وصیت نامہ دکھایا اور پانچ چھ سالہ شہزادے شہاب الدین عمر کو تخت پر بٹھا کر سب سے اُس کی بیعت کرائی اور خود اُمورِ سلطنت کو انجام دینے لگا۔

اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ ملک سنبل کو گوالیار بھیج کر خضر خاں کو اندھا کرا دیا اور اپنے حجام کے ذریعہ شادی خاں کی آنکھیں نکلوا لیں جو کوشک سیری میں نظر بند تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ملکۂ جہاں یعنی خضر خاں کی والدہ کا تمام مال و اسباب، زر و جواہر اور نقد و جنس ضبط کر کے اس کو بھی نظر بند کر دیا۔ اور پھر اِس فکر میں ہوا کہ کسی طرح شہزادہ مبارک خاں کو (جو بعد کو سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے نام سے مشہور ہوا) بھی اندھا کرا دے۔ اِس کام کے لئے اُس نے دو آدمی مامور کئے لیکن اُن کو شہزادہ پر رحم آ گیا۔ مبارک خاں نے ان کو بہت کچھ انعام و اکرام دیکر اُلٹا انھیں ملک کافور کے قتل پر مامور کر دیا۔ اگلے دن انھوں نے دوسرے سپاہیوں کو سازش میں شریک

کر کے کافور کو جبکہ وہ اپنے رازدار خواجہ سراؤں کے ساتھ چوسر کھیلنے میں مصروف تھا قتل کر ڈالا۔ اس طرح ۳۵ دن کی مدار المہامی کے بعد کافور کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ کافور کے بعد اُمرا نے مبارک خاں کو سلطان شہاب الدین عمر کا مدار المہام بنایا۔ اُس نے دو ماہ تک اپنے خورد سال بھائی کی وزارت و نیابت کا کام انجام دیا اس اثنا میں امرا کو اپنا طرفدار بنا کر خود تاج شاہی اپنے سر پر رکھا۔ اور نابالغ بادشاہ کو گوالیار بھیجکر قید کر دیا اور پھر بعد کو آنکھوں میں سلائی پھروا دی۔

خاندانِ علائی پر یہ جو پے در پے مصیبتیں نازل ہوئیں اُس کا سبب کسی نے شیخ بشیر دیوانہ سے پوچھا جو اپنے عہد کے ایک صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے انھوں نے جواب دیا کہ جو جیسا کرے گا وہ اُس کے اور اُس کی اولاد کے سامنے آئیگا۔ علاء الدین نے جلال الدین اور اُس کی اولاد کے ساتھ کیا کیا یہ اُسی کا پھل ہے۔ حکومت و دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ ملک خدا کا ملک ہے اس کا کوئی بھی مالک نہیں اسلئے جہانداری اسی کو مسلم ہے ؎

خدائے راست بزرگی و ملک بے انباز — بدیگراں کہ تو بینی عاریت داد است
کلید فتح اقالیم و رخزائن اوست — کسے بقوت بازوئے خویش نکشاد است

(۲) سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی[۱]
۱۸ اپریل ۱۳۱۶ء تا ۸ جولائی ۱۳۲۰ء

تخت نشین ہونے کے بعد سلطان نے اپنے استاد مولانا ضیاء الدین کو صدر جہاں بنایا اور قاضی خاں

۱؎ برنی نے سلطان قطب الدین کو خضر خاں [illegible] نے شہزادہ خضر خاں کو جب [illegible] قطب الدین کی عمر حساب سے ایا ۱۷ سال کی ہونا چاہیے [illegible] اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں تھی (ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی [illegible] از برنی)

(باقی صفحہ ۴۱۱ پر)

صوبیدار بنا کر روانہ کیا۔ یہ نہایت عقلمند اور تجربہ کار امیر تھا اس نے وہاں جا کر تین چار ماہ کے اندر ایسا اچھا انتظام قائم کیا کہ لوگ الپ خاں کے عہد گورنری کو بھول گئے۔

دکن کی بغاوت

دوسرے سال بادشاہ نے دکن کی طرف توجہ کی جہاں ہر پال دیو نے دیوگری میں فتنہ و فساد مچا رکھا تھا۔ دہلی سے روانہ ہونے سے قبل بادشاہ نے ایک غلام کو جس کا نام شاہین تھا وفا والملک کا خطاب دے کر اپنا نائب مقرر کیا اور پھر منزل بمنزل کوچ کرتا ہوا دیوگیری پہونچا جہاں اُس نے ہر پال دیو اور اُس کے معاونین کو گرفتار کر کے قلعۂ دیوگیر کے سامنے قتل کرایا اور عبرت کے لئے ہر پال دیو کی کھال میں بھس بھروا کر دروازے پر لٹکوایا۔ ۱۳۱۸ء کا موسم برسات یہیں گذارا اور اپنی یادگار میں قلعہ کے اندر ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی۔ دیوگیر سے واپس ہونے سے قبل اپنے منظور نظر غلام خسرو خاں کو بادشاہ نے دکن کا والئ بنایا اور اس کا وزیر ملک یک لکھی کو مقرر کیا۔ بعدہٗ خسرو خاں کو خیمہ و خرگاہ اور بہترین ساز و سامان دیکر مدورا کی طرف روانہ کیا۔ اور خود دہلی چلا آیا۔ ○

قتل کی سازش

دہلی کو واپس ہوتے وقت راستہ میں گھٹی ساگون کے مقام پر بادشاہ کے چچا زاد بھائی اسد الدین نے اس کو قتل کرنے کی سازش کی لیکن راز افشا ہو گیا اور سلطان نے انتقاماً نہ صرف اسد الدین اور اُس کے معاونین کو بلکہ اپنے سوتیلے دادا یغرش خاں کی نسل کے کل افراد کو جو تعداد میں ۲۹ تھے اپنے ایک سردار "شادی کتہ" کو دہلی بھیج کر بےخبری کے عالم میں قتل کرا دیا۔ اتنوں کو قتل کرانے کے بعد بھی سلطان کے انتقام کی آگ سرد نہ ہوئی اُس نے گوالیار میں خضر خاں، شادی خاں اور شہاب الدین عمر کو بھی قتل کرا دیا کہ جو مجبوری و بیکسی کے عالم میں اپنی زندگی کے دن گذار رہے تھے۔ دہلی پہونچ کر دیولدیوی کو جو خضر خاں کے نکاح میں تھی گوالیار سے بلوا کر اپنی بیوی بنا لیا۔ بادشاہ نے دہلی میں بھی بعض

(فٹ نوٹ صفحہ ۴۱۳ پر ملاحظہ ہو)

اُمراء کو جن پر بغاوت کا شبہ ہو سکتا تھا قتل کرا دیا انھیں میں شاہین بھی تھا جو رشتہ میں بادشاہ کا خسر ہوتا تھا۔ اسی طرح اپنے دوسرے خسر ظفر خاں کو بیجرم و بے خطا گجرات سے بلوا کر تہِ تیغ کرا دیا۔[1]

بادشاہ کی بے راہ روی

دہلی پہونچ کر بادشاہ عیش و عشرت میں پڑ گیا اور سلطنت کے کاموں سے بالکل بے پرواہ ہو گیا۔ رات دن نشے میں چور رہتا، زنانی پوشاک پہن کر امیروں کے گھر جاتا، اور اُن کے سامنے ناچتا، جن عیبوں کو آدمی چھپاتا ہے وہ انھیں خوب ظاہر کرنے کی کوشش کرتا، آبرو باختہ کسبیوں و طوائفوں کو بلوا کر دربار میں اُمراء عالیجاہ کے برابر بٹھاتا اور کبھی کبھی مادرزاد ننگا ہو کر باہر نکل آتا، دربار میں عین الملک ملتانی اور قرابیگ جیسے جلیل القدر اُمراء کا بھانڈ اور زنانے مذاق اُڑاتے۔ سلطان کو لہو و لعب میں پھنسائے رکھنے کے لئے خسرو خاں کے بھائی حسام الدین[2] حاکم گجرات نے "توبہ" نامی ایک مسخرے کو بھیجا، ضیاء برنی اس مسخرے کے بابت لکھتا ہے کہ "وہ دربار میں ملوک و اُمراء کو ماں بہن کی گالیاں دیتا، ننگا ہو کر نمائش کرتا، اُمراء کے کپڑوں پر پیشاب کر دیتا اور گوز رہا کرتا"[3] دربار کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر اُمراء نے کنارہ کشی اختیار کرنا شروع کی اور سلطنت کے کاموں میں دلچسپی لینا ترک کر دی۔

بادشاہ نے خبطی ہونے کی وجہ سے یا اپنے عیبوں پر پردہ ڈالنے کے لئے خلیفۃ اللہ کا لقب اختیار کیا جس کی جرأت ابھی تک کسی بادشاہ کو نہیں ہو سکی تھی۔ اس کے علاوہ روزہ و نماز کو یکسر ترک کر دیا۔

خضر خاں اور شادی خاں جن کو سلطان نے قتل کرا دیا تھا چونکہ حضرت

۱: فرشتہ ص ۱۲۵ ۔ ۲: خسرو خاں و حسام الدین کی ماں ایک تھی اور باپ دو تھے ۔ ۳: برنی ص ۳۹۶

محبوب الٰہیؒ کے خاص اور عزیز مریدوں میں تھے اسلئے قطب الدین ان سے بدگمان
ہوگیا اور پھر اس کی یہ بدگمانی عداوت میں تبدیل ہوگئی۔ ان کا اثر کم کرنے کے لئے وہ
مصلحتاً سہروردیہ سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ ضیاء الدین رومی کا مرید ہوگیا تاکہ پبلک
حضرت محبوب الٰہیؒ کو چھوڑ کر بادشاہ کے پیر کی طرف رجوع ہو جائے۔ اس وقت
سلطان الاولیاءؒ کے لنگر خانہ کا خرچ دو ہزار ٹنکہ یومیہ تھا اور درویشوں اور مسکینوں
کو داد و دہش اس خرچ کے علاوہ تھی۔ سلطان کا خیال تھا کہ یہ تمام اخراجات اس کے
اُمراء کے نذرانے کی رقم سے پورے ہوتے ہیں اسلئے قطب الدین نے نہ صرف
اُمراء کی آمد و رفت روک دی بلکہ برسرِ دربار ان کو بُرے الفاظ میں یاد کیا۔ اس کے
باوجود چونکہ لنگر خانے کے اخراجات جوں کے توں جاری رہے اس لئے اس
کو حضرت محبوب الٰہیؒ سے اور بھی زیادہ پرخاش ہوگئی اور اس نے محبوب الٰہیؒ
اپنے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ آپ نے شاہی حکم کا یہ جواب دیا کہ "قاعدہ
بزرگانِ ما نبود کہ بدیوال روند و مصاحب پادشاہاں شوند، دریں باب معذور دارید
و بحال خود بگذارید" لیکن مغرور بادشاہ نے اس عذر کو قبول نہیں کیا اور حکم دیا کہ ہفتہ
میں دوبار دربار آیا کریں۔ اس پر محبوب الٰہیؒ نے بادشاہ کے پیر شیخ ضیاء الدین رومی
کے پاس پیام کہلا بھیجا کہ وہ اپنے مرید کو سمجھائیں کہ درویشوں کو رنج پہونچانا کسی
مذہب میں روا نہیں مگر اس پیام کے پہونچنے سے پہلے شیخ رومیؒ کا انتقال ہوگیا۔
ان کے تیجے کے فاتحہ کے سلسلہ میں جب سب اکابر، امراء و بادشاہ وغیرہ جمع ہوئے
تو بادشاہ نے دیکھا کہ لوگ کس عزت و عظمت کے ساتھ حضرت محبوب الٰہیؒ کو سر
آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں اس سے بادشاہ کا حسد اور بھی بڑھ گیا اور اس نے حضرت
محبوب الٰہیؒ کے سلام کا جواب تک نہ دیا اور مجلس ختم ہونے کے بعد ایک محضر کے ذریعہ
ہر قمری مہینے کی پہلی تاریخ کو حضرت نظام الدین اولیاؒ کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم

جاری کیا لیکن مشیت ایزدی کو کچھ اور منظور تھا اس لئے چاند کی پہلی تاریخ کبھی نہ آئی۔ کیونکہ جس روز قطب الدین دربار میں حضرت شیخ موصوفؒ کی آمد کا منتظر تھا اُسی روز محل کے اندر شورش ہوئی اور وہ اپنے چہیتے غلام خسرو خاں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

انقلاب سلطنت کے سامان

ظفر خاں کو قتل کر دینے کے بعد بادشاہ نے خسرو خاں کے بھائی حسام الدین کو گجرات کا صوبیدار مقرر کیا اُس نے اپنے گرد اپنے ہم قوم برادری ہندوؤں کو اکٹھا کر کے بڑے بڑے عہدے دئے اور اُن کی مدد سے خود مختار ہونے کی تدبیریں کرنے لگا۔ اور غالباً مرتد بھی ہو گیا تھا اس پر گجرات کے مسلمان اُمرائے سلطانی نے بروقت متفق ہو کر اُس کو گرفتار کر لیا اور بادشا کے پاس دہلی بھیج دیا۔ ان امرا کو توقع تھی کہ سلطان اُن کی وفاداری سے خوش ہوگا لیکن اُس نے خوش ہونے کے بجائے اُلٹا انھیں ذلیل کیا اور حسام الدین کو اپنی مصاحبت میں داخل کر کے اس کی عزت بڑھائی اس سے اُمرا کے دلوں کے اندر خوف وہراس پیدا ہو گیا اور وہ بادشاہ سے نفرت کرنے لگے۔

گجرات کے انتظام کے لئے سلطان نے وحید الدین قریشی کو بھیجا جو "الحق او وزراء را عجوبۂ ملوک بود و باری تعالیٰ او را جامع اوصاف بزرگی آفریدہ بود"[۱] اُس نے گجرات پہونچ کر امن وامان کو از سر نو بحال کیا لیکن دیوگیری کے اندر بغاوت کے شعلے بلند ہونے لگے اور ملک یک لکھی نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ لیکن شاہی فوجوں نے جلد ہی باغیوں پر قابو پا لیا اور یک لکھی اور اُس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا جہاں سلطان نے یک لکھی کے ساتھیوں کو قتل کرا دیا مگر اس کے ناک اور کان کاٹنے کے بعد معاف کر دیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد سامانہ کا گورنر بنا دیا۔

۱؎ برنی صفحہ ۳۹۷

سیاسی اعتبار سے حسام الدین کی عزت افزائی اور ملک یک لکھی کو دوبارہ گورنر بنانا یہ دونوں کام غلط تھے لیکن ان دونوں سے زیادہ غلط بادشاہ کا وہ طرز عمل تھا جو اُس نے خسرو خاں کے ساتھ برتا۔ اُس نے جب خسرو خاں کو مدورا کی مہم پر روانہ کیا تو اُس نے معبر پہونچکر وہاں کے ملک التجار خواجہ تقی کو لوٹ کر دولت حاصل کی۔ خواجہ تقی معبر میں صرف اس لئے ٹھہرا رہا کہ ملک میں جو فوج داخل ہو رہی ہے وہ مسلمان ہے اسلئے اس کی عزت و آبرو اور جان و مال محفوظ رہے گا۔ لیکن خسرو خاں نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی اور خود مختار بننے کے ارادے سے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح مدورا کی مہم سے واپس ہو کر میسور[1] و تلنگانہ[2] کے راجاؤں کو بلا کسی جرم و خطا کے محض اپنی قوت بڑھانے کی غرض سے لوٹ کھسوٹ لیا بعدہٗ اس بات کے درپے ہوا کہ شاہی سرداروں کو جو اُس کے ہمراہ تھے قتل کر کے علم استقلال بلند کرے ان حالات کا علم چندیری کے عامل ملک تمور اور ملک گل افغان اور ملک تلبغہ حاکم کڑا کو ہوا جو خسرو خاں کو کمک دینے کے لئے مامور کئے گئے تھے انھوں نے خسرو خاں کے فاسد ارادوں کی بادشاہ کو خبر کی اور خسرو کو معبر اور ملیبار کی جانب سے دیوگری واپس آنے پر مجبور کر دیا جہاں ملک یک لکھی کے بعد عین الملک ملتانی وزارت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ بادشاہ نے خسرو خاں کو دیوگری سے دہلی بلوایا۔ امراء نے اُسے بسرعت تمام ۸ دن کے اندر دیوگری سے دہلی پہونچا دیا۔ پیچھے ملک تمور اور ملک تلبغہ بھی دہلی پہونچے خسرو خاں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر امراء کی شکایتیں کیں اور کہا کہ انھوں نے محض حسد اور رشک کی وجہ سے اُسے بغاوت کے جرم میں متہم کیا ہے چونکہ بادشاہ

---

[1] میسور کے راجہ سے ۲۰ ہاتھی اور بہت سا خزانہ وصول کیا اسی طرح ۔

[2] تلنگانہ کے راجہ سے ۱۰۱ ہاتھی زبردستی وصول کئے ۔

اُس کی محبت میں دیوانہ ہو رہا تھا اور مستی و شہوت نے اس کو اندھا کر رکھا تھا اس لئے اُس کی پُر فریب باتوں میں آ گیا اور اپنے نمک حلال سرداروں کو جنھوں نے فتنہ کو سر اُٹھانے سے پہلے ہی دبا دیا تھا یہ صلہ دیا کہ ملک تیمور کو چندیری کی حکومت سے معزول کر کے چندیری کو خسرو خاں کی جاگیر میں دیدیا اور ملک تلبغہ کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہی خواہ اُمراء نے بھی بادشاہ کو اُمور سلطنت سے آگاہ کرنا چھوڑ دیا۔ اور اپنی حفاظت کے لئے خسرو خاں اور اُس کے بھائی کی رضا جوئی کو مقدم سمجھنے لگے۔

خسرو خاں کو اب احساس ہوا کہ دکن یا گجرات سے بڑھ کر دہلی میں رہ کر سلطنتِ اسلامیہ کے برباد کر دینے کا موقع آسانی سے میسّر آ سکتا ہے۔ چنانچہ ملک کافور کے محل میں جو اب خسرو خاں کی ملکیت تھا رات کے وقت لوگ جمع ہوتے اور مشورے کرتے تھے۔ خسرو خاں نے جو بحیثیت وزیر اعظم کام کر رہا تھا بڑی احتیاط اور چالاکی کے ساتھ ان تمام لوگوں کو جو اُس کے حصول مقصد میں سدِ راہ نظر آتے تھے ایک ایک کر کے دہلی سے جُدا کر دیا۔ کسی کو قید اور کسی کو قتل کرایا اور کسی کو دور دراز کے صوبوں میں بھیجدیا۔ پُرانے زمانہ کے اُن اُمیروں کو جن کو کسی نہ کسی وجہ سے بادشاہ سے عناد تھا دہلی میں بلا کر عہدے سپرد کئے۔ جن پر سلطان نے ظلم کئے تھے اُن پر انعام و احسان کی بارشیں کر کے اپنا ہمدرد اور بعض کو مثلاً ملک قیمار، ملک بہاء الدین دبیر اور یوسف صوفی کو اپنا رازدار بھی بنا لیا۔ اب اُسے صرف اپنی فوجی قوت کو مضبوط کرنا تھا۔ وہ دکن میں خود مختار ہونے کی کوشش کے وقت یہ اندازہ کر چکا تھا کہ جب تک اپنے ذاتی سپاہی نہ ہوں شاہی سپاہیوں پر اعتماد کرنا بیکار ہے۔ اس لئے اُس نے بادشاہ سے یہ کہہ کر اپنے ہم قوم گجراتی برواریوں کو فوج میں بھرتی کیا کہ "میں اپنے ہم قوم لشکر کی مدد سے ہر مہم کو اچھی طرح انجام دے سکوں گا چونکہ دوسرے اُمراء مجھ سے حسد رکھتے ہیں اسلئے اُن کی امدادی فوج پر میں بھروسہ نہیں کر سکتا"۔ بادشاہ نے اجازت دیدی۔ اس طرح خسرو خاں نے اپنے

چچا رندھول اور جاہر دیو کو گجرات بھیج کر بیس ہزار گجراتیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا اور اسی قدر نواح دہلی کے ہندوؤں کو اپنی جمعیت میں شامل کر کے چالیس ہزار کا لشکر نہایت خاموشی کے ساتھ مرتب کر لیا۔

بادشاہ کا قتل

بادشاہ کی پے در پے حماقتوں کی وجہ سے اُمراء بددل ہو گئے اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ کر خود الگ ہو گئے۔ ان اُمراء میں صرف قاضی ضیاء الدین ایسا شخص تھا جو سلطان کا سچا ہمدرد تھا اور اس سے آزادانہ گفتگو کر سکتا تھا۔ کوشک سلطانی یعنی قصر ہزار ستون کے دروازوں کی حفاظت بھی اسی کے سپرد تھی۔ اس نے اس موقع پر جبکہ بادشاہ سرساوہ سے شکار[1] کھیل کر واپس آیا ہوا تھا شہر کی عام افواہوں سے متاثر ہو کر سلطان کی خدمت میں عرض کیا کہ برواری (ہندو) فوج کی کثرت خطرہ سے خالی نہیں ہے میں نے سُنا ہے کہ ہندو روزانہ خسرو خاں کے مکان میں جمع ہو کر مشورے کرتے ہیں کہ بادشاہ کو قتل کر کے خسرو خاں کو بادشاہ بنایا جائے آپ کم از کم اتنا تو کریں کہ فوج کے بعض گجراتی ہندوؤں کو بلا کر ان سے اس معاملہ کی نسبت استفسار فرمائیں ممکن ہے کہ وہ رعب سلطانی سے پوست کندہ حالات بیان کر دیں اور اگر کوئی فتنہ برپا ہونے والا ہے تو آپ اس سے اپنی حفاظت کر سکیں۔ اگر خسرو خاں بے گناہ ہو تو پھر سلطان کو موقع حاصل ہے کہ از راہ قدردانی اس کی عزت و مرتبہ میں اضافہ فرمائیں۔ ابھی قاضی خاں اپنی بات ختم نہیں کر پایا تھا کہ خسرو خاں بھی حاضر ہو گیا۔ سلطان نے

---

[1] ۔ خسرو خاں کے ساتھیوں کا ارادہ تھا کہ بادشاہ کو شکار کے دوران ہی میں ختم کر دیا جائے۔ لیکن اس کے مسلمان رفقا نے منع کیا اور کہا کہ یہ کام ہم کو قصر سلطانی میں انجام دینا چاہئیے تاکہ دہلی پر قبضہ رہے اگر یہاں قتل کیا گیا تو ممکن ہے کہ دہلی پر قبضہ کرنا دشوار ہو جائے اور مسلمان سردار ہمارے تخت سلطانی تک پہونچنے سے پہلے ہی مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوں۔

اسلئے سلطان کو کچھ شک پیدا ہوا اور وہ اُٹھ کر محل سرا کی طرف بھاگنے لگا خسرو خاں نے یہ سمجھا کہ اگر سلطان محلسرا کے اندر داخل ہو گیا تو پھر اُس پر قابو پانا مشکل ہو جائیگا چنانچہ اُس نے پیچھے سے بھاگ کر سلطان کو پکڑ لیا۔ بادشاہ نے اس کو زمین پر ٹپک دیا اور اُس سے اپنی زلفیں چھڑا کر بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن خسرو خاں نے بال نہیں چھوڑے۔ اسی حالت میں جاہر دیو اور دوسرے قاتل پہونچ گئے۔ جاہر دیو نے خنجر بھونک کر بادشاہ کو ہلاک کر دیا پھر اس کا دھڑ سر سے جدا کر کے اوپر سے صحن میں پھینک دیا تاکہ اُس کے سب ساتھی دیکھ لیں۔

بادشاہ کو قتل کرنے کے بعد رندھول، حسام الدین مرتد، جاہریا بردار اور دوسرے لوگ محلسرائے سلطانی میں داخل ہوئے اور وہاں سلطان علاء الدین کی بیوی اور دوسری بیگناہ عورتوں کو قتل کر کے فرید خاں، منگو خاں اور عمر خاں پسران سلطان علاء الدین کو قتل[1] کیا اور خاندان علائی کے کسی متنفس کو زندہ نہ چھوڑا اور پھر اسی وقت جبکہ آدھی رات ہو چکی تھی اُس نے ملک عین الملک ملتانی، ملک وحید الدین قریشی، ملک فخر الدین جونا، ملک بہاء الدین دبیر، پسرانِ ملک قرابیگ نیز دیگر اُمراء و اکابر کو بلا بھیجا۔ یہ سب حقیقتِ حال سے ناواقف تھے جب یہ سب اُمراء جمع ہو گئے تو ان سب کو گرفتار و نظر بند کر لیا صبح ہونے پر خسرو خاں نے تاج شاہی سر پر رکھ کر تخت سلطنت پر جلوس کیا اور سلطان ناصر الدین اپنا خطاب رکھا۔ سلطان قطب الدین کا قتل جمادی الثانی ۷۲۰ھ کی عین چاندرات کو واقع ہوا اور

---

[1] برنی کے بخلاف حضرت امیر خسروؒ نے تغلق نامہ میں علاء الدین کے پانچ لڑکوں کے قتل کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ ان لڑکوں کے نام فرید خاں، بوبکر خاں، علی خاں، بہاء الدین خاں اور عثمان خاں ہیں منگو خاں کا کوئی ذکر نہیں ممکن ہے کہ منگو خاں کا دوسرا نام بوبکر خاں ہو۔

سہ زبعدِ آں سریر آراے مرحوم ۔۔۔ برادر پنج دیگر ماند مظلوم

دوسری جگہ پر دو مرتبہ لڑکوں کے نام گنائے ہیں (ملاحظہ ہو تغلق نامہ قلمی در کتب خانہ حبیب گنج)

خسرو خاں کی تخت نشینی یکم جمادی الثانی سنہ ۷۲۰ھ مطابق ۹ جولائی سنہ ۱۳۲۰ء بروز چہارشنبہ عمل میں آئی۔

(۵) سلطان ناصر الدین

سلطان ناصر الدین کی مدت حکومت صرف دو ماہ ہے[۱]۔ اس قلیل عرصہ کے واقعات کو تحریر کرتے ہوئے ہمعصر مورخ برنی نے انتہائی غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے کیونکہ واقعات اتنے افسوسناک

---

[۱]۔ مولانا سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے تغلق نامہ کے نایاب نسخہ کو مجلس مخطوطاتِ فارسیہ حیدر آباد کی طرف سے شائع کرکے نہ صرف دنیائے ادب پر احسان کیا ہے بلکہ تاریخی لحاظ سے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ تغلق نامہ میں تین ہزار اشعار ہیں۔ اس مثنوی کا بڑا حصہ سلطان قطب الدین کے قتل، خاندانِ علائی کی تباہی، خسرو خاں کی چند روزہ بادشاہی اور پایۂ تخت دہلی کے مسلمانوں پر مصائب و شدائد اور پھر تغلق کی سرتابی، بعض امراء سے خط و کتابت، دہلی پر چڑھائی اور دو بڑی لڑائیوں کے بعد فتحیابی، خسرو خاں اور اس کے بھائی کی گرفتاری اور قتل کئے جانے کے واقعات پر مشتمل ہے۔ مذکورہ بالا واقعات کو بقید سنین تفصیل کے ساتھ جس طرح امیر خسرو نے تحریر کیا ہے کسی دوسرے مورخ نے اس طرح وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا۔ افریقی سیاح ابن بطوطہ کا بیان بے ربط اور مجمل ہے۔ برنی نے بھی جس سے تمام مورخوں نے بالعموم استفادہ کیا ہے ان تمام واقعات کو وضاحت کے ساتھ تحریر نہیں کیا۔ اس کی تاریخ میں ان واقعات کا کوئی صحیح مہینہ بلکہ سن تک درج نہیں ہے خسرو کی بادشاہی کا زمانہ اس نے ایک جگہ "چار ماہ" اور دوسری جگہ "سہ چار ماہ" لکھدیا ہے۔ سجان رائے نے چار ماہ چند روز تاریخ مبارک شاہی میں خسرو کی تخت نشینی کی تاریخ ۵ ربیع الاول سنہ ۷۲۰ھ لکھی ہے جس کا اعادہ فرشتہ نے کیا ہے، بدایونی نے زیادہ صحت سے کام لیکر سنہ ۷۲۰ھ متعین کی ہے لیکن تعجب ہے کہ لائق مورخ ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب نے تغلق نامہ کے حوالہ سے اپنے تحقیقی مقالہ "قرونہ ترک"، میں خسرو خاں کی مدت بادشاہی ۴ مہینے اور آٹھ دن مقرر کی ہے

(باقی مضمون بر صفحہ ۴۲۲)

ہیں جنھیں تحریر کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے۔ خسرو خاں نے تخت نشین ہو کر قاضی خاں کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا لیکن اس کے بیوی و بچے ہاتھ نہیں آئے وہ سب رات ہی رات میں دہلی سے نکل کر فرار ہو گئے تھے۔ اس وقت دہلی کے اندر تین قسم کے گروہ تھے۔ ایک تو وہ جو شدت حرص و طمع اور ضعف ایمان کی وجہ سے خسرو کا ہمنوا اور طرفدار تھا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۲۱ = (ملاحظہ ہو قرونہ ترک صث) ممکن ہے کتابت کی غلطی ہو کیونکہ تغلق نامہ کی رُو سے خسرو کی مدتِ حکومت صرف ۲ ماہ ہے۔ امیر خسروؒ نے نہایت صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ قطب الدین کا قتل جمادی الثانی ۷۲۰ھ کی عین چاند رات کو واقع ہوا:-

چوں تاریخ عرب شد ہفصد و بست   ثبات قطب کم شد جانب زیست

جمادی دومیں راست پدیدار   ہلال تیرہ و تاریک دیدار

مہ باریک بود از حالت تلخ   بناخن کردہ خود را پیش ازاں سلخ

شد آں مہ بر ہمہ گیہاں مبارک   مگر بر طالع سلطاں مبارک

اور ٹھیک دو مہینے بعد غازی ملک تغلق غاصب خسرو خاں کو شکست دیکر بادشاہ بن گیا یہ حساب سے ۷۲۰ھ کے ماہ شعبان کی پہلی تاریخ تھی:-

چو صبح غرۂ شعبان فرخ   نمود از تخت گاہ آسماں رخ

غازی ملک تغلق کی تخت نشینی شنبہ کو عمل میں آئی اس کی خسرو خاں سے آخری لڑائی ایک دن قبل [illegible]

ہر شب بود خسرو لشکر آرائے   [illegible] ران و مرکشا اش نیز بر پائے

چو صبح جمعہ تیغ تیز برداشت   زمانہ غلغل خوں ریز برداشت

اس طرح خسرو خاں کا دورِ حکومت صرف ۲ مہینے کا ہے۔ یکم جمادی الثانی ۷۲۰ھ مطابق ۱۷ جولائی ۱۳۲۰ء بروز چہارشنبہ تخت پر بیٹھا اور رجب ۷۲۰ھ کی آخری تاریخ بروز جمعہ مطابق ۵ ستمبر ۱۳۲۰ء قتل کر دیا گیا۔ (ماخوذ از معارف دسمبر ۱۹۳۳ء) نوٹ:- تغلق نامہ کے اس نایاب نسخہ کو جو قلمی ہے راقم الحروف نے محترمی حبیب الرحمٰن خاں شروانی نواب صدر یار جنگ کے ذاتی کتب خانہ واقع حبیب گنج میں جا کر دیکھا ہے اور اس سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ ۲۷ مئی ۱۹۴۸ء۔

[illegible]

دوسرا وہ جو منافع بیع وشرا کی وجہ سے بظاہر برواریوں کا طرفدار لیکن بباطن غلبۂ کفر و ضعفِ اسلام کی وجہ سے مغموم و آزردہ تھا تیسرا گروہ اگرچہ قلیل ترین تھا لیکن دن رات برواریوں کی بیخ کنی کے لئے کوشاں تھا اور چاہتا تھا کہ جلد از جلد ان کا قلع قمع ہو جائے۔

خسرو خاں پہلے ہی تمام اہتمام کر چکا تھا جو جو صوبیدار دور دراز کے صوبوں پر مامور تھے اُن میں سے اکثر کے اعزا و اقارب دہلی میں موجود تھے ان کی سب کی نگرانی اور دیکھ بھال کا بندوبست کیا تاکہ یہ لوگ دہلی سے فرار نہ ہو سکیں اور جن گورنروں کے اہل وعیال دہلی میں نہیں تھے اُن کے بیٹوں یا بھائیوں کو خسرو خاں نے پہلے ہی قطب الدین کے حکم سے بطور یرغمال دہلی میں بلوا لیا تھا اس لئے اس کو کسی فوری بغاوت کا اندیشہ نہ تھا پھر بھی اس کو غازی ملک تغلق حاکم دیپالپور کا از حد خیال تھا جو علاء الدین کے زمانہ ہی سے مغل افگنی کے سبب بڑی شہرت اور اثر رکھتا تھا اُس کا بیٹا جونا خاں (فخر الدین) اس حادثہ کے وقت دہلی میں موجود تھا اُس کی دلدہی کی خاطر تاکہ اس کا باپ مخالفت پر آمادہ نہ ہو سکے امیر آخور کا عہدہ عطا کیا۔ دوسرے مسلمان اُمراء میں عین الملک ملتانی کو عالم خاں کا خطاب دیکر امیر الامراء مقرر کیا۔ اسی طرح وحید الدین قریشی کو تاج الملک کا خطاب دیا۔ جو مسلمان اُمراء خسرو خاں کے پہلے سے ہمنوا و طرفدار تھے ان میں سے یوسف صوفی کو صوفیخاں، بہاء الدین دبیر کو اعظم الملک اور پسر قرۃ قیمار کو شائستہ خاں کا خطاب دیا۔ جاہریا (جاہر دیو) کو جو قاضی خاں اور قطب الدین کا قاتل تھا زر وجواہر سے تلوایا۔ رندھول کو رائے رایاں اور اپنے بھائی حسام الدین کو خانخاناں بنایا۔ اور قطب الدین کی حرم دیولدیوی کو اپنی بیوی بنا لیا۔

قصر ہزار ستون اور سلطانی محل سرائے میں ہندو ہی ہندو نظر آنے لگے جن پر بظاہر سلطان کا کوئی اثر نہیں تھا کیونکہ وہ اپنی من مانی کارروائیاں کرنے لگے[1]۔

---

[1]: — دہلی کی مسجدوں کو ہندوؤں نے مسلمانوں سے چھین لیا۔ اُن کی محرابوں میں بُت رکھے۔

(باقی مضمون صفحہ ۴۲۴ پر)

یہاں پر یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ مسلمانوں نے سو سال کے اندر ہی اندر برّاعظم ہندوستان کے پورے رقبہ پر قابض و متصرف ہو کر اپنی محکوم ہندو قوم کے افراد کو وزارت عظمیٰ اور سلطنت کی مدارالمہامی کا بلند ترین عہدہ عطا کر دیا لیکن اِس اعتماد و فیاضی کے بدلہ میں جو چیز پیش کی گئی اُس کو ہر انصاف پسند و شریف ہندو و مسلمان نفرت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ چنانچہ سجان رائے نے اپنی تاریخ میں ان برواریوں کی سفلہ مزاجی کا ذکر کرتے ہوئے یہ اشعار درج کئے ہیں[۱] ؎

کسے را کہ نبود شرف در نہاد	نباشد عجب گر بود بدنہاد
سر ناکساں را برافراشتن	وزایشاں اُمید بہی داشتن
سر رشتۂ خویش گم کردنست	بجیب اندروں مار پروردنست
دگر زندگانی توقع مدار	کہ در جیب و دامن دہی جائے مار

فخر الدین جونا خاں کچھ دنوں تک تو برواریوں کی ان بےتمیزیوں کو دیکھتا رہا اس کے بعد ایک دن گھوڑوں کی ڈاک بٹھا کر ظہر کے وقت اپنے چند غلاموں کو لیکر دیپالپور

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۲۳۔ اذانیں موقوف ہوگئیں اور قرآن شریف کے چبوترے بنا کر دربار میں ہندو اُن پر بیٹھے۔ مسلمان عورتوں کو اپنے تصرف میں لے آئے (برنی ص۴۱۱)۔ بہت ممکن ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ بھی ہو لیکن یاد رکھنے کے لائق یہ بات ہے کہ اہل دہلی کے لئے اس قسم کی وحشیانہ حرکات بالکل نئی نہ تھیں۔ وہ کیقباد اور قطب الدین کے زمانہ میں اخلاقی گراوٹ کے کرشمے دیکھ چکے تھے البتہ فرق اتنا ہے کہ اس وقت بدعنوانیاں اکیلا بادشاہ کرتا تھا اور لوگ اُس کی عالی خاندانی کا کچھ نہ کچھ رعب مانتے تھے لیکن اب خسرو خاں کی برادری کا ہر فرد فرعون بےسامان بن گیا جسکی جہالت و ناشائستگی اور رذالت و کم نسبی سب پر عیاں تھی۔

[۱] خلاصۃ التواریخ قلمی ص۲۶۱۔

[۲] صاحب مبارک شاہی نے نہ معلوم کس بناء پر یہ لکھ دیا کہ جونا خاں نے خسرو سے یہ کہہ کر اجازت لی۔

(باقی مضمون بر صفحہ ۴۲۵)

کی طرف روانہ ہوگیا۔ شام کو پتہ چلا کہ جونا خاں فرار ہوگیا ہے اس کے تعاقب میں خسرو خاں نے سوار دوڑائے لیکن وہ اس کی گرد کو بھی نہ پہونچ سکے۔ دہلی سے ۱۰۰ کوس آگے چل کر سرستی کے قلعہ میں اس کو اپنے باپ کے متعین کردہ دو سو سوار ملے جو قلعہ پر قابض تھے وہاں سے نہایت آرام کے ساتھ جونا خاں اپنے باپ کے پاس دیبالپور پہونچ گیا۔ باپ نے بیٹے کو صحیح و سالم پاکر سجدۂ شکر ادا کیا اس کے بعد ملتان، سامانہ، اچھ، سیوان اور جالور (واقعہ جودھپور) کے عاملوں کو لکھا کہ وہ اپنی امدادی فوجوں سے قطب الدین کے خونِ ناحق کا انتقام لینے میں مدد دیں۔ ملتان کے حاکم نے بزدلی کا اظہار کیا کہ ہم جیسے چھوٹے غیر مستطیع حکام میں یہ طاقت کہاں ہے کہ دہلی کے بادشاہ سے مقابلہ کرسکیں اس پر غازی ملک نے اچھ کے حاکم بہرام ایبہ کو لکھا کہ وہ ملتان کے حاکم کو معزول کرکے خود وہاں کا چارج لے لے چنانچہ بہرام ایبہ نے حاکم ملتان کو قتل کردیا اور وہاں کی فوجوں کو لیکر غازی ملک سے آکر مل گیا۔ سیوان (سندھ) اور جالور سے غالباً کوئی مدد نہیں مل سکی لہذا انھیں دونوں فوجوں کو لیکر غازی ملک اللہ کے بھروسہ پر دہلی کی طرف روانہ ہوگیا راستہ میں سامانہ کے حاکم ملک یک لکھی نے غازی ملک کا راستہ روکا لیکن شکست کھائی اور پھر اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ سرسا کے مقام پر خسرو خاں کا بھائی حسام الدین معروف بہ خان خاناں کے راستہ روکنے پڑا تھا اس کو بھی غازی ملک نے

بقیہ فٹ نوٹ ۴۲۵: کہ شاہی اصطبل کے گھوڑے سوئے ہوگئے ہیں انہیں باہر لاکر پھرا لیا جائے اور جب وہ گھوڑے پھرانے باہر گیا تو اسی موقع پر بہرام ایبہ کے [illegible] اپنے [illegible] دیبالپور کی طرف روانہ ہوگیا۔ برنی کا بیان صاف ہے جو اوپر نقل کیا گیا ہے۔ [illegible] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۴۱۹ … سیوستان کا حاکم محمد شاہ تھا اور ملتان کا [illegible]۔ ان تمام مقامات کے حکام کے علاوہ [illegible] نامہ عین الملک کو بھیجا گیا [illegible]

دگر نامہ سوئے عالم ملک نیستند … کہ عین الملک گفت … … …

… … یہ حروف پڑھنے میں نہیں آئے لفظ کرم خوردہ ہے (ملاحظہ ہو تغلق نامہ در کتب خانہ حبیب گنج)

مار کر بھگا دیا اب دہلی کا راستہ صاف تھا۔

غازی ملک دہلی کے قریب پہونچ کر اندرپرست کے خرابہ میں آکر مقیم ہو گیا خسرو خاں بڑے ساز و سامان کے ساتھ سیری سے نکل کر حوض علائی کے قریب خیمہ زن ہو گیا اس کے سامنے باغات تھے اور پشت پر سیری کا قلعہ تھا اپنی حفاظت کی غرض سے اس نے چاروں طرف خندقیں کھدوالی تھیں۔ اس نے فوج کا دل بڑھانے کے لئے تمام شاہی خزانے کو جو سلطان قطب الدین ایبک کے زمانہ سے اب تک جمع ہوتا چلا آیا تھا تقسیم کرا دیا اور خزانہ میں جھاڑو دلوادی اس نے یہ کہہ کر خزانہ تقسیم کیا کہ اگر ہماری فتح ہوئی تو تم اس روپیہ کو اپنی [illegible] تنخواہ سمجھو اور اگر ہم مارے گئے تو کم از کم روپیہ تو غازی ملک کو نہیں مل سکے گا۔ اس روپیہ سے زیادہ تر اسی کے ہم قوم مستفید ہوئے تھے ویسے تھوڑا سا روپیہ دہلی کے اکابر و مشائخ کو بھی بانٹا تھا تاکہ مسلمان اس کا لڑائی میں ساتھ دیں لیکن اس کی یہ تمام وقتی دلجوئیاں بددل مسلمان امرا کو خوش نہ کر سکیں چنانچہ عین الملک ملتانی لڑائی ہونے سے ایک رات قبل اپنی فوجیں لیکر اجین و مالوہ کی طرف چلا گیا۔ دوسرے دن بروز جمعہ میدان کارزار گرم ہوا اور غازی ملک کے [illegible] کار آزمودہ مسلمان سپاہیوں کے مقابلہ میں خسرو خاں کی لاتعداد ہندو و پرواری فوج کچھ بھی نہ کر سکی بدحواسی کے عالم میں جس کا جدھر کو منہ اٹھا بھاگ نکلا خسرو خاں نے بھی تلپت کا راستہ لیا اور شام کے وقت اپنے پیر [illegible] شادی کے حظیرہ میں آکر پناہ لی وہیں سے پکڑا ہوا آیا اور اذیت کے ساتھ [illegible] اسی جگہ پر قتل کیا گیا جہاں کہ قطب الدین کا خون ہوا تھا۔ پرواریوں کے گروہ ادھر ادھر سے پکڑ کر لائے گئے اور قتل کر دیے گئے۔

جمعہ کے دن غازی ملک نے اندرپرست کے خرابہ ہی میں قیام کیا دوسرے دن [illegible] شہر نے آکر قلعہ سیری کی چابیاں اس کے سپرد کر دیں اور وہ سب کے ساتھ وہاں سے چل کر پہلے قصر ہزار ستون میں بغرض تعزیت داخل ہوا محل اور محل کی مکینوں کی

بربادی وتباہی پر زار وقطار رویا اس کے بعد لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں تو صرف
سلطان قطب الدین کے خونِ ناحق کا انتقام لینے کے لئے آیا تھا۔ اس وقت یہاں پر
قطبی وعلائی تمام عمائدین واکابرین سلطنت جمع ہیں اگر شاہی افراد میں کوئی زندہ ہو تو
اُسے لایا جائے اور اس کو بادشاہ منتخب کرلیا جاوے۔ چونکہ خسرو خاں پہلے ہی شاہی خاندان
کو تخم سوخت کرچکا تھا اس لئے سب نے بالاتفاق غازی ملک ہی کو اپنا بادشاہ منتخب
کرلیا۔ اس طرح یکم شعبان ۷۲۰ھ بروز شنبہ مطابق ۶ ستمبر ۱۳۲۰ء کو غازی ملک غیاث الدین
تغلق شاہ کے لقب سے ہندوستان کا شہنشاہ ہوا۔

(ختم شد حصہ دوم)

اضافی نوٹ

(۱) صفحہ ۱۳ سطر ۸ = ملتان بلخ کے شہروں سے قریب ہے۔ یہ بیان صحت طلب ہے۔ عربی سیاح نے ملتان کا بیان کرتے ہوئے جس جغرافیائی ماحول کا نقشہ پیش کیا ہے وہ ملتان کے بجائے بامیان کے لئے زیادہ موزوں اور قرین قیاس ہے۔

(۲) صفحہ ۱۴۵ سطر ۱ = راجپوت:- اس کے لفظی معنی ہیں "حکومت کا بیٹا" جس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں:-
(۱) یعنی کنور یا شہزادہ (۲) یا وہ لوگ جن کی حکومت کے قبل ہوا وہ یورپ کے Knights کی طرح اپنے فرائض انجام دیتے ہوں۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت یہ لفظ چھتری قوم کے لئے غیر مستعمل تھا۔ اس کی بجائے رائے، رانا، راوت، ٹھاکر وغیرہ رائج تھے۔ لفظ راجپوت پوری (کشتری) جماعت کیلئے کب سے رائج ہوا تحقیق طلب ہے

(۳) صفحہ ۱۴۶ سطر ۱۵ = مغول یعنی تاتاری: مغول کو تاتاری سمجھنا غلطی ہے کیونکہ دونوں کی نسل، وطن، اور قومیت جداگانہ ہے۔ ہندوستان میں ترک و مغل تو ضرور آئے لیکن تاتاریوں کی آمد کے بارے میں کوئی بڑی ثبوت نہیں ملتا۔

(۴) صفحہ ۱۹۲ سطر ۳ = غوری خاندان:- غوریوں کے نکاس کے بارے میں بیہقی کی روایت صاحب طبقات ناصری سے مختلف ہے۔ تاریخی حیثیت کا تعین مشکل ہے۔

(۵) صفحہ ۲۰۴ سطر ۱۲ = بہار کی فتح:- کیا بہار کی تسخیر ۱۱۹۳ء میں عمل میں آئی؟ یہ سنہ مشتبہ ہے قرین قیاس سنہ ۱۱۹۵ ہے کیونکہ قنوج کی ریاست پر قبضہ کرنے سے پہلے مسلمانوں کا بہار کی طرف بڑھنا تدبیر کے خلاف تھا۔ قنوج ۱۱۹۴ء میں فتح ہوا۔

(۶) صفحہ ۲۰۷ سطر ۹ = اندخود:- اندخود کے مقام پر خوارزمیوں سے نبرد آزمائی ۱۲۰۳ء کے بجائے ۱۲۰۵ء میں سمجھنا چاہئیے۔

(۷) صفحہ ۲۲۸ سطر ۱ = نور الدین ترک:- رضیہ کے عہد حکومت میں نور الدین ترک نے دہلی میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں وہ ناکام رہا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا خیال نور الدین ترک کے بارے میں نہایت عمدہ ہے۔

(۸) صفحہ ۲۳۳ سطر ۹ = بعض کی رائے ہے کہ "بی بی ہزیرہ" کی شادی حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر سے اور ان سے چھ لڑکوں اور تین لڑکیوں کا ہونا سیر الاولیاء اور فوائد الفواد کو دیکھتے ہوئے افسانوی حیثیت رکھتا ہے۔

ضمیمہ ۱

حیاتِ انسانی کے اخلاقی نظریے

دنیا میں انسان کی زندگی کے لئے جو نظام بھی بنایا جائے گا اس کی ابتدا لامحالہ مابعد الطبیعی یا الٰہیاتی مسائل سے ہوگی۔ زندگی کی کوئی اسکیم بن نہیں سکتی جب تک کہ انسان کے متعلق اور اس کائنات کے متعلق جس میں انسان رہتا ہے ایک واضح اور متعین تصور نہ قائم کر لیا جائے۔ یہ سوال کہ انسان کا برتاؤ یہاں کیا ہونا چاہیئے اور کس طرح اسے اس دنیا میں کام کرنا چاہیئے، در اصل اس سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے کہ انسان کیا ہے؟ اور اس کائنات کا نظام کس ڈھنگ کا ہے جس سے انسان کی زندگی کے ڈھنگ کو ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ اس سوال کا جو حل بھی تجویز کیا جائے گا اس کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا اور پھر اسی نظریۂ اخلاق کی نوعیت کے مطابق انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی، پھر اسی سانچے کے اندر انفرادی سیرت و کردار اور اجتماعی تعلقات اور معاملات کے قوانین اپنی تفصیلی صورت اختیار کریں گے اور آخر کار تمدن کی پوری عمارت انہی بنیادوں پر تعمیر ہوگی۔

دنیا میں اس وقت انسانی زندگی کے لئے جتنے مذہب و مسلک بنے ہیں ان سب کو بہرحال اپنا ایک بنیادی فلسفہ اور ایک اساسی نظریۂ اخلاق مرتب کرنا پڑا ہے۔ یہی وہ فلسفہ اور یہی وہ اخلاقی نظریہ ہے جو ان کو ایک دوسرے کے مسلک سے ممتاز کرتا ہے...... جزئیات و فروع سے قطع نظر اصولی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو انسان اور کائنات کے متعلق صرف چار ہی مابعد الطبیعی نظریے قائم ہو سکتے ہیں، اور دنیا میں جتنے دستورِ زندگی پائے جاتے ہیں، انہوں نے انہیں چاروں میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ہے۔

(۱) ملحدانہ نظریۂ حیات

ایک نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود و ظہور ہے جس کے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت اور کوئی مقصد کارفرما نہیں ہے۔ یونہی بن گیا ہے یونہی چل رہا ہے۔ اور یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا کوئی خدا نہیں ہے اور اگر ہے تو اس کے ہونے یا نہ ہونے کا انسان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ...... ہمیں اس سے بحث نہیں کہ انسان کو کس نے پیدا کیا اور کس لئے پیدا کیا ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر (اور دیگر اشیاء کی طرح) پایا جاتا ہے۔ کچھ خواہش رکھتا ہے جنھیں پورا کرنے کے لئے اس کی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے۔ کچھ قوتیں اور کچھ آلات رکھتا ہے جو اُن خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتی ہیں ..... لہٰذا اس کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طبع حیوانی کے مطالبات پورے کرے اور اس کی انسانی استعدادوں کا مصرف اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان مطالبات کو پورا کرنے کے لئے بہتر سے بہتر ذرائع فراہم کرے۔ انسان سے بڑھ کر اور کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود نہیں ہے جہاں سے اس کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہے۔ لہٰذا اس کو اپنے گرد و پیش کے آثار و احوال سے اور اپنی تاریخ کے تجربات سے خود ہی ایک قانونِ عمل اخذ کرنا چاہیئے۔ بظاہر کوئی ایسی حکومت نظر نہیں آتی جس کے سامنے انسان جوابدہ ہو اسلئے انسان بجائے خود ایک غیر ذمہ دار ہستی ہے۔ اور اگر یہ جوابدہ ہے بھی تو آپ اپنے سامنے ہی ہے یا اس اقتدار کے سامنے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مستولی ہو جائے۔ اعمال کے نتائج جو کچھ بھی ہیں اسی دنیوی زندگی کی حد تک ہیں اس کے ماسوا کوئی زندگی نہیں ہے لہٰذا [illegible] قابل اخذ اور قابل ترک ہونے کا فیصلہ [illegible] نتائج کے لحاظ سے کیا جانا چاہیئے جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

آئین میں زور کا نام حق اور بے زوری کا نام باطل ہوتا ہے جہاں کوئی مادّی رکاوٹ حائل
نہیں ہوتی وہاں کوئی چیز ان کو ظلم سے نہیں روک سکتی۔ یہ ظلم ان کے خاص وطن میں
یہ شکل اختیار کرتا ہے کہ طاقتور طبقے اپنی ہی قوم کے کمزور طبقوں کو کھاتے اور دباتے ہیں
اور اپنے ملک کے باہر اس کا ظہور قوم پرستی، امپیریلزم اور ملک گیری و اقوام کشی کی صورت
میں ہوتا ہے۔

(۲) مشرکانہ نظریۂ حیات

دوسرا مابعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا نظام اتفاقی تو
نہیں ہے اور نہ بے خداوند ہے [illegible] مگر اس کا ایک خداوند نہیں
بلکہ بہت سے خداوند ہیں یہ خیال چونکہ کسی علمی ثبوت پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض خیال آرائی
پر اس کی بنا ہے اسلئے موہوم محسوس اور معقول اشیاء کی طرف خداوندی و الٰہیت
کو منسوب کرنے والوں کے درمیان کبھی اتفاق نہیں [illegible] کبھی ہوا ہے۔ اندھیرے
میں بھٹکنے والوں کا ہاتھ جس چیز پر بھی پڑ گیا وہ خدا بنا لی گئی۔ اور خداؤں کی فہرست ہمیشہ
گھٹتی بڑھتی رہی۔ فرشتے، جن، ارواح، ستارے، [illegible] انسان، درخت، پہاڑ،
جانور، دریا، زمین، آگ، بادل، ہوا اور معانی مجردہ مثلاً [illegible] حسن، بیماری، جنگ،
مچھلی، شکتی وغیرہ اور خیالی مرکبات مثلاً شیر انسان، ماہی انسان، پرند انسان، چہار سر
ہزار دستہ، خرطوم بینی وغیرہ ان لوگوں کے معبود [illegible] ہیں پھر ان
کے گرد اوہام و خرافات کا ایک عجیب طلسم [illegible] ہر جاہل قوم
کی قوت واہمہ نے اپنی شادابی و نادرہ کاری [illegible] ہیں کہ
دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جن قوموں [illegible] کا تصور نمایاں
پایا گیا ہے۔ وہاں تو خدائی کا انتظام کچھ اس [illegible] اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے
اور دوسرے خدا اُس کے وزیر، درباری، مصاحب [illegible] اور اہلکار ہیں مگر
انسان بادشاہ سلامت تک راہ نہیں پا سکتا۔ [illegible] اس کے معاملات ماتحت

خداؤں ہی سے وابستہ رہتے ہیں۔ اور جن قوموں میں خداوندِ اعلیٰ کا تصوّر بہت دھندلا یا قریباً مفقود ہے۔ وہاں ساری خدائی ارباب متفرقین ہی میں تقسیم ہوکر رہ گئی ہے۔

اس قسم کے نظریۂ زندگی کو ہم "مشرکانہ نظریۂ حیات" کہہ سکتے ہیں۔ جاہلیت کی یہ دوسری قسم ہے جس میں انسان قدیم ترین زمانہ سے آج تک مبتلا ہوتا رہا ہے۔ یہ جاہلیت نمبر ا کے ساتھ ہمیشہ تعاون کرتی ہے۔ قدیم زمانہ میں بابل، مصر، ہندوستان، ایران، یونان، روم وغیرہ ممالک کے تمدن میں یہ دونوں جاہلیتیں ہم آغوش تھیں اور موجودہ زمانہ میں جاپان کے تمدّن کا یہی حال ہے۔ اس موافقت کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے چند کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:۔

(۱) مشرکانہ جاہلیت میں آدمی کا تعلق اپنے معبود کے ساتھ اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو اپنے خیال میں نافع وضار سمجھ کر مراسمِ عبودیت ادا کرتا ہے باقی رہا یہ امر کہ اس کو وہاں سے کسی قسم کی اخلاقی ہدایت یا زندگی کا قانون وضابطہ ملے تو اُس کا کوئی امکان ہی نہیں کیونکہ وہاں درحقیقت کوئی اصلی خدا ہو تو ہدایت وقانون بھیجے۔ ایسی صورت میں مشرک انسان خود ہی ایک اخلاقی نظریہ بناتا ہے اور خود ہی اس نظریہ کی بنیاد پر ایک شریعت تصنیف کرتا ہے۔ اس طرح وہ ہی پہلے قسم کی جاہلیت برسرِ کار آجاتی ہے۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک جگہ جاہلیت کے ساتھ دیوتاؤں کے لئے عبادت اور عبادت گاہوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ دوسری جگہ نہیں ورنہ اخلاق واعمال جیسے یہاں ہوتے ہیں ویسے ہی وہاں بھی ہوتے ہیں۔ بت پرست یونان وروم کے اخلاقی مزاج اور موجودہ یورپ کے اخلاقی مزاج میں جو مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس کا یہی سبب ہے۔

(۲) ثانیاً علوم وفنون (فلسفہ وادب اور سیاسیات معاشیات وغیرہ) کے لئے مشرکانہ نظریہ کوئی الگ مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ بلکہ نظریہ نمبر ا کی ہمنوائی کرتا ہے اور اپنی سوسائٹی کا دماغی نشو ونما اسی کے طرز پر کرتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مشرکین کے افکار میں

وہم وخیال کا عنصر غالب ہوا کرتا ہے۔ جبکہ ملاحدہ ذرا اعلیٰ قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس لئے نِرے خیالی فلسفوں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ البتہ جب وہ خدا کے بغیر کائنات کے معمہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو ان کی اِستدلالی کھینچ تان بھی اتنی ہی غیر معقول ہوتی ہے جتنی مشرکین کی متھالوجی۔

(۳) ثالثاً مُشرک سوسائٹی ان تمام تمدنی طریقوں کو قبول کرنے کے لئے پوری طرح مستعد ہوتی ہے۔ جن کو ملحد سوسائٹی اختیار کرتی ہے اگرچہ سوسائٹی کی ترتیب و تعمیر میں شرک اور الحاد دونوں کے ڈھنگ ذرا ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ شرک کی مملکت میں بادشاہوں کو خدائی کا مقام دیا جاتا ہے۔ روحانی پیشواؤں اور مذہبی عہدہ داروں کا ایک طبقہ مخصوص اختیارات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے شاہی خاندان اور مذہبی طبقہ مل کر ایک ملی بھگت قائم کرتے ہیں۔ خاندانوں پر خاندانوں کے اور نسلوں پر نسلوں کے تفوق کا ایک مستقل نظریہ وضع کیا جاتا ہے اور اس طرح جاہل عوام پر مذہب کا جال پھیلا کر ظالمانہ تسلّط قائم کر لیا جاتا ہے۔ بخلاف اِس کے الحاد پرست سوسائٹی میں یہ خرابیاں نسل پرستی۔ قوم پرستی قومی امپیریلزم۔ ڈکٹیٹرشپ۔ سرمایہ داری اور طبقاتی نزاع کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ لیکن جہاں تک روح اور جوہر کا تعلق ہے انسان پر انسان کی خدائی مسلّط کرنے، انسان کو انسان سے پھاڑنے اور انسانیت کو تقسیم کر کے ایک ہی نوع کے افراد کو ایک دوسرے کے لئے صیّاد بنانے میں دونوں ایک سطح پر ہیں۔

(۴) راہبانہ نظریۂ حیات تیسرا مابعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ یہ دُنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لئے ایک دار العذاب ہے۔ انسان کی رُوح اس کے جسم کے اندر ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لذّات وخواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس جسمانی تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں۔ اصل میں اس قیدخانہ کے طوق وسلاسل ہیں۔ انسان اِس دُنیا اور اُس کی چیزوں سے جتنا تعلق

رکھے گا اتنا ہی گندگی سے آلودہ ہوگا اور اسی قدر مزید عذاب کا مستحق بن جائے گا۔ نجات کی صورت اِس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ کہ اس زندگی کے بکھیڑوں سے قطع تعلق کیا جاوے۔ خواہشات ولذات کو مٹایا جاوے۔ اور اپنے اس دشمن یعنی نفس وجسم کو مجاہدات وریاضیات کے ذریعہ سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اس کا تسلّط قائم نہ ہو سکے۔ اس طرح روح ہلکی اور پاک صاف ہو جائیگی۔

یہ نظریہ جس کو ہم راہبانہ نظریۂ حیات کہہ سکتے ہیں بجائے خود غیر تمدنی (Anti Social) نظریہ ہے۔ مگر تمدن پر متعدد طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد پر ایک خاص قسم کا نظام فلسفہ بنتا ہے جس کی مختلف شکلیں ویدانتزم اشراقیت (Neo Platonism) یوگ، تصوف مسیحی رہبانیت اور بدھ ازم وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔

اِس فلسفہ کے ساتھ ایک ایسا نظامِ اخلاق وجود میں آتا ہے جو بہت کم ایجابی (Positive) اور بہت زیادہ بلکہ تمامتر سلبی (Negative) نوعیت کا ہے اِن دونوں کے جہاں جہاں (خواہ وہ اعمال وعقائد ہوں یا ادب وسیاست) اثرات پہنچتے ہیں وہاں افیون اور کوکین کا کام کرتے ہیں۔

ملحدانہ اور مشرکانہ جاہلیتوں کے ساتھ اِس تیسری قسم کی جاہلیت کا تعاون عموماً دو صورتوں سے ہوتا ہے۔

(۱) یہ راہبانہ جاہلیت انسانی جماعت کے نیک، اور پاکباز افراد کو دُنیا کے کاروبار سے ہٹا کر گوشۂ عزلت میں لیجاتی ہے اس طرح بدترین قسم کے شریر افراد کے لئے میدان صاف ہو جاتا ہے۔

(۲) اِس جاہلیت کے اثرات سے عوام میں غلط قسم کا صبر وتحمّل پیدا ہوتا ہے جو انہیں ظالموں کے ہاتھ میں کھلونا بنا دیتا ہے اسی وجہ سے ہمیشہ بادشاہ۔ امراء اور مذہبی اقتدار رکھنے والے طبقے اِس راہبانہ فلسفہ واخلاق کی اِشاعت میں خاص دلچسپی لیتے

رہتے ہیں اور یہ خوب آرام سے اُنکی سرپرستی میں پھیلتا رہا ہے۔

یہ تو اس جاہلیت کا معاملہ اپنی ہم جنس بہنوں کے ساتھ ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں میں جب یہ گھس آتی ہے تو کچھ اور ہی گل کھلاتی ہے۔ خدا کے دین پر اس کی پہلی ضرب یہ ہوتی ہے کہ دُنیا کو یہ دارالعمل، دارالامتحان اور مزرعۃ الآخرۃ کے بجائے دارالعذاب اور مایاکے جال کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ آدمی یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ وہ اس دُنیا میں خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہے۔ وہ دُنیا کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے بجائے اس سے کنارہ کشی کو بہتر سمجھتا ہے۔ عبادات و اوامر و نواہی کا یہ مفہوم کہ یہ حیاتِ دُنیا کی اصلاح اور فرائض خلافت کی انجام دہی کے لئے تیار کرنے والی چیزیں ہیں اس کے نزدیک یہ ہو جاتا ہے کہ یہ سب اعمال گناہِ زندگی کا کفارہ ہیں۔ بس انھیں کو انہماک کے ساتھ انجام دیتے رہنا چاہیئے تاکہ آخر میں نجات حاصل ہو۔ اس ذہنیت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان خلافتِ الٰہی کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی بجائے گوشہ نشینی و عزلت گزینی کو زیادہ بہتر سمجھنے لگتا ہے۔

(۴) اِسلامی نظریۂ حیات

چوتھا نظریہ یہ ہے کہ سارا عالم ہست و بود جو ہمارے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جزو ہم خود ہیں دراصل ایک بادشاہ کی سلطنت ہے اِسی نے اس کو بنایا ہے اور وہی اس کا مالک ہے۔ اور وہی اس کا واحد حاکم ہے .... انسان اس مملکت میں پیدائشی رعیت ہے یعنی رعیت ہونا یا نہ ہونا اسکی مرضی پر موقوف نہیں ہو بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہی اور رعیت کے سوا اور کچھ ہونا اسکے امکان میں نہیں ہو..... جسطرح مملکت کی تمام اجزا بادشاہ کے امر کی اطاعت کر رہے ہیں اسی طرح یہ بھی کرے۔ یہ خود اپنے لئے طریق زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کرنیکا حق نہیں رکھتا اسکا کام صرف یہ ہو کہ مالک الملک کی طرف سے جو ہدایت آئے اُسکی پیروی کرے اس ہدایت آنے کا ذریعہ وحی ہے اور جن انسانوں کے پاس وہ آتی ہے وہ نبی ہیں

مگر انسان کی آزمائش کے لئے مالک نے یہ لطیف طریقہ اختیار کیا ہے کہ آپ بھی چھپ گیا

اور اپنی سلطنت کا وہ پورا اندرونی نظام بھی چھپا دیا جس سے وہ تدبیرِ امر کرتا ہے عیان و شہود
میں کوئی ایسی نشانی نمایاں نہیں ہوتی کہ انسان پر فرمانروائے عالم کی حاکمیت اور اپنی محکومیت
کا حال غیر مشتبہ طور پر کھل جائے یہاں تک کہ ماننے بغیر چارہ نہ رہے۔ آدمی ایک حد کے اندر
اپنے آپ کو بالکل مختار پاتا ہے۔ بغاوت کرنا چاہے تو اس کی قدرت دیدی جاتی ہے۔ مالک
کے سوا دوسروں کی بندگی کرنا چاہے تو اس سے بھی زبردستی اس کو روکا نہیں جاتا۔ پھر بھی
ان دونوں صورتوں (بغاوت و بندگیٔ غیر) میں اُسے رزق برابر ملتا ہے۔ یہ سارا طرزِ کارروائی
صرف اسلئے ہے کہ خالق نے انسان کو عقل۔ تمیز۔ استدلال۔ ارادہ اور اختیار کی جو قوتیں
دی ہیں اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اس کو ایک طرح کے حاکمانہ تصرف کی جو قدرت بخشی ہے
اس میں وہ اس کی آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ اسی آزمائش کی تکمیل کے لئے حقیقت پر غیب کا
پردہ ڈالا گیا ہے تاکہ انسان کی عقل کا امتحان ہو۔ انتخاب کی آزادی بخشی گئی ہے تاکہ اس
امر کا امتحان ہو کہ آدمی حق کو جاننے کے بعد کسی مجبوری کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے
اس کی پیروی کرتا ہے یا خواہشات کی غلامی اختیار کر کے اس سے منہ موڑتا ہے۔ اسباب
زندگی کا سرمایہ اور وسائل کار دئے گئے ہیں اور عمر بھر کی مہلت دی گئی ہے کیونکہ جب تک
کسی کارکن کو سرمایہ۔ وسائل اور کام کا موقع نہ دیا جائے اس کی لیاقت و عدم لیاقت کا
امتحان نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیوی زندگی چونکہ آزمائش کی مہلت ہے۔ اسلئے یہاں نہ
حساب ہے نہ جزا نہ سزا۔ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ کسی عملِ نیک کا انعام نہیں بلکہ
امتحان کا سامان ہے اور جو تکالیف و مصائب و شدائد وغیرہ پیش آتے ہیں وہ
کسی عملِ بد کی سزا نہیں بلکہ زیادہ تر اس قانونِ طبعی کے تحت جس پر اس دنیا کا نظام
قائم کیا گیا ہے آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں۔ اعمال کے اصل حساب و
کتاب جانچ پڑتال اور فیصلہ کا وقت مہلت کی یہ زندگی ختم ہونے کے بعد ہے اور
اُسی کا نام آخرت ہے۔ لہٰذا دنیا میں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی

عمل کے صحیح یا غلط، نیک یا بد اور قابل اختیار یا قابلِ ترک ہونے کا معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں اور یہ علم کہ آخرت میں کس طریقہ اور کس عمل کا نتیجہ اچھا اور کس کا بُرا ہوگا صرف اس وحی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء پر نازل ہوئی ہے۔ جزئیات و تفصیلات سے قطع نظر، فیصلہ کُن بات جس پر آخرت کی فلاح یا خسران کا مدار ہے یہ ہے کہ اولاً انسان اپنی قوتِ نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکمِ حقیقی ہونے اور اس کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے منجانب اللہ ہونے کو پہچانتا ہے یا نہیں، ثانیاً اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد اور آزادیٔ انتخاب رکھنے کے باوجود اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی حاکمیت اور اس کے امرِ شرعی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہے یا نہیں۔

یہ وہ نظریہ ہے جسے ابتدا سے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے آئے ہیں۔ . . . کسی مشاہدہ یا کسی تجربہ سے یہ نظریہ ٹوٹتا نہیں۔ یہ ایک مستقل نظامِ فلسفہ پیدا کرتا ہے۔ اِس فلسفہ کی بنیاد پر جس تہذیب کی عمارت اُٹھتی ہے اُس تہذیب کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں جو روح کام کرتی ہے وہ اللہ واحد و قہار کی حاکمیت، آخرت کے اعتقاد اور انسان کے محکوم و ذمہ دار ہونے کی روح ہے بخلاف اس کے دیگر تہذیبوں کے پورے نظام میں انسان کی خود مختاری، بے قیدی و بے مہاری اور غیر ذمہ داری کی روح سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے۔ اسلئے انسانیت کا جو نمونہ انبیاء علیہم السلام کی قائم کی ہوئی تہذیب سے تیار ہوتا ہے اس کے خط و خال اور رنگ و روغن دوسری تہذیبوں کے بنائے ہوئے نمونہ سے ہر جز اور ہر پہلو میں جدا ہوتے ہیں اس کے بعد تمدن کی تفصیلی صورت جو اس بنیاد پر مبنی ہے اس کا سارا نقشہ دنیا کے دوسرے نقشوں سے بدلا ہوا ہوتا ہے۔ طہارت، خوراک، لباس، طرزِ زندگی، آداب و اطوار، شخصی کردار، کسبِ معاش، صرفِ دولت، ازدواجی زندگی، خاندانی زندگی، معاشرتی رسوم، سماجی تعلقات۔

انسان اور انسان کے تعلق کی مختلف شکلیں لین دین کے معاملات۔ دولت کی تقسیم۔ مملکت کا انتظام۔ حکومت کی تشکیل۔ امیر کی حیثیت۔ شوریٰ کا طریقہ۔ سول سروس کی تنظیم قانون کے اصول تفصیلی ضوابط کا اصول سے استنباط۔ عدالت۔ پولیس۔ احتساب۔ مالگذاری۔ امورِ نافعہ Public Works صنعت و تجارت۔ خبر رسانی تعلیمات اور دوسرے محکموں کی پالیسی۔ فوج کی ترتیب و تنظیم۔ جنگ و صلح کے معاملات بین الاقوامی تعلقات، اور خارجی سیاست۔ غرض انسانی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لیکر بڑے سے بڑے معاملات تک اس تمدن کا طور و طریق اپنی ایک مستقل شان رکھتا ہے اور ہر ہر چیز میں ایک واضح خطِ امتیاز اس کو دوسرے تمدنوں سے الگ کرتا ہے۔" اس کی ہر چیز میں اوّل سے آخر تک ایک خاص نقطۂ نظر۔ ایک خاص مقصد۔ ایک خاص اخلاقی رویّہ کار فرما ہوتا ہے۔ جس کا براہ راست تعلق خدائے واحد کی حاکمیت مطلقہ۔ اور انسان کی محکومیت و مسئولیت اور دنیا کے بجائے آخرت کی مقصودیت سے جڑا ہوا ہے۔"[ملہ]

ملہ۔ ماخوذ از رسالہ الفرقان بریلی۔ شاہ ولی اللہ نمبر ۱۹۴۱ء

ضمیمہ ۲

اِباحتی یا وام مارگی یا واماچاری

اِباحت کے لغوی معنی ہیں "جائز رکھنا، مباح ہونا" اِباحتی جو جائز رکھے، مباح جانے۔

اِس جماعت میں وہ تمام لوگ شامل کئے جاسکتے ہیں (خواہ وہ نام نہاد ہندو ہوں یا مسلمان) جو مخرب اخلاق ممنوعہ چیزوں کو جائز سمجھیں اور جن کے نزدیک حلال وحرام میں کوئی امتیاز نہ ہو۔ کوئی مہذب حکومت ایسے افراد یا جماعتوں کو جوا، شراب، زنا وغیرہ افعال شنیعہ وقبیحہ کو جائز سمجھیں پھلنے پھولنے کی اجازت نہیں دے سکتی کیونکہ اِس سے سوسائٹی کا اخلاق گرجائے گا اور رفتہ رفتہ وہ جسمانی، دماغی اور روحانی صلاحیتوں کو کھو بیٹھے گی جن کے بغیر اس کا وجود عالم انسانیت کی فلاح وبہبود کے لئے بیکار محض ہے۔

ایران کے اندر نوشیروان عادل کے عہد حکومت میں "مزدکی جماعت" کا پتہ چلتا ہے جس نے حلال وحرام کی تمیز اٹھا کر فسق وفجور کی آبیاری کا سامان بہم پہونچایا تھا۔ اسی طرح ہندوستان کے اندر اسلامی عہد حکومت میں بعض جماعتیں ایسی موجود تھیں جو مزدکیوں کے مماثل تھیں انھیں میں شاکت مت اور وام مارگیوں کی جماعت بھی ہے۔

وام مارگیوں کا اٹھان کیسے ہوا اِس کا تذکرہ سوامی دیانندجی سرسوتی نے ستیارتھ پرکاش کے باب یازدہم میں بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ برہمنوں نے ویدوں کی تعلیمات کو عوام الناس سے چھپایا اور تعلیم وتعلم کے خود واحد اجارہ دار بن بیٹھے لیکن رفتہ رفتہ اس کی تعلیم سے خود بھی دور ہوتے چلے گئے اس لئے سوسائٹی پر جہالت کی تاریک گھٹائیں چھاگئیں جس کی وجہ سے لوگوں کے اندر وہ تمام برائیاں پیدا ہوگئیں جو جہالت کا خاصّہ ہیں۔

زمانۂ وسطیٰ میں سوسائٹی کو خراب کرنے والے عناصر

اس طرح سوامی دیانندجی کے نزدیک سوسائٹی کو خراب کرنے والی سب سے پہلے برہمنوں میں کی ایک وہ خودغرض جماعت ہے جس نے یورپ کے پادریوں کی طرح جنت کو اپنے لئے مخصوص کررکھا تھا[1] اور جن کے بغیر یوم پیدائش ہی لیکر مرنے کے بعد تک کوئی رسم ادا نہیں کی جاسکتی تھی۔ انھوں نے اپنی بزرگی وبرتری قائم رکھنے کے لئے عوام کو جاہل رکھنے کی کوشش اور اپنی عظمت کا نقش بٹھانے کے لئے غلط سلط روایات پرمبنی کتابیں تصنیف کیں اور پھر ہر روایت کا راوی ویدک عہد کے کسی دیوی یا دیوتا کو قرار دیکر ان (کتب) کو مستند بنانے کی کامیاب کوشش کی۔ چونکہ وہ قانون کی زد سے باہر سمجھے جاتے تھے اسلئے ان کو ہر جائز وناجائز کام روا تھا۔ آخرکار برہمن سوسائٹی کے اندر دیوتاؤں کے قائم مقام سمجھے جانے لگے ادھر عوام الناس علم سے کورے رہجانے کی وجہ سے بھیڑوں کا ایک گلہ (ریوڑ) ہوکر رہ گئے کہ انھیں جس نے جدھر کو چاہا ہانک دیا۔ اِس جہالت سے غلط فائدہ اُٹھایا گیا۔

مہاتما بودھ اور مہابیر سوامی نے عوام کے جاہل طبقے کو برہمن پنڈوں کی خودساختہ جاہلانہ رسموں کے چکر سے نکال کر صحیح راستہ پر ڈالنے کی انتھک کوششیں کیں۔ انھیں قدیم آریوں کی مساوات کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور مذہبی معتقدات کو (سنسکرت[2] کے بجائے) انھیں کی زبان میں سمجھا کر نروان کی طرف رہنمائی کی۔ ان دونوں بزرگوں کی تعلیمات کا ملک پر گہرا اثر پڑا اور برہمنی مت اگر مٹ نہ سکا تو ایک عرصہ کے لئے دب ضرور گیا۔

1۔ ستیارتھ پرکاش (انگلش ترجمہ) ص ۳۸۲ تا ص ۳۸۵

2۔ سنسکرت چونکہ عوام الناس کی زبان نہیں تھی اسلئے ویدک قوانین کو جاننا اور اُن کی تشریح برہمنوں سے مختص ہوکر رہ گئی۔

مذکورۂ بالا تینوں مذہبوں میں بہت دنوں تک کشمکش جاری رہی۔ بالآخر مہاراج شنکر آچاریہ[1] کی تعلیم نے برہمنی مت کو پھر ابھرنے کا موقع دیا لیکن ملک میں چونکہ بت پرستی[2] کا نہایت زور تھا اسلئے "شنکر اچاریہ جی کے پیرو بھی اس رَو میں بہہ گئے اور ان کو شیوجی کا اوتار مان کر پوجنے لگے[3]" اور آخر کار شیویوں میں ضم ہوکر رہ گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد وام مارگیوں اور شیویوں کی جماعتیں اعمال کے لحاظ سے

---

[1]:- مہاراج شنکر اچاریہ جنوبی دکن کے ایک معزز برہمنی خاندان کے چشم وچراغ تھے اس وقت وہاں جینیوں کا غلبہ تھا اور عرب مسلمانوں کی بسلسلۂ تجارت سواحلی علاقوں میں آمد و رفت جاری تھی۔ گمان غالب ہے کہ جینیوں اور مسلمانوں میں مذہبی مسائل پر گفتگو رہتی ہوگی۔ جینیوں کی بت پرستی کے جواب میں مسلمانوں کے پاس ذات باری تعالیٰ کی وحدانیت کا ایک موثر حربہ تھا۔ ممکن ہے کہ شنکر اچاریہ جی نے ویدانتی تعلیم میں مسلمانوں کے دلائل سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھایا ہو جس کو ہم تاریخی شواہد کی کمی کی بنا پر یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے۔ بہرحال شنکر اچاریہ جی نے ویدانتی تعلیم کی تلقین کے لئے ملک میں تبلیغی دورے شروع کئے اور اجین کے راجہ سُدھنوا اور دوسرے راجاؤں کی مدد سے جنھوں نے جینی عقائد سے توبہ کرکے اس نئے برہمنی مت کو قبول کرلیا تھا جینیوں کو عاجز کردیا کہتے ہیں کہ "دس سال تک مہاراج شنکر اچاریہ نے تبلیغی دورے کرکے جینیوں شیویوں اور وام مارگیوں کے خلاف وعظ کہے۔ آجکل جو ٹوٹے پھوٹے بت دکھائی دیتے ہیں وہ اسی زمانہ کے ہیں اور جو سالم بت جابجا زمین سے برآمد ہوتے ہیں یہ وہ بت ہیں جن کو جینیوں نے اس خوف سے زمین میں دبا دیا تھا کہ کہیں ان کو بھی نہ توڑ ڈالا جائے" (ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش مترجمہ صفحہ ۴۹۴) معلوم ایسا ہوتا ہے شنکر اچاریہ جی کی کوششوں کے باوجود ملک سے بت پرستی دور نہ ہوسکی اور اس کا زور بدستور قائم رہا۔

[2]:- ہندوستان میں بت پرستی کی بنیاد ڈالنے والے سوامی دیانند سرسوتی کے نزدیک جینی ہیں۔ (ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش مترجمہ صفحہ ۴۹۷) (باقی مضمون بر صفحہ ۴۴۳)

[illegible]

کے سراسر منافی ہے[۱]"۔ وشنویوں نے بھی جینیوں کی طرح مورتیاں بنانا شروع کردیں تاکہ عوام الناس کا جاہل طبقہ جینیوں کی طرف مائل ہونے سے رُک جائے اور اُن کے مندروں میں نہ جائے تاکہ ویشنو پنڈتوں کی روزی میں خلل نہ پڑنے پائے۔ انھوں نے اپنی مورتیوں کو جینیوں کے بخلاف زیادہ بہتر خوبصورت اور دلکش بنایا اور یہی نہیں بلکہ دیوتا جی کے ساتھ ساتھ دیوی جی کی بھی مورتی نصب کی وہ اس کو کچھ اس طرح بناؤ سنگار کرکے رکھتے تھے کہ دیکھنے والوں کے نفسانی جذبات میں ہیجان پیدا ہو[۲]۔

بت پرستی اور بت سازی کے یہ مقابلے روز بروز بڑھتے ہی گئے یہاں تک کہ بتوں کے حصول کے لئے آپس میں باقاعدہ لڑائیاں ہونے لگیں چنانچہ کالنجر کے راجہ یشوورمن (۹۳۰ء تا ۹۵۰ء) نے جب کھجوراہو کا مشہور مندر تعمیر کرایا تو اس میں جو مورتی لاکر رکھی گئی وہ وشنو دیوتا کی تھی اور جس کو قنوج کے راجہ دیوپال سے بزور شمشیر حاصل کیا گیا تھا[۳]۔ اسی طرح لکشمن نامی ایک کلچوری راجہ نے اُڑیسہ پر حملہ کرکے سومناتھ میں نصب کرنے کے لئے ایک بت لڑ بھڑ کر حاصل کیا تھا[۴]۔

بتوں سے روزی کمانے کے پنڈتوں نے عجیب عجیب طریقے ایجاد کئے مثلاً یہ کہ کسی پتھر کے بت کو پہلے سے بنوا کر کسی پہاڑ کے غار میں جنگل میں یا کہیں اور پوشیدہ جگہ میں چھپا دیتے اور پھر اپنے معتقدوں میں یہ مشہور کرتے کہ ہم نے رات کو مہادیو جی یا پاربتی جی یا کسی اور دیوتا کو خواب میں دیکھا ہے اور انھوں نے ہمیں اپنا پتہ بتایا ہے کہ ہم فلاں جگہ موجود ہیں۔ چنانچہ ان کے معتقدین جن کے پاس عقل سے زیادہ روپیہ ہوتا تھا پنڈت کی معیت میں اس جگہ سے جہاں کہ وہ بت پہلے سے رکھا ہوا ہوتا تھا جاکر لے آتے تھے اور اس کے لئے

---

[۱] :۔ ستیارتھ پرکاش انگریزی ترجمہ ص۴۲۳

[۲] و [۳] :۔ کریسنٹ اِن انڈیا از شرما ص۱۰ و دہلی سلطنت از سید معین الحق ص۲

[۴] :۔ دہلی سلطنت از سید معین الحق ص۲۱

ایک مندر بنواکر اس میں اُسے نصب کر دیتے تھے اور یہ پنڈت جی اس کے مہنت بن بیٹھتے تھے[۱]"

ان تمام فرقوں نے اپنے اپنے دیوتاؤں کی تعریف اور دوسروں کی تحقیر کے لئے کتابیں تصنیف کیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہ سب جہالت کے کرشمے تھے جس کا ایک نمونہ سطور ذیل میں ملے گا۔

چیلہ بنانے کا طریقہ

وام مارگی کسی کو اپنا چیلہ بناتے وقت کچھ منتروں کے پڑھنے کی تلقین کرتے تھے منتروں کو یاد کراتے وقت چیلہ کی امیری وغریبی کو ملحوظ رکھا جاتا تھا چیلہ اگر غریب ہوتا تھا تو صرف "دم دُرگائے نمہ[۲]" "بھم بھیروائے نمہ[۳]" "ایں، ہریم، کلیم، چامنڈائے وِچے" وغیرہ منتروں کی تلقین کی جاتی تھی۔ بنگال میں صرف ایک لفظ کی تلقین کرتے تھے جو "ہریم"، "شہریم"، "کلیم" وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ اگر چیلا مالدار ہوتا تھا تو اس کو سب منتروں کے پڑھنے کی اجازت تھی۔

منتروں کا استعمال

عورتوں کے اغوا کرنے، زوجین کے درمیان نفرت پیدا کرنے یا مطلوب کو اپنانے کے لئے منتر پڑھے جاتے تھے بعض اوقات کالی دیوی کو بھینٹ دینے کے لئے کسی آدمی کی قربانی کی جاتی تھی اس موقع پر بھی منتر پڑھے جاتے تھے اس قربانی کا گوشت بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ دشمنوں کو مغلوب کرنے کے لئے جو منتر پڑھے جاتے تھے وہ کچھ اس قسم کے تھے۔

"مارے ۲، آچاٹے ۲، وِدوشے ۲، چھید ۲، بھید ۲، وشی کر ۲، کھادے ۲، کھینچئے ۲، ترو ٹیے ۲، واشئے ۲، ہم شترون وشی کر ۲، ہم پھٹ سواہا[۴]"

۱: ستیارتھ پرکاش انگریزی ترجمہ صفحہ ۴۲۴ ۔ ۲: اس منتر کے معنی ہیں "ہم درگا (دیوی) کو نمسکار کرتے ہیں"
۳: اس منتر کے معنی ہیں "ہم بھیرو (مہادیو یا شیو) کو نمسکار کرتے ہیں" ۔ ۴: دو کا ہندسہ اسلئے بنا دیا گیا ہے کہ ہر حرف کو دو مرتبہ پڑھا جائے مثلاً "مارے مارے" وغیرہ (باقی مضمون صفحہ ۴۴۶ پر)

اعمال وعقائد | وام مارگیوں کا عقیدہ تھا کہ م سے شروع ہونے والی پانچ اشیاء یعنی شراب، گوشت، مچھلی، روٹی اور زنا کا کثرت استعمال نجات کا سبب ہیں۔ یہ بھی خیال تھا کہ جو شراب کا ضرورت سے زیادہ استعمال کرتا ہے یعنی پیتا ہے اور خوب پیتا ہے یہاں تک کہ پیتے پیتے زمین پر مدہوش ہو کر گر پڑتا ہے پھر اٹھتا ہے اور پھر پیتا ہے اس طریق عمل سے وہ بار بار جنم لینے کے چکر سے نجات پا جاتا ہے[۲]۔

یہ یقین رکھتے ہوئے کہ تمام آدمی انسان کے روپ میں شیوجی کا اوتار ہیں اور عورتیں پاربتی کا اس لئے اُن کے نزدیک اس میں کوئی ہرج نہیں کہ آپس میں (خواہ وہ کسی وزن یا قبیلہ کے ہوں) زنا کا ارتکاب کریں[۳]۔ اس لئے کو انھوں نے اتنا بڑھایا کہ "حائضہ کے ساتھ عمل زوجیت کرنا پشکر کے پوتر (پاک) تالاب میں نہانے کے برابر قرار دیا۔ نیچ ذات کی عورت سے ملوث ہونا بنارس کی یاترا کے برابر ٹھہرایا۔ چمارن کے ساتھ منہ کالا کرنے کو الہ آباد میں گنگا نہانے کے برابر جانا، دھوبن کے ساتھ ناجائز تعلقات کو متھرا کی یاترا کے برابر اور ایک طوائف کے ساتھ اخلاق و شرافت کا خون کرنے کو اجودھیا کی یاترا (زیارت) کے برابر سمجھا[۴]۔"

بقیہ فٹ نوٹ ۴۴۵ یہ مطلب ہے تو قتل کر، قتل کر (طالب مطلوب کے درمیان) نفرت پیدا کر، بدنام کر، بدنام کر، قطع کر قطع کر پھاڑ پھاڑ، مغلوب کر مغلوب کر، کھا کھا، نگل نگل، توڑ توڑ، فنا کر فنا کر، میرے دشمنوں کو مغلوب کر وغیرہ (کام رتن تنتر منتر)

[۱] بحوالہ ستیارتھ پرکاش ترجمہ ص ۱۹۵) = مد्ّयं मांसं च मीनं च मुद्रा मैथुनमेव च । एते पञ्च मकाराः स्युर्मोक्षदा हि युगे (کالی تنتر، ستیارتھ پرکاش ترجمہ ص ۳۸۵)

[۲] مہانروان تنتر بحوالہ ستیارتھ پرکاش ترجمہ ص ۳۸۶ — पीत्वा पीत्वा पुनः पीत्वा यावत्पतति भूतले । पुनरुत्थाय वै पीत्वा पुनर्जन्म न विद्यते ॥

[۳] " " " ص ۳۸۶ — अहं भैरवस्त्वं भैरवी ह्यावयोरस्तु सङ्गमः ॥

[۴] रजस्वला पुष्करं तीर्थं, चाण्डाली तु स्वयं काशी, चर्मकारी प्रयाग...

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وام مارگیوں کا ضمیر اُن کے بیہودہ افعال پر ملامت کرتا ہے۔ اسلئے وہ مَا (میم) سے شروع ہونے والی پانچوں اشیاء کو عمدہ الفاظ کا خوبصورت جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں چنانچہ شراب کا نام انھوں نے پاترا رکھا، گوشت کا صفائی اور مچھلی کا نام پھول رکھا وغیرہ وغیرہ[1]۔

اُن کا کہنا یہ ہے کہ سوشل اجتماع کے موقع پر سب لوگ خواہ وہ برہمن ہوں یا نیچ ذات کے اچھوت سب کے سب دُوج (اعلیٰ ذات) ہوجاتے ہیں لیکن تقریب ختم ہونے کے بعد سب اپنی اپنی سابقہ حیثیتوں پر واپس ہوجاتے ہیں یعنی برہمن برہمن ہوجاتا ہے اور اچھوت اچھوت بن جاتا ہے۔ ایک خاص تقریب میں جس میں سب وام مارگی اکٹھا ہوتے ہیں ایک نشان مثلث یا مربع یا دائرہ کی شکل کا زمین یا تختہ پر بناکر اس پر شراب سے بھرا ہوا گھڑا رکھتے ہیں اور اس کی پوجا کرتے وقت یہ منتر پڑھتے ہیں "اے شراب تو برہما کے عتاب یا بددعا سے بَری ہے یعنی تجھ پر عتاب نہیں ہے[2]" اس کے بعد ایک پیالہ میں شراب بھرتے ہیں اور ایک رکابی میں گوشت اور مٹھائیاں رکھتے ہیں۔ ان کا مہنت اس پیالہ کی شراب کو یہ کہکر کہ میں بھیروں یعنی شیو ہوں پی لیتا ہے پھر اسی پیالہ سے یکے بعد دیگرے سب حاضرین شراب بھر بھر کر پیتے ہیں اور ایک عورت کو مادرزاد ننگا کرکے اور اس کے ہاتھ میں تلوار دیکر دیوی (درگا) کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اس کی پوجا کرتے ہیں ۔ اسی طرح عورتیں ایک مرد کو مادرزاد ننگا کرکے اور اس کے ہاتھ میں تلوار دیکر مہادیو کے نام سے اس کے لنگ کی پرستش کرتی ہیں۔ (اس دوران میں

---

[1]: ستیارتھ پرکاش مترجمہ صفحہ ۳۸۶ ـــ [2]: ستیارتھ پرکاش مترجمہ صفحہ ۳۸۶

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۴۶)

स्याद्धलकी मधुरा मता अयोध्या पुल्कसी प्रोक्ता ॥ रुद्रयामल तन्त्र

غالباً) شراب کا دور جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اُن پر مدہوشی کا عالم طاری ہوجاتا ہے اور اسی عالم میں پھر جو ہونا ہوتا ہے وہ ہوتا ہے۔ اِس موقع پر ماں، بہن، بہو، بیٹی وغیرہ سب مباح ہیں[1]

اِس مجمع میں کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے اگر کسی کو قے ہوجائے تو ان میں کامل ترین انسان جس کو "اگھوری" کہتے ہیں اس کو بطیب خاطر کھالیتا ہے۔ کامل انسان ہونے کا معیار بھی ملاحظہ ہو "جو شخص شراب خانہ میں بوتل پر بوتل خالی کرے اور رات طوائفوں کے یہاں بدعلنی میں گذارے یا اسی طرح کے اور بُرے کام بلا شرم و لحاظ کرے وہ انسان وام مارگیوں کے نزدیک پورے عالم کا شہنشاہ ہے[2]" ان کے نزدیک عرفان حاصل کرنے کی دس منزلیں ہیں ان میں سے ایک کا نام "ماتنگی" ہے یہ وہ منزل ہے جس میں انسان ماں کو بھی اپنے لئے حلال سمجھتا ہے۔ نعوذ باللہ من شرورھم

وام مارگیوں میں کئی فرقے ہیں۔ اگھوریوں کے نزدیک مردہ لاش کا گوشت کھانا ایک امر مستحسن ہے جبکہ ان کے اجاری اور بجاری طبقے بول و براز کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اعمال کے لحاظ سے ان میں دو جماعتیں ہیں ایک کو "چولی مارگی" کہتے ہیں اور دوسری کا نام "بیجا" یا "بیج مارگی" ہے۔ چولی مارگی اُس خاص تقریب کے موقع پر جس کا ذکر کیا جاچکا ہے تمام عورتوں کی چولیاں اُتروا کر ایک برتن میں خلط ملط کردیتے ہیں

1:- ستیارتھ پرکاش انگریزی ترجمہ صفحہ ۳۸۷

2:- " " " " صفحہ ۳۸۸، گیان سنکلنی تنتر اشلوک ۴۳-

हालां पिबति दीक्षितस्य मन्दिरे सुप्तो निशायां गणिका गृहेषु ।
विराजते कौलवचक्रवर्ती ॥

पाशबद्धो भवेज्जीवः पाशमुक्तः सदा शिवः ॥

پھر مدہوشی کے عالم میں جس کی چولی جس کے ہاتھ میں آجائے وہ عورت اس کے لئے مباح ہوجاتی ہے۔ بیج مارگی گروہ اُس خاص تقریب کے موقع پر جبکہ حرارت عزیزی کا اخراج کا وقت ہوتا ہے اپنی حرارت عزیزی کو پانی میں گرادیتے ہیں اور اس کو حل کرکے پی جاتے ہیں اُن کے خیال میں یہ طریقہ نجات کا واحد ذریعہ ہے[1]۔

وام مارگیوں کی سرکوبی

اس قسم کے بیہودہ افراد یا جماعتوں کی گندگی سے سوسائٹی کو محفوظ رکھنے کے لئے سلاطین دہلی نے بہت کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کی ہونگی اور ظاہر ہے کہ محکمۂ احتساب کی بازپرس اور کڑی نگرانی نے اِس جماعت کے بڑھنے اور سرسبز ہونے کی قوت کو ختم کردیا ہوگا۔ ہندوستان کی سوسائٹی پر سلاطین ہند کا یہ وہ احسان ہے جس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

گمان غالب یہ ہے کہ مذکورۂ بالا طرز کے اباحتیوں کی ذہنی و عملی برائیوں اور گندگیوں کے دور کرنے میں قریب قریب ہر سلطان نے حصّہ لیا ہے کیونکہ محکمۂ احتساب بعض سلاطین کی بے عنوانیوں کے باوجود برابر قائم رہا[2]۔ اور اپنا کام کرتا رہا لیکن تاریخی شواہد کی رُو سے اولیت[3] کا شرف سلطان علاء الدین[4] خلجی کو حاصل ہے اور اس کے بعد سلطان فیروز[5] تغلق

---

[1] ۔ ستیارتھ پرکاش انگریزی ترجمہ ص۹۵-۹۶

[2] ۔ ملاحظہ ہو ایڈمنسٹریشن آف دہلی سلطنت از قریشی ص۱۴۹ تا ص۱۶۵

[3] ۔ اِس کے یہ معنی نہیں کہ اِس ضمن میں سلطان التتمش، ناصر الدین محمود اور بلبن جیسے نیک و دیانتدار سلاطین نے کچھ نہیں کیا۔ ان کی سیرتیں خود اس امر کی شاہد ہیں کہ انھوں نے سوسائٹی کے اخلاقی معیار کو بلند کرنے میں کتنا بڑا حصّہ لیا ہے۔

[4] ۔ فرشتہ ص۱۲۰

[5] ۔ سیرت فیروز شاہی ص۱۴۶، فتوحات فیروز شاہی انگریزی ترجمہ ص۱۸

کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ سوسائٹی کو ان وام مارگیوں کی بیہودگیوں اور لغویتوں سے
پاک وصاف کرے۔

اس سوال پر کہ جن اباحتیوں کا فیروز تغلق نے استیصال کیا آیا وہ وام مارگی تھے
یا اسمٰعیلیہ بڑا اختلاف ہے۔ مورخین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ وہ اسمٰعیلی تھے۔ وہ اپنے
خیال کی تائید میں کتاب الفصل فی الملل جلد چہارم ص ۱۸۵ مصری نسخہ مطبوعہ ۱۳۲۱ھ اور
فتوحات فیروز شاہی کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں۔ جہاں تک اسمٰعیلیوں کے خفیہ افعال
و کردار کا تعلق ہے بلاشبہ ان میں اور وام مارگیوں میں بہت کچھ مماثلت پائی جاتی ہے۔
لیکن ان کا دائرۂ عمل دہلی اور اس کے اطراف کے بجائے زیادہ تر بلوچستان، سندھ،
ملتان اور گجرات کے بعض اقطاع پر محدود تھا۔ افغانستان میں بھی ایک گروہ کا پتہ
چلتا ہے جو اپنے کو "چمکنی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں ان کو چراغ کُش بھی کہتے ہیں کیونکہ
ان کا پیر اس خاص تقریب میں چراغ گل کر دیتا تھا اس کے بعد وہ تمام لغویتیں ہوتی
تھیں جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

مورخین کی دوسری جماعت ان لوگوں کو وام مارگی سمجھتی ہے کیونکہ ان اباحتیوں
کے تمام رسم و رواج وام مارگیوں کی طرح تھے لیکن وام مارگیوں کی جو بعض خصوصیتیں
بیان کی گئی ہیں مثلاً بت پرستوں کی طرح زمین کو گوبر سے لیپنا، چاول اور پھول چڑھانا

۱- فٹ نوٹ خزائن الفتوح از پروفیسر محمد حبیب انگلش ترجمہ ص ۱۲ ۔ ۲- فتوحات فیروز شاہی
کے صرف ایک نسخہ میں اباحتیوں کو شیعہ لکھا ہو ورنہ یہ عبارت کسی اور نسخہ میں نہیں ملتی۔

۳- پریچنگ آف اسلام از ٹی ڈبلیو آرنلڈ مترجمہ محمد عنایت اللہ ص ۲۲۵ و ص ۲۹۰

(۴) The Races of Afghanistan by H. W. Bellew Calcutta 1880

۵- ایڈمنسٹریشن آف دہلی سلطنت از قریشی ص ۱۲۱-۱۲۹ باب ہشتم

۶- سیرت فیروز شاہی ص ۱۴۷

یہ باتیں اسمٰعیلیوں سے ممکن نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اسمٰعیلی تمام شعوبیتوں کے مرتکب ہوسکتے ہیں لیکن وہ بت پرست نہیں ہوسکتے۔ اسلئے فیروز شاہ نے جن اباحیتوں کا استیصال کیا وہ یقیناً وام مارگی ہی تھے۔ دہلی کے علاوہ اس نے جگناتھ[1] پوری میں بھی ان لوگوں کی خبر لی ہے لیکن سندھ وغیرہ میں جہاں قرامطہ اسمٰعیلیہ کا ایک عرصہ تک زور رہا اس قسم کی کوئی تاریخی مثال ہمارے سامنے نہیں کہ اس نے ان لوگوں کی مفروضہ بیہودگیوں کا سدباب کیا ہو۔

---

[1] سوامی دیانند سرسوتی نے جگناتھ پوری میں وام مارگیوں کا ہونا تسلیم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش باب یازدہم ص ۴۱۳

صحت نامہ

تاریخ ہندی قرونِ وسطیٰ جلد دوم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۹	سبھتیا	سبھیتا	۴۸	۶	غلطی	غلط
۳	۱۱	۴۸ء	۴۷ء	۵۷	۱۰	عقیل	تحصّل
۳	۱۴	سالوں	مسالوں	۵۸	۳	۵۹۵ء	۹۹۵ء
۱۰	۱۵	پیڑو	پیرو	〃	۶	عقیدالدولہ	عضدالدولہ
۱۱	۱۵	ٹھکر	ہٹ کر	۶۲	۱۱	فراری	فزاری
〃	۱۹	تہٹی	تلہٹی	۷۸	۲۰	مشہور ہے	مشہور رہے
〃	۲۰	لینڈاؤن	لینسڈاؤن	۸۱	۱۸	بخارا میں کثرت رائے سے	بخارا میں اُمراء کی کثرت رائے سے
۱۳	۷	دردودھک	وڑووڈھک	۸۷	۱۰	سوتاہے	سوناہے
۲۵	۱۴	ردکدینے	روک دینے	۸۹	۱۳	جب امیرلے	جبا امیرنے
۳۲	۱۲	الکبیر	الکبیر	〃	۱۹	سرے	پرسہارے
۳۹	۷	وینیز	نیز	۱۵۴	۵	تیسادہ حیرت	نیسادہ حیرت
۴۴	۶	اموئی	اموی	۱۶۵	۲۱	مجتمع کردیا	مجتمع کرایا
〃	۹	قسطاط	فسطاط	۱۶۶	۱	پرتھوی	پرتھوی راج
۴۵	۱۲	ہاس	میں	۲۰۲	۱۹	ضمیرہ	حمزہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۰۴	۸	گہرام	کہرام	۴۰۱	۱۲	علاء الدین نے	علاء الدین
۲۰۹	۴	خوارذمی	خوارزمی	۴۰۳	۱۸	اُسنے	اُسے
۲۱۶	۱۱	سید تعلی	سید تعلی لکھے	۴۰۷	۱۸	علی گڑھ میگزین	علیگڑھ ہسٹاریکل جرنل
۲۳۱	۶	خضر	خزر	۴۰۸	۱۳	ع۱	ع۴
۲۵۰	۴	سلطانہ	سلطانا للہ	//	۲۰	ع۲	ع۱
۲۵۲	۹	//	//	۴۱۳	۲۰	ع۲	ع۱
۲۵۵	۷	//	//	//	۲۱	ع۳	ع۲
۳۰۵	۱۹	فرخ لقا	فرخ لقا	۴۴۳	۱۳	ڈیمیٹریس	ڈیمیٹریس
۳۰۸	۹	ملک باریک	ملک باربک	//	۱۸	وغیرہ	وغیرہ کی
۳۳۳	۱	جھابن	جھاین	۴۴۵	۱۸	تنتروں	شنتروں
۳۳۵	۲۱	ع۳	ع۲	۴۴۶	۷	وزن	وُزن
۳۶۶	۱۲	سلطان	سلطان نے	//	۸	ع۲	ع۳
۳۷۱	۱۹	ہم	مہم	//	۱۲	ع۲	ع۴
۳۷۸	۱۰	مرحوم	متوفی	//	۱۵	ع۵	ع۱
۳۹۶	۲۲	چقتل	جقتل	//	۱۸	ع۱	ع۲
۳۹۷	۱۴	قریۃ	قریہ	۴۴۹	۲	موقعے	موقع پر
۳۹۹	۵	بیوقوف	بیوقوفت				

the Quraishis and the Ansaries—are still about a third of the total city population.

Why the surviving Hindu governing classes, both within the Empire and outside it, did not change their outlook in spite of their bitter lessons it is hard to explain. Great Hindu thinkers arose in the middle ages insisting like Alberuni on all that was good in ancient Hinduism. But we hear of no reforming Raja. Things changed after the advent of Akbar the Great. But during the Sultanate period every independent Rai felt it is his duty to tread, regardless of experience, in the tragic footsteps of Dahir, Prithvi Raj and Jaichand At the political level no reformation of Hinduism seemed possible And throughout the middle ages Hindu government implied that subjection of the working classes which to the author of the Code of Manu was the first principle of the Aryan social order.

If we remember that the governing classes of the Empire of Delhi lived on the surplus value of the labour of the workers and peasants, and that governments, which exploit the city workers, can at the same time be only established with their support, **Shri Bashir Uddin Pandit's careful narration of the events of the middle ages will be found highly instructive It is based on a careful study of the great classics of medieval India to which ample references have been made in the course of the work.**

It is to be earnestly hoped that Shri Bashir Uddin Pandit will complete both in Urdu and Hindi the work he has so well begun.

MOHAMMAD HABIB.

Dated 21st July, 1949.

the quality of manufactured goods, artists and artisans of all types flocked to the great cities; and they were welcomed and encouraged. Workers could now flock to the cities without restriction and show what they were worth. The weaver, the greatest of all producers after the peasant, had been kept very low under the old regime, he now attained to a position of honour among the working classes. The safety of the roads led to brisk business on the part of the merchants and the state was not slow to realise that transport creates value. The governing class of the Delhi Sultanate changed repeatedly, but every class that came to power stuck to the principle of free contract and mobile labour.

Islam. as a religion did not make much progress in the land. Apart from East Bengal, Sind and West Panjab, it made scant progress in the country side. Though a Muslim governing class was in the country for five centuries Muslims are now only about 14% in the Indian Union Their proportion in the rural areas of the Union as a whole would hardly be 3% This shows that there was either no Muslim missionary effort in the country side or else that it found no response owing to the resistance of the present groups. Among the working classes of North Indian cities, on the other hand, Islam made a fairly rapid progress. A careful examination of all available evidence shows that a substantial proportion of the working class had adopted the new path by the time of Alauddin Khilji. Judging from the size of the Suroeding, Id mosques, of the towns, the strength of the imperial armies, the constant revolts in which the working class took part and the decisive, though transient influence it exercised in times of crises, the Muslim working class could hardly have been less than half the total population of the cities of Northern India. During the British period the proportion has changed, but Muslim workers of purely Indian blood,—

than slave labour. And the class that makes a tran ition from one form of exploitation to the other well roll in enormous profits The governing classes of the Delhi Sultanate certainly did so.

I do not suggest that the Ghorian invaders brought about the great revolution consciously. They had not, frankly, the brains to plan anything so great and merely enforced the system with which they were acquainted. But the Medina of the Prophet was an egalitarian working-class republic. Tribal pretences apart, it knew nothing of kings or aristocracies or caste or status. As Islam spread into foreign lands, the regime of free contract was automatically enlarged. But one Arab statesman at least knew what he was doing. In his instructions to Mohammad bin Qasim the great Hajjah repeatedly gives orders that three classes—peasants, artisans and traders be offered unconditional protection and promise of assistance. They are the classes that create surplus value, and the greater the contractual freedom allowed to them, the greater would be the profit of the governing class that controlled the state. And after this had been done and the former government of Sind was in the process of dissolution, Mohammad bin Qasim was ordered to win over the Brahmans by granting them their old hereditary posts along with 3% of the state revenues for the maintenance of their temples. Well organised exploitation always proceeds through a series of intermediaries, drawn from the exploited group.

Viewed in the context of world-history—and this is the only perspective in which it can be properly viewed—the Ghorian Turks succeeded because in the place of caste economy and the caste-ideology they substituted a regime of free and mobile labour. The working classes of the Indian cities could not have freed themselves by their own efforts ; the Turks did it for them and reaped the reward. There was an immediate improvement in

It should not be understood to mean that the exploitation of the workers and the peasants' disappeared Nothing of the sort. The middle ages were full of labour troubles Unemployment was often acute The low-wages which our bourgeois historians approve and the low-prices of manufactured goods which they welcome must have been a veritable curse to the working classes The Kotwal was ordered to keep an eye on labour discontent. The state was often driven to find work for the unemployed and undertook to put up useless public structures, like the Alai Minar and the arches of the Qutb Mosque, which it had no intention of completing It is a sad comment upon the labour conditions of the day that any number of people on immediate payment of wages could be found to risk their necks in the most hazardous and hopeless of political enterprises The peasantry was often in a sulky mood. It sometimes revolted because it was oppressed ; at other times, finding the imperial administration weak, it extinguished it for a time. An organised and effective labour protest was unfortunately, not under the conditions of the time possible Among the Hindu and Muslim mystics of the middle ages there was a definite dream of a classless society, But outside the doors of Khanqah and the mat it had to remain a dream.

Though all societies hitherto have been based on exploitation, this exploitation may be on different levels and with different result. The old exploitation was on the caste-level—the same level as the helotage of classical Greece and the slavery of Egypt and Crete. The new exploitation was based on free wages and mobile labour, which are the basis of the medieval shariat. "The well-pleased labourer does more work" says a well known Persian (verse). Or to put it in Marxian terminology, when the processes of production have reached a certain stage, free wage labour produces greater surplus value

survival of the restrictions on the working classes which the Code of Manu prescribes and which Alberuni found in full operation.

The Turkish conquest has often been represented as a foreign conquest Thus it, no doubt, was. For about a century the slave officers of Shahabuddin and their descendents held an exclusive sway over the land and the Rais, Ranas and Rawats were either liquidated or took a position subordinate to the Khans and Maliks of the Empire But the change was none-the less a revolt of the Indian city worker against their former governing class, the power of which was completely eliminated from all cities of northern India. Only a few Rais were left in charge of their second-rate towns.

For side by side with the Turkish ruler came the Qazi and his Shariat. The Shariat of the Mussalmans had no public law; it knows of nothing of political rights and is only concerned with private or personal rights. It left the religious law and social customs of non-Muslims untouched. There are a few provisions of the Shariat e g. that the evidence of one Muslim is equal to that of two non-Muslims which have always troubled the conscience of the Musalmans and the self-respect of the non-Muslims But such discriminatory laws are hardly a dozen in number. All the other provisions of the shariat, called muamilat, which deal with the relations of man and man—the law of crimes, contracts of service, sales and so forth—are based on the doctrine of absolute legal equality. **There can be no question of status in the shariat of the Mussalmans; it is the very reverse of caste ideology.** Ordeal as a means of deciding civil suits and proving the innocence or guilt of the accused was swept aside and replaced by rules of evidence. In the punishment of crimes as well as in all civil suits no difference was tolerated on the ground of caste or status. The caste-system remained but only as a private affair of the Hindu community.

doctrine of **chut.** The Turks would never have succeeded had they not found an oppressed class of peasants and city workers, not only indiferent to their rulers but inclined to welcome the change

The same causes which led to the rapidity of the Turkish conquest also conduced to its permanence Shri Bashiruddin Pandit refers to the fact that during the five or six centuries that Muslim kings ruled the land there wes no national revolt though the movements for Hindu religious revival were continuous. The city workers on the whole, preferred a Muslim ruler for his position guaranteed them against Caste-oppressor. Of the at tempts of the Hindu religious leaders to reform the evils of the caste-system it is unnecessary to speak in detail. But one of these revivalist movements had a country-wide success. Organised Hinduism struck to the caste-system, and so long as it did so, there was really no alternative to a Muslim, and, later on, to a Muslim cum Rajput governing class.

The Turkish rulers of the thirteenth century did not concern themselves with the religion and the social customs of the people. In their Turkish hamelands the Mongols ruled supreme and city after city of Central Asia, Persia and Iraq had been sacked and devastated. They could not afford to go home ; there was no home to which they could go. They had to live in the country under the conditions their social environment prescribed. Consequently they had to win over the city workers. Wherever the Ghorian rule was established, all caste-restrictions which had been enforced by the state automatically disappeared Residence in the city was now possible for all Caste-privileges with reference to public law were swept off as an immediate and inevitable result of the conquest. Detailed records of the conditions of the towns of northern India during the Sultanate period have survived. We find no reterence anywhere to any

in the battles that heralded the Turkish conquest, we find heroic feats of valour alternating with battles in which elephants, horsemen, footmen and campfollowers fled almost immediately after the fighting began. We hear of enormous armies, apparently swelled by riff raff and camp followers but they achieved nothing. Had the Indian peasantry made up its mind to support the governing class of India, the Turkish conquest would never have been attempted But at no stage do we find the peasantry loyal to the governors, though before the thirteenth century had drawn to its close, the Indian footman (**paik**) had become one of the great buttresses of the military ane administrative machine of the Empire of Delhi.

If afraid of an open battle, the Rai and his high caste followers withdrew into their fort, their doom was sealed, provided the besiegers were persistent enough. The fort as a means of defence was almost always futile. The working classes for caste reasons could not be taken inside the walled city or the fort. Had they any alternative but to obey the conqueror and support him. "You have taken refuge in a high fort", the citizens of Sivistan wrote to Bijhra, a cousin of Raja Dahir of Sind when they found themselves helplessly at the mercy of Mohammad bin Qasim, "and we are afraid that these people will come, and as they consider us to be your followers, they will destroy us and deprive us of our lives and properties". Many working class groups in the twelfth and the thirteenth century must have felt the same when they found that their ruler had left them outside the fort to be harrassed and plundered by the Turks. Never in the recorded history of mankind has a country so great and so prosperous been lost with such egregious folly.

Though there were other contributing causes, the rapidity of the Indian collapse was due to one fundamental fact—the caste system and its theological basis, the

stable-officer to the king's inspector "The king's hc are in the register, no doubt, but they are not in the stables".

The Ghorian conquest, occurring at such a time, should be interpreted not as Turkish achievement but as an Indian Collapse. The Indian working classes had been reduced to such a condition that they refused to fight for their rulers and in fact fought against them.

Mohammad bin Qasim had two distinct advantages over his enemies. He had a large stock of naphtha or Greek fire and he had brought manjaniqs with him to India for the first time. The Turks of the twelfth century had no such advantages The Indians had learnt the art of making manjaniqs, and we find them used extensively by both sides. Naphtha was not available to either party. In fighting capacity the two parties should have been at par. But the working classes, the legal and social position of which we have examined definitely, turned the scale.

The critical student of history will do well to get a correct image of the conditions of India at the time. All cities were fortified and, as a protection against malaria, most of them were on an elevation The members of the four castes lived within the cities, and at night the gates were locked. The workers—peasants, weavers, butchers, fuller, sweepers etc. on whom the city depended for the continuation of its daily life lived outside; they entered in the morning and were locked out at night. While doing their duties in the city - duties without which the citizens would be paralysed - the workers were treated as submen.

Now what would be the position of the Indian warriors in an open battle. If they died fighting, it would be all right. They shared the fate of heroes. But one fights in order to win and not in order to die. The art of war is not a method of suicide ; it is an effort for victory. But here the Indian warrior was at a loss. He could not afford to be captured. And so

adhered to and the laws effectively enforced. In the struggle of nations it is only these operative principles that count.

No student of history will give a high place to Shahabuddin and his officers for their military skill They were capable administrators and they had a bull dog tenacity of purpose. But no spark of military genius is visible in their plans They marched and fought like everybody else blindly following the traditional principles. Nevertheless very seldom has a country so large been conquered so quickly. In 1191 A D. Shahabuddin Ghori was defeated by Rai Pithaura at the battle of Tarain. In 1205 A. D Bakhtiyar Khilji was knocking at the frontiers of Tibet

The conquest was rapid; it was also permanent. Both phenomena need explanation.

All Muslim historians are agreed that the morale of Muslim Asian society was its worst during the Ghorian period. In 1205 Shahabuddin Ghori, the conqueror of northern India, was signally defeated by the Khwarazmians and the Kara-Khitais at Andkhud. The Ghorian Empire could never recover from the blow and Ghor along with other territories (now known as Afghanistan) became provinces of the Khwarazmian Empire. In 1218 A D. Chengiz began his remarkable invasion of Muslim Asia and no substantial resistance could be offered to the Mongols by any Muslim city province or kingdom during the next thirty years. It was only after Baghdad had been sacked and the princes of Russia had been reduced to subjection that the Mongol conquest came to a halt. Allauddin Ata Malik Jawaqni very rightly attributes the complete subjection of the Turks and the Persians to the decline of their morals, specially in the military and political sphere. If the Khwarazmian Emperor summoned a handred officers to the muster, only ten cared to appear. And he quotes as typical the explanation of a

addressed their prayers—*viz.* the idol—they will proceed to worship those whom they address, because they have not learned to know Him, whilst He, by admitting this kind of intermediation, carries their affairs to the desired end. But that which is obtained by desires and intermediation is not lasting, since it is only as much as is deserved for any particular merit. Only that is lasting which is obtained from God alone, when people are disgusted with old age, death, and birth (and desire to be delivered therefrom by Moksha).

"This is what Vasudeva says. When the ignorant crowd get a piece of good luck by accident or something at which they had aimed, and when with this some of the preconcerted tricks of the priests are brought into connection, the darkness in which they live increases vastly, not their intelligence. They will rush to those figures of idols, maltreating their own figures before them by shedding their own blood and mutilating their own bodies.

"Veda means knowledge of that which was before unknown. It is a religious system which, according to the Hindus, comes from God, and was promulgated by the mouth of Brahman. The Brahmans recite the Veda without understanding its meaning, and in the same way they learn it by heart, the one receiving it from the other. Only few of them learn its explanation, and still less is the number of those who master the contents of the Veda and their interpretation to such a degree as to be able to hold a theological disputation."

Such quotations could be multiplied both from Alberuni and the sacred texts. But what matter in a nation's existence are not the great tenets of the sacred texts piously ignored or explained away or the character, however noble of small and ineffective, magestic groups, but the operative principles of national life—the customs actually

these castes is capable of attaining to liberation; for, according to some, only the Brahmana and Kshatriya are capable of it, since the others cannot learn the Veda, whilst according to the Hindu philosophers, liberation is common to all castes and to the whole human race, if their intention of obtaining it is perfect. This view is based on the saying of Vyasa: "Learn to know the twenty-five things thoroughly. Then you may follow whatever religion you like; you will no doubt be liberated." This view is also based on the fact that Vasudeva was a descendant of a Sudra family, and also on the following saying of his, which he addressed to Arjuna, "God distributes recompense without injustice and without partiality. He reckons the good as bad if people in doing good forget Him ; He reckons the bad as good if people in doing bad remember Him and do not forget Him, whether those people be Vaisya or Sudra or women. How much more will this be the case when they are Brahmana or Kshatriya."

"We shall now mention their ludicrous views; but we declare at once that they are held only by the common uneducated people. For those who march on the path to liberation, or those who study philosophy and theology, and who desire abstract truth which they call *sara*, are entirely free from worshipping anything but God alone and would never dream of worshipping an image manufactured to re-present him."

In the same book Vasudeva speaks to Arjuna : "Do you not see that most of those who wish for something address themselves in offering and worshipping to the several classes of spiritual beings, and to the sun, moon, and celestial bodies? If now God does not disappoint their hopes, though he in no way stands in need of their worship, if he even gives them more than they asked for, and if he gives them their wishes in such a way as though they were receiving them from that to which they had

"53. A man who fulfils to religious duty, shall not seek intercourse with them; their transactions (shall be) among themselves and their marriages with their equals.

"54 Their food shall be given to them by others (than an Aryan giver) in a borken dish; at night they shall not walk about in villages and in towns.

"55. By day they may go about for the purpose of their work, distinguished by marks at the king's command, and they shall carry out the corpses (of persons) who have no relatives; that is a settled rule.

"62 Dying, without the expectation of a reward for the sake of Brahmans and of cows, or in the defence of women and children, secures beatitude to those excluded (from the Aryan community, vahya).

"64. If (a female of the caste), sprung from a Brahmana and a Sudra female, bear (children) to one of the highest caste, the inferior (tribe) attains the highest caste within the seventh gereration.

"65. (Thus) a Sudra attains the rank of a Brahmana, and (in a similar manner) a Brahmana sinks to the level of a Sudra; but know that it is the same with the offspring of a Kshatriya or of a Vaishya.

"66. If (a doubt) should arise, with whom the pre-eminence (is, whether) with him whom an Aryan by chance begot on a non-Aryan female, or (with the son) of a Brahmana woman by a non-Aryan

"67. The decision is as follows: "He who was begotten by an Aryan on a non-Aryan female, may become (like to) an Aryan by his virtues; he whom an Aryan (mother) bore to a non-Aryan father (is and remains) unlike to an Aryan.

"73. Having considered (the case of) a non-Aryan who acts like an Aryan, and (that) of an Aryan who acts like a non-Aryan, the creator declared, "Those two are neither equal nor unequal".

There was, of course, all the time a higher Hinduism which believed in the one and the unseen God, which condemned idolatory and considered all men equal. Most of Alberuni's work is devoted to the study of this Hinduism and some of his remarks are worth quoting —

"The Hindus differ among themselves as to which of

equal to himself) on a female of his own race, even so is the order in the case of the excluded (races, vahya).

"29. Those (six mentioned above) also beget, the one on the females of the other, a great many (kinds of) despicable (sons), even more sinful than their (fathers), and excluded (from the Aryan community, vahya).

"30. Just as a Sudra begets on a Brahman female a being excluded (from the Aryan community), even so (a person himself) excluded procreates with (females of) the four (sons) more (worthy of being) excluded (than he himself).

31. But men excluded (by the Aryans, vahya), who approach females of higher rank, beget races (varna) still more worthy to bo excluded, low men (Hina) still lower races, even fifteen (in number).

"40. These races, (which originate) in a confusion (of the castes and) have been described according to their fathers and mothers, may be known by their occupations, whether they conceal or openly show themselves.

"41. Six sons, begotten (by Aryans) on women of equal and the next lower castes (Anantara), have the duties of twice-born men; but all those born in consequence of a violation (of the law) are, as regards their duties, equal to Sudras.

'43. But in consequence of the omission of the sacred rites, and of their not consulting Brahmanas, the following tribes of Kshatriyas have gradually sunk in this world to the condition of Sudras:

"44 (Viz.) the Paundrakas, the Kodas, the Dravidas, the Kambogas, the Yavanas, the Sakas, the Peradas, the Pahlavas, the Kinas, the Kiratas, and the Daradas.

"45. All those tribes in this world, which are excluded from (the community of) those born from the mouth, the arms, the thighs, and the feet (of Brahman), are called Dasyus whether they speak the language of the Mekkhas (barbarians) or that of the Aryans.

"51. But the dwellings of Chandalas and Shawapachas shall be outside the village, they must be made Apapatras, and their wealth (shall be) dogs and donkeys.

"52 Their dress (shall be) the garments of the dead, (they shall eat) their food from broken dishes, black iron (shall be) their ornaments and they must always wander from place to place.

one which has become subject to heretics, nor in one swarming with men of the lowest castes.

79. Let him not stay together with outcasts, nor with Chanalas, nor with Pukkasas, nor with fools, nor with over bearing men, nor with low-caste men, nor with antyavasayins".

CHAPTER X.

1. Let the three twice-born castes (varna) discharging their (prescribed) duties study (the Veda), but among them the Brahmana (alone) shall teach it, not the other two; that is an established rule.

'3. On account of his pre-eminence, on account of the superiority of his origin, on account of his observance of (particular) restrictive rules, and on account of his particular sanctification, the Brahmana is the lord of (all castes (varna),

"4. The Brahmana, the Kshattriya, and the Vaishya castes (varna) are the twice-born ones, but the fourth, the Sudra, has one birth only; there is no fifth (caste).

"5. In all castes (varna) those (children) only which are begotten in the direct order on weded wives, equal in caste and married as) virgins, are tp be considered as belonging to the same caste (as their fathers).

"6. Sons, begotten by twice-born men on wives of the next lower castes they declare to be similar (to their fathers, but) blamed on account of the fault (inherent) in their mothers.

"7. Such is the eternal law concerning (children born of wives one degree lower (than their husbands); know (that) the following rule (is applicable) to those born of women two or three degrees lower.

"25. I will (now) fully enumerate those (sons) of mixed origin who are born of Anulomas and of Pratilomas. and (thus) are mutually connected.

"26. The Suta, the Vaidehaka, the Chandala, that lowest of mortals, the Magadha, he of the Kshattri caste (gati) and the Ayogava.

"27. These six (Pratilomas) beget similar races varna on women of their own (caste), they (also)] produce (the like) with females of their mothar's caste (gati), and with females (of) higher ones.

"28. As a (Brahmana) begets on (females of) two out of the three (twice-born castes a son similar to) himself (but inferior), on account of the lower degree (of the mother), and one

able achievements of civilisation in early Mesopotamia, Crete, Egypt and in the classical period of Grecian history. Without some form of ruthless involuntary servitude—the exploitation of man in the same way as animals· the foundations of early civilisation could not have been laid But in the thirteenth century, in view of the great advance in the methods of production, such a social order was not only unnecessary but ruinous

The Code of Manu, the composition of which I am inclined to attribute to the third century A.D. is not like Alberuni's India an objective description of social institutions. It is a book of law and possibly the writer postulates as law what was more the objective of his class rather than rules actually engorged. Still the statements of the Manu Code on the caste-system are significant The Brahman class claim supreme pre-eminence for itself and the ruthless subjection of the lower orders :—

CHAPTER I.

"93. As the Brahmana Sprang from (Brahman's) mouth, as he was the first born, and as he possesses the Veda, he is by right the lord of this whole creation.

"95. What created being can surpass him, through whose mouth the gods continually consume the sacrificial viands and the manes the offerings to the dead ?

"99. A Brahman, coming into existence, is born as the highest on earth, the lord of all created beings, for the protection of the treasury of the law.

"100. Whatever exists in the world is the property of the Brahman; on account of the excellence of his origin the Brahmana is, is, indeed, entitled to it all.

"101. The Brahmana eats but his own food, wears but his own apparel, bestows but his own in alms : other mortals subsist through the benevolence of the Brahmans.

"105. He sanctifies any company (which he may enter), seven ancestors and seven descendants, and he alone deserves (to possess) this whole earth.

CHAPTER III.

"61. Let him not dwell in a country where the rulers are Sudras, nor in one which is surrounded by unrighteous men, nor in

children would disown him ; his closest friends would acknowledge him no longer. The courage that inspired him to fight till surrounded and captured by the enemy would bring him no reward but civil death and the hostility of the society for which he had been prepared to sacrifice everything. He would be an outlaw or a Chandala.

In later days bathing in the Ganges and other sacrifices were deemed sufficient to remove this contamination. But in the period of the Turkish invasion no such theological remedy was possible. Those who had lost their caste could never be rehabilitated or restored.

Alberuni's remarks on the matter are significant. "Everything which falls into a state of impurity strives, and quite successfully, to regain its original condition, which was that of purity .. ....But the Hindus never desire that a thing that has been polluted should be purified and thus recovered.

"I had been told that when Hindu slaves *i.e* prisoners of war in Muslim countries, escape and return to their country and religion, the Hindus order that they should fast by way of expiation, then they bury them in the dung, stale and milk of cows for a certain number of days till they get into a state of fermentation. Then they drag them out of the dirt, give them similar dirt to eat, and more of the like. I have asked the Brahmans if this is true, but they deny it and maintain that there is no expiation possible for such an individual and that he is never allowed to return into those conditions of life in which he was before he was carried off as a prisoner. And how should that be possible ? If a Brahman eats in the house of a Sudra for sundry days, he is expelled from his caste and can never regain it."

Early civilisation, as has often been remarked, was built upon the basis of slave-labour or its equivalent. Slave labour or helotage alone made possible the remark-

or guild. They are occupied with dirty work, like the cleansing of villages and other services. They are considered one sole class, and distinguished only by their occupations. In fact they are considered like illegitimate children ; for according to general opinion they descend from a Sudra father and a Brahmani mother as the children of fornication, therefore they are degraded out-castes. Of the classes beneath the castes, the Hadi are the best spoken of, because they keep themselves free from everything unclean. Next follow the Doma, who play the lute and sing. The still lower classes practice as a trade killing and the inflicting of judicial punishments. The worst of all are the Badhatan, who not only devour the flesh of dead animals, but even of dogs and other beasts." (Vol. I, p. 101—102).

Elsewhere he states : "Every action which is considered to be the privilege of a Brahman, such as saying prayers, the recitation of the Vedas and offering sacrifices to the fire, is forbidden to him to such a degree that when, *e g.* a Sudra or a Vaishya is proved to have recited the Veda, he is accused by the Brahmans before the ruler, and the latter will order his tongue to be cut off".

The theological basis of the caste-system was the terrible doctrine of chut or theological contamination—the fear driven deep into the mind of the Indian governing classes that if they violated any of the caste-rules, in particular if they touched the fire or the water of the classes below them, they would be eternally damned. If a Mussalman was captured by the Hindus, his relatives could ransom him and he was restored to his family and property. But nothing, like this was possible for a Hindu captive in Muslim hands. If he returned to his homeland after a space of captivity which was hardly possible without his drinking their water or eating their food, he would find himself an utter out-caste. His property would have been inherited by his heirs. His wife and

Pending the discovery of proper material for these four centuries the only possible method for the genuine historian is to co relate as best as he can the social system postulated by Manusmrite and Yajnavalkya with the life and customs of India as described by Alberuni It will be seen that the India of Alberuni is a development of the India of the Smrites, though not at least in one respect on the lines a modern Indian patriot would desire In the India of the Manusmrite the caste system is very definitely postulated but it may be hoped that the actual working of the system was not so vicious as desired by this text-book of law. In Alberuni we find the system in all its wonderful hideosity.

'Among the Hindus," Alberuni says, "institutions of this kind (i.e. like the five castes of Persia) abound. We, Muslims, of course, stand entirely on the other side of the question, considering all men equal, except in piety, and this is the greatest obstacle which prevents any understanding between Hindus and Muslims.' Then after a brief reference to the four well known Hindu varnas, Alberuni proceeds :—

> "After the Sudra follow the people called Antaja who render various kinds of services, who are not reckoned amongst any caste, but only as members of certain craft or profession. There are eight classes of them, who freely intermarry with each other, except the fuller, shoe maker and weaver, for no others would consent to have anything to do with them These eight guilds are the fuller, shoe-maker, juggler, basket and shield maker, the sailor, the fishermen, the hunter of wild animals and birds, and the weaver. The four castes do not live with them in one and the same place. These guilds live near the villages and towns of the four castes, but outside them'.

"The people called Hadi, Doma (Damba), Chandala and Badhatan (Sic) are not reckoned among any caste

devoted to these topics, without a proper apprehension of which political history remains an unsolved riddle.

The first volume of Pandit Bashiruddin Sahib's work, which will be published next, covers the period from the Arab Conquest of Sind to the Ghaznavides The third volume brings the narrative to the death of Ibrahim Lodi It is the author's intention to add a fourth volume on topics, such as Medieval warfare, the position of working class during the middle ages and Muslim religious ideas etc, for which it has not been possible to find a place in the first three volumes

The style of the work is clear and simple. In consonance with the traditions of our great medieval historians, the author has avoided figures of speech and the literary tricks which were affected by the official historians of the past in order to convey their real meaning in an indirect manner. History, according to our best oriental traditions is a subject which the common man is entitled to know and it should be written in a manner intelligible to him.

Pandit Bashirddin Sahib is **the first writer on Indian History who has given a comprehensive account of Hindu ideas and institutions along with Islamic thought and culture based on a study of the Arabic, Persian, and Sanskrit originals Great credit is due to him for this pioneer work.** Unfortunately the Sanskrit authorities on the period are not so abundant as one would wish. A great darkness still covers the social and political institutions of India during the four centuries that lie between the death of Harshavardhana and the advent of Alberuni. Alberuni looking at the past achievements of Indian thought, and the meagre accomplishment of the ages immediately preceding him, declared that the Indians were unprogressive, and he longed for an Indian Socrates who would courageously and at the cost of his life, separate the true postulates of Hindu classical thought from "sciences that prey on the ignorance of the multitude".

Introduction

BY

Prof. MOHD. HABIB

B.A. (HON.) (OXON) BAR AT-LAW.

Head of the Deptt of Political Science, M. U., Aligarh.

AFTER many years of prolonged study and research Pandit Bashiruddin Sahib, M A. (Alig.) of Gandhi Faiz-i-Am College Shahjahanpur, has prepared a History of Medieval India that does real justice to the subject.

The author has unique qualifications for the task. He is equally at home in the Persian, Hindi and Sanskrit originals and is intimately acquainted with modern English literature on the subject He brings to his work a mind free from communal, social and class prepossessions and has adhered carefully to the universally accepted cannons of historical evidence And he is not afraid.

Owing to the importance of the period with which it deals Shahabuddin Ghori to the death of Qutubuddin Khilji —Pandit Bashiruddin Sahib has decided to publish Vol. II of his History before Vol I. But Vol. I and III are both ready in manuscript and it is hoped that the learned author will be able to publish them before long. He has also acceded to my request and is preparing a Hindi edition of the work in a language that is simple, lucid and intelligible to non-Pandits.

The history of the middle ages is mostly written as if there was nothing in it but royal dynasties and their wars. This is not a charge that can be brought against Pandit Bashiruddin Sahib's work In an historical treatises kings and their wars cannot be ignored, and Pandit Bashiruddin Sahib has carefully collected together all efacts that can be gathered from the Persian originals. But an equally great emphasis has been laid on social and cultural history and the development of ideas. About half of this volume is

of the book is the convincing, unprejudiced and di passionate presentation of facts. The conclusions arrive at by the writer are balanced and even where one ma differ from him there is no bitterness which a partisan c particularist's study generally engenders.

There is a cool reasonableness and potent sincerit about all that he says for he knows his subject and has th authority of the contemporary documents behind him.

"People all read history" says Trevelyan, "if it fasci nates them It is therefore our duty to make it a fascinating as possible, or at any rate not to conceal its fascination under the heap of learning which ought to underlie but not overwhelm written history". Mr Bashiruddin's book comes up to the standard. It is both instructive and interesting. It shows considerable pains-taking industry, great erudition and deep insight. At the same time the language is simple and presentation straight forward and effective.

The publication of this vork has come at a very opportune moment. For the last 200 years streams of falsehood have flown from the pens of European writers who perverted the narrative ofthe Muslim rule in India for political purposes. No misepresentation is harder to refute than a consecutive stor cunningly made up in statements for which there is no foundation or which represent a partial truth. The Muslim conquest of India was not an unmixed evil. The darker side of the life of kings and noblemen has been magnified while the activities of the Muslim saints, scholars, pots, craftsmen, who have enriched Indian culture, have bee lightly passed over in the past.

Mr Bashiruddin has tried to pesent the history of the period in proper perspective and his book is a calm, careful, intelligent and instrucve survey of Med. History.

There are a few minor misakes of facts such as mentioned in "Izafi Note" on Pae 428 and the usual misprints but the same will be crrected when second edition is published.

Dated 21st August, 1949. S. ABDUR RASHID.

FOREWORD

BY

Sh. ABDUR RASHID,

M A LL.B.,

Reader and Chairman, Department of History,

Muslim University, Aligarh.

A History of Muslim Rule in India has yet to be written. Mr Bashiruddin Pandit has attempted this task in a 3 volume History of the Delhi Sultanate in Urdu. The second volume of this series is being presented to the public Mr. Bashiruddin is eminently fitted for this difficult task by virtue of his academic qualifications and particularly by his knowledge of Persian, Arabic, Sanskrit and Hindi, the four main languages which contain the principal sources of information for this most vital period of medieval Indian History.

The book is a useful corrective to the existing books on the subject and a key to the understanding of the nature and significance to the Muslim invasions of India beginning with Mohammad Bin Qasim's conquest of the valley of Sindh and the establishment of Muslim Rule in Northern India 500 years after. The basic defect of all histories of India has been that we have not considered our country in parallels and in relation to world history and its laws Our reading of the history of our country has been isolationist, narrowly nationalist and criminally communalistic. Mr. Bashiruddin has tried to escape this tendency. He has presented a most lucid and entertaining picture of the social, political and cultural background of Medieval Musulmans and the Indian social milieu in which the work of conquest and consolidation was carried on by Muslim conquistadors.

The book is well documented and enriched by quotations ingenously collected from contemporary authorities. Whereas the predigested food of the ordinary text-books spoils the readers appetite for the healthier and richer nourishments of the historical classics this new history of Medieval India stimulates the desire to get acquainted with the original authorities. The great charm

(۶) قادری صاحب موصوف ایم۔اے اور ہندی و سنسکرت کے عالم ہیں۔ انھوں نے اپنے موضوع پر انگریزی، فارسی، اُردو، ہندی و سنسکرت کے متعلقہ مواد سے پورا فائدہ اُٹھایا ہے اور پراچین بھارت کے متعلق ایک عامی کی طرح نہیں بلکہ ماہرِ فن کی حیثیت سے بحث کی ہے۔ کتاب واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ منطقی نتائج کی مدلل بحث ہے۔ واقعات کے استقصار، اسباب و علل کی تحقیق اور نتائج کی ترتیب میں نہایت محنت، جانفشانی اور دیانت داری سے کام لیا ہے۔

(پروفیسر) ضیاء احمد بدایونی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ اگست ۱۹۶۱ء

(۷) صحیح اور غیر متعصبانہ معلومات فراہم کرنے کے لئے اِس تاریخ کی نہ صرف اُردو بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونا چاہئے۔

(پروفیسر) سید مقصود علی، صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات
گاندھی فیض عام کالج شاہجہانپور۔ مئی ۱۹۶۲ء

باہتمام سید اعجاز علی منیجر
مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ
۱۹۴۹ء

ملنے کا پتہ
(۱) مولوی عبدالہادی خاں تاجر کتب
بازار بہادر گنج۔ شہر شاہجہانپور
(۲) مولوی محمد [illegible]